ادب اور زندگی کی مثبت اور آفاقی قدروں کا ترجمان

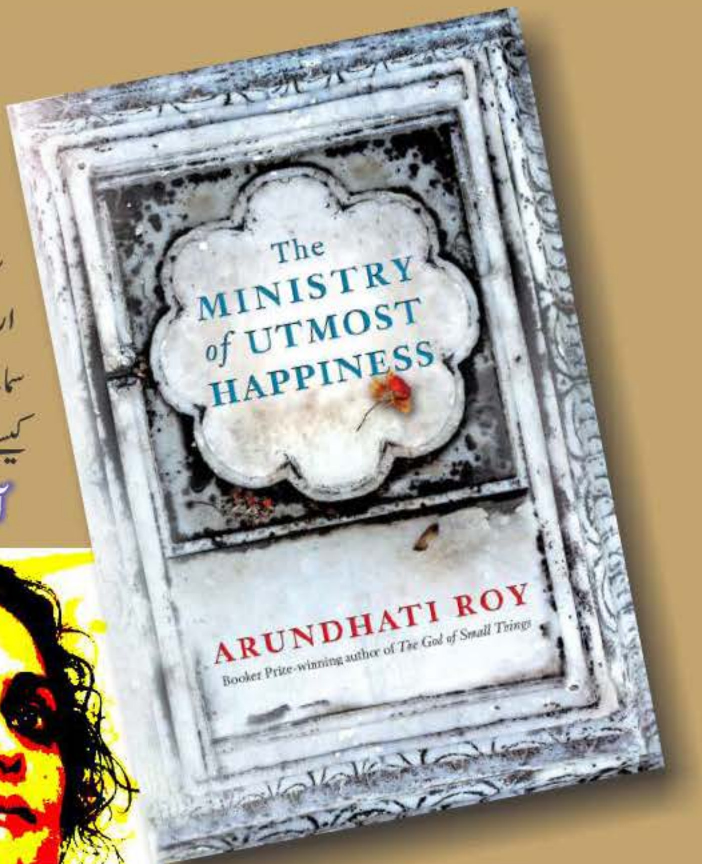
اثبات

کتابی سلسلہ
دوسرا دور
اپریل 2018
شمارہ: 17

مدیر
اشعر نجمی

"پتہ نہیں ہم ایکٹیوزم کو گالی کیوں سمجھنے لگے ہیں۔ میں تو یہ ضرور دیکھنا چاہتا ہوں کہ ارون دھتی رائے نے ان سماجی معاملات کو ناول میں کیسے ڈھالا۔"

آصف فرخی





"نثر میں اتنی کاٹ نہیں جتنی پہلے ناول میں تھی، کہیں کہیں جملے جگمگا اٹھتے ہیں اور دل کو چھیڑتے ہیں لیکن مجموعی تاثر اعلیٰ درجے کی صحافت کا ہے۔"

محمد سلیم الرحمٰن

100/-

Esbaat Book-series

Season II
Issue No.17, April 2018

Publisher & Printer: Good Times Foundation
Editor: Ash'ar Najmi

B/003, Chandresh Terrace, Old Petrol Pumpl, Parshwa Nagar, Mira Road (East), Dist. Thane - 401107, Maharashtra, INDIA. E-Mail: esbaat@gmail.com
Contact Nos. Editor: 8169002417 (2pm to 5pm), Mgmt. 8652131995 / 9867798042
www.esbaat.com



ادب اور زندگی کی مثبت اور آفاقی قدروں کا ترجمان

اثبات

کتابی سلسلہ — دوسرا دور

اپریل 2018 — شمارہ: 17

www.esbaat.com

مدیر

اشعر نجمی

قانونی مشیر

ضیغم رضوی

انتظامیہ

وقار قادری   سکندر مرزا

Good Times Foundation

(Regd. No. E/10056/Thane)

B/003, Chandresh Terrace, Near Old Petrol Pump,
Parshwa Nagar, Mira Road (East), Dist. Thane-401107 (INDIA)

فی شمارے کی قیمت

عام ڈاک (ہندوستان):	100 روپے
رجسٹرڈ/کوریئر:	200 روپے
لائبریری اور سرکاری ادارے:	200 روپے
بیرون ممالک:	10 امریکی ڈالر

زرِ سالانہ (چار شماروں کے لیے)

عام ڈاک (ہندوستان):	400 روپے
رجسٹرڈ/کوریئر:	800 روپے
لائبریری اور سرکاری ادارے:	800 روپے
بیرون ممالک:	40 امریکی ڈالر

تفصیلات برائے زرِ سالانہ

(۱) زرِ سالانہ منی آرڈر کی بجائے چیک/ڈرافٹ/بینک ٹرانسفر کے ذریعہ ہی ارسال کرنے کی کوشش کریں۔

(۲) چیک/ڈرافٹ صرف "Good Times Foundation" کے نام سے ہی جاری کریں۔

(۳) بینک ٹرانسفر کے لیے ضروری معلومات حسبِ ذیل ہیں:

Account Name: Good Times Foundation
Account No. 012100100001336
Bank Name: Vasai Vikas Sahakari Bank Ltd.
Branch: Mira Road
IFSC:VVSB0000012

رابطہ

تخلیقات اور زرِ سالانہ ارسال کرنے کے لیے صفحہ اول پر درج پتہ کا استعمال کریں۔

esbaat@gmail.com

Editor: 8169002417 (2pm to 5pm)

Management: 9867798042 / 8652131995

مضمون نگاروں کی رایوں سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔
''اثبات'' سے متعلق کسی بھی طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف ممبئی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

پرنٹر اور پبلشر سکندر مرزا نے "Good Times Foundation" کے لیے
چترا پرنٹنگ پریس، بھاینڈر (ایسٹ)، ضلع تھانے میں چھپوا کر
بی/۳، چندریش ٹیرس، پرانے پٹرول پمپ کے قریب، پرشوا نگر،
میرا روڈ (ایسٹ)، ضلع تھانے ۴۰۱۱۰۷ سے شائع کیا۔

فہرست

اعزازی کاپیوں کا لنگر بند

زیر نظر شمارے سے 'اثبات' میں ۱۰۰ صفحات کا اضافہ کر دیا گیا ہے، لیکن قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔

تمام 'خدام اردو، محسنین ادب اور اردو نوازوں' کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اس شمارے سے اعزازی کاپیوں کا لنگر بند کیا جا رہا ہے۔ قلم کاروں کے علاوہ صرف ان کچھ مخلص احباب اور بزرگوں کو یہ پرچہ اعزازی طور پر جاری رہے گا جو کسی نہ کسی اعتبار سے 'اثبات' کے ہم قدم رہے ہیں۔

انتظامیہ

گرین ٹی فکشن

اشعر نجمی

آپ نے کبھی 'گرین ٹی' پی ہے؟

جی وہی، جسے اردو میں شاید 'سبز چائے' کہا جاتا ہے، حالاں کہ کوئی نہیں کہتا۔ سبز چائے پینے والے اکثر اسے 'گرین ٹی' ہی کہتے ہیں، کیوں کہ لفظ 'چائے' سے خواہ مخواہ downmarket قسم کی چائے کا تصور عود آتا ہے جیسے ادرک والی چائے، مسالہ دار چائے، پانی کم چائے، لمبا پانی چائے، ملائی والی چائے، کالی چائے، سلیمانی چائے وغیرہ وغیرہ۔ چائے کی یہ کم و بیش تمام دیسی اقسام آپ کو ہر شہر، قصبے حتیٰ کہ گاؤں کے بازاروں، گلی محلوں، بس اڈوں، ریلوے اسٹیشنوں وغیرہ پر لگے ٹھیلوں اور مڈل کلاس چائے خانوں میں مل جاتی ہیں جہاں چھوٹے چھوٹے گلاسوں یا داغدار اور اکثر تڑخی ہوئی پیالیوں میں لوگوں کا ہجوم ان کی چسکیاں لیتے ہوئے حالات حاضرہ پر تبصرے کرتا نظر آ جائے گا۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کے لیے 'چائے' لگژری نہیں ہے، بلکہ ان کی ضرورت ہے، ان کی زندگی چائے کے بغیر ادھوری اور بے کیف ہے۔ یہ چائے نہ پیئں تو ممکن ہے کہ ان کا ہاضمہ خراب ہو جائے، سر میں شدید درد شروع ہو جائے، قدم لڑکھڑانے لگیں یا زندگی ہی سے بددل ہو جائیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جو خود کو 'اشرف المخلوقات' بھلے نہ سمجھتا ہو لیکن چائے کے 'اشرف المشر وبات' ہونے پر اس کا پختہ ایمان ہے۔ انھیں آپ 'غیر تربیت یافتہ' چائے خور (یہ اصطلاح غلط سہی، لیکن مجھے اس سے بہتر متبادل نظر نہیں آیا) کہہ سکتے ہیں، چونکہ تربیت یافتہ لوگ 'گرین ٹی' پیتے ہیں، چائے نہیں پیتے۔ چائے ان کی ضرورت نہیں بلکہ سامان تعیش میں شامل ہے۔ گرین ٹی عام چائے کی طرح 'سُڑ سُڑ' کر کے سڑکوں کے کنارے نہیں پی جاتی بلکہ اس کی چسکیاں اپنے گھر کے ڈرائنگ روم، شرفا کی محفلوں یا فائیو اسٹار ہوٹلوں میں دانشوروں کے ساتھ highbrow لٹریچر اور کلچر پر گفتگو کرتے وقت لگائی جاتی ہیں۔

اب ایک اور سوال: کیا آپ نے گرین ٹی فکشن پڑھا ہے؟

گرین ٹی فکشن بھی ایک لگژری آئیٹم ہے، جس کی چسکیاں خود کو خوش کرنے کے لیے نہیں بلکہ دوسروں پر دھونس جمانے کے لیے لی جاتی ہیں۔ سماج میں دوسروں سے الگ نظر آنے اور 'خاص' دِکھنے کے

لیےاس کا بقدرِ ضرورت اور برمحل استعمال کیا جاتا ہے۔ گرین ٹی فکشن ضرورت نہیں، status symbol ہے۔ اس کے ہونے یا نہ ہونے سے عام قارئین کو کوئی فرق نہیں پڑتا، چونکہ یہ اس کا مسئلہ نہیں ہے۔ عام قارئین کے لیے جس طرح چائے، سگریٹ، سنیما اور سیکس شوق فضول ہیں، اسی طرح فکشن پڑھنا بھی اس کا ایسا شوق فضول ہے جس کے لیے وہ بقول آڈن، اپنی جان تک دے سکتا ہے۔ اس کے برعکس گرین ٹی فکشن یونیورسٹیوں کے پروفیسروں، نظریاتی نقادوں، مقالہ نگاروں، مبصروں، ادبی رسالوں، سیمیناروں کے مقالہ نگاروں، انعامات واعزازات کے حریص ادیبوں اور پی ایچ ڈی کے اسکالروں کے لیے شناختی کارڈ ہے جس کے بغیر الیٹ کلاس میں انھیں اِنٹری نہیں مل سکتی۔

میں نے گرین ٹی بھی پی ہے اور گرین ٹی فکشن بھی پڑھا ہے لیکن چونکہ مجھے ادب میں جھنڈے گاڑنے وغیرہ کا خبط نہیں ہے اور نہ ہی مجلسی ہوں، لہٰذا میں اس فکشن سے اپنی تنہائی آباد کرتا ہوں جو میری لونگ الائچی والی چائے کا مزہ دوبالا کردے۔ دراصل، میرے فکشن کے مطالعے کی نیو ہی 'ٹیڑھی' ہے۔ میری فکشن سے پہلی ملاقات 'قصص الانبیا' کے ذریعے ہوئی، جو میں نے ۱۶۔۱۷ سال کی عمر میں پڑھی تھی، اس کے بعد قصے کہانیوں کو پڑھنے کا ایسا چسکا لگا کہ نویں جماعت میں فیل ہوگیا، چونکہ پریکٹیکل کی بڑی بڑی کاپیوں کے اندر ناول چھپا کر پڑھا کرتا تھا (میں ہائی اسکول تک سائنس کا طالب علم رہا ہوں)۔ 'قصص الانبیا' نے حاتم طائی اور گل بکاؤلی سے ملاقات کرائی، وہاں سے ہوتا ہوا رامائن، مہابھارت اور جاتک کتھاؤں تک پہنچا۔ چائے کی کیتلی ابلتی رہی۔ گلشن نندہ نے رومانس کی تڑختی ہوئی پیالی میں ملائی والی چائے پیش کی، بہت مزہ آیا، کئی پیالیاں غٹک ڈالیں۔ عمر کے ساتھ 'ہل من مزید' کی صدا اونچی ہوتی رہی، چائے کی پیالیوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ ابن صفی کو پڑھنے کی کوشش کی لیکن ان سے قریب نہ ہو پایا، البتہ جیمس ہیڈلے چیز کے ناول اور مظہر الحق علوی کے تمام تراجم چاٹ ڈالے۔ تراجم کا دور شروع ہوا تو ایڈگر ایلن پو کیوں بچتا، اس کے وہ تین جاسوسی ناول بھی پڑھ ڈالے جن کا ترجمہ ابن انشا نے کیا تھا۔ ایڈگر ایلن پو کی طرح سمرسٹ ماہم بھی بے چارہ بعد میں گرین ٹی ناول نگاروں کی فہرست میں شامل ہوا، پہلے تو وہ بھی ادرک الائچی والی چائے پینے والوں کا محبوب ہوا کرتا تھا۔ پھر شروع ہوا روسی مہمانوں سے مصافحوں ومعانقوں کا دور؛ لیکن ووڈکا کو بھی چائے بنا کر پی گیا۔ یکسانیت سے اکتانا میری پرانی ہابی ہے، سو یہاں سے رخت سفر باندھا اور روس سے واپسی کی فلائٹ پکڑ کر چلا آیا، ائیرپورٹ پر میرا استقبال پریم چند، عصمت، منٹو اور کرشن چندر کی جماعت نے کیا۔ اپنے لوگوں کے ساتھ چائے پینے کی بات ہی کچھ اور ہے، یہ وہی جان سکتے ہیں جنھوں نے 'دیارِ غیر' کی ایک عمر خاک چھانی ہو۔ خیر، قصہ مختصر یہ کہ 'قصص الانبیا' نے جو منتر پھونکا تھا، اس کے سحر سے اب تک آزاد نہیں ہو پایا ہوں۔ میں آج بھی نیر مسعود، انتظار حسین، اکرام اللہ وغیرہ کے فکشن پڑھ کر اپنے پورے جسم میں وہی انرجی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ نیر مسعود زندگی کا کون سا فلسفہ مجھے پڑھا رہے ہیں اور انتظار حسین کی کہانیاں کس طرح ماضی کو ہمارے حال سے پیوست کرتی ہیں۔ میرا کہانی سے پہلا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ کہانی اپنی پہلی سطح پر بھی کہانی ہو، خواہ وہ علامتی ہو، استعاراتی ہو یا تمثیلی ہو، خواہ اس کے کردار میری دنیا کے

ہوں یا نہ ہوں لیکن اس میں اتنی گنجائش ضرور ہو کہ میں ان کی دنیا میں اپنی جگہ بنا سکوں۔ Game of Thrones میں میری دنیا کے کردار نہیں ہیں، ان کے مسائل میرے نہیں ہیں، حتیٰ کہ ان کی زبان بھی میری نہیں ہے لیکن وہ مجھے پکڑ لیتے ہیں اور اپنی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ لہٰذا مجھے ڈرانے اور دھمکانے کی کوشش نہ کریں، میں ایک بے ریا قاری ہوں۔ مجھے ناول کے اجزائے ترکیبی نہ سمجھائیں، صرف ناول پڑھائیں۔ میں حفظانِ صحت کے اصولوں کے تحت نہ کھاتا ہوں اور نہ فکشن پڑھتا ہوں، حتیٰ کہ سیکس کرتے ہوئے کنڈوم کا استعمال بھی گناہ بے لذت میں شمار کرتا ہوں۔

میں نے بحیثیت قاری یہ محسوس کیا ہے کہ ہم کسی مصنف کی تخلیق کو دماغ سے نہیں پڑھتے (دماغ سے صرف احمق پڑھتے ہیں) اور نہ صرف دل سے پڑھتے ہیں، بلکہ اس کے لیے دل اور مضبوط ریڑھ کی ہڈی کی ضرورت ہوتی ہے۔

میرے خیال میں، پڑھنا ایک قرض کا اقرار ہے، لکھنا اس قرض کی ادائیگی ہے۔ لکھنے کے بعد آپ کو مرنے کا حق مل جاتا ہے۔ فکشن موت کا سامنا کرنے کا فن ہے۔ اس میں ادب پڑھنا اور لکھنا دونوں شامل ہیں۔ جیسے ریشم کا کیڑا اپنے چاروں طرف ایک قیمتی چیز بُنتا ہے اور موت کو دعوت دیتا ہے، ویسے ہی موت اپنے چاروں طرف کہانی بنتی ہے، جس کا نام زندگی ہے۔

میں نے اچھے برے مختلف قسم کے فکشن کو پڑھنے کے بعد ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لی ہے کہ تخلیق کا فن سماج کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ صرف اس شخص کے لیے اہمیت رکھتا ہے جو اس کے رابطے میں آتا ہے اور ایک فنکار یا ادیب کے لیے بھی وہی شخص اہم ہوتا ہے یا ہونا چاہیے۔ ایک اچھا ناول نگار ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ اپنے تصورات کے حق میں بے ریا ہو، صاف گو ہو، اسے اس بات کی فکر نہ ہو کہ وہ جو لکھ رہا ہے اس میں کتنا سچ ہے۔ مثلاً وہ ایک کہانی لکھتا ہے، اس لیے کہ اس پر اسے یقین ہوتا ہے لیکن یہ اعتماد اس طرح کا نہیں جس طرح کا کوئی تاریخ پر کرتا ہے بلکہ یہ یقین اس طرح کا ہوتا ہے، جیسا اپنے خوابوں اور خیالوں پر کیا جاتا ہے۔ کسی چیز کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانا جاسکتا ہے لیکن سب کچھ نہیں۔ سب کچھ جان لینے کی ہوس ہی بلڈ پریشر بڑھاتی ہے۔

مجھے سیاسی ناولوں اور سماج میں انقلاب لانے کی احمقانہ خواہش سے لکھے گئے ناول سے زیادہ اکتا دینے والی کوئی دوسری چیز نہیں ملی۔ سب سے مشکل کام انسانوں کے بارے میں پوری دیانت داری سے لکھنا ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے سب سے پہلے ایک ناول نگار کو اپنا موضوع جاننا ہوگا اور پھر یہ کہ اسے لکھا کیسے جائے۔ میرے خیال میں دونوں کو جاننے میں ایک پوری زندگی نکل جاتی ہے۔ پتہ نہیں لوگ ہر چھ ماہ میں کیسے ایک ناول لکھ مارتے ہیں۔

زندگی جیسی بھی ہو، یہ ناول نگار کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ اس کے لیے زندگی کے معنی اس وقت افشا ہوتے ہیں جب وہ اس کے ناول میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک مصنف کی اخلاقیات، وہ جس موضوع کو لے کر چلتا ہے یا جن دلائل کے سہارے وہ اپنی بات کہتا ہے، اس میں نہ ہو کر زبان کے ساتھ اس کے سلوک میں پوشیدہ

ہوتی ہے۔اس کے برعکس ایک خراب ناول نگار اپنے بارے میں زیادہ بات کرتا ہے، حتیٰ کہ اپنے کرداروں کے حوالے سے بھی وہ اپنے بارے میں ہی بک بک کرتا رہتا ہے۔لیکن ایک اچھا ناول نگار خود سے باتیں کرتے ہوئے دوسروں سے مخاطب رہتا ہے۔ بیشتر لکھنے والے اپنے آپ سے باہر نہیں نکل پاتے، صرف اپنی کہانیاں لکھنا اکثر لوگوں کا مشغلہ ہے۔ یہ آسان بھی ہے، خود کو نئے نئے لباس میں ملبوس کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرنا، خود کو مظلوم اور لاچار بنا کر ناول کے درمیان قائم کرنا آسان نسخہ ہے۔اصل چیلنج دوسروں کے اندر بیٹھ کر لکھنا ہوتا ہے، اپنے شانوں پر دوسرے کا سر لگا کر سوچنا ہوتا ہے۔ یہ تجربہ ایک ناول نگار کے لیے ایک چھوٹے سے جہاز پر تنہا اڑنے کے مترادف ہے، اس میں آپ کے اندر بیٹھا قاری 'نیوی گیٹر' کی طرح کام کرتا ہے۔لہٰذا ناول نگار کیسا بھی ہو لیکن اسے ایک اچھا قاری ضرور ہونا چاہیے۔

میرے نزدیک لفظ اور معنی کے شراب ہو جانے کا نام ادب ہے۔جن چیزوں سے شراب بنتی ہے، ان میں نشہ نہیں ہے بلکہ ان کے امتزاج میں ہے۔لہٰذا لفظ اور معنی اپنی علیحدہ شکل میں ادب نہیں بلکہ اپنے ملاپ میں ہیں۔ناول نگار اظہار میں نہیں، اشاروں پر یقین رکھتا ہے۔لفظ ہے کیا؟ لفظ اجتماعی لاشعور کا اشارہ ہی تو ہے۔ اگر آپ کسی لفظ کا استعمال کرتے ہیں تو پڑھنے والے کو اس لفظ کا کوئی معنی پہلے سے پتہ ہونا چاہیے۔اگر ایسا نہیں ہے تو اس لفظ کا اس کے لیے کوئی معنی نہیں۔ میرے خیال میں ایک ناول نگار یا شاعر قارئین کی یادداشت میں اس مخصوص لفظ کے معنی کو جگا کر اسے تصوراتی بنا دیتا ہے۔

میرے خیال میں ایک اچھا ناول لکھنے کے لیے شاید ایک ہی قدر اور مشترکہ صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کتاب کے ہر حصے میں کچھ نہ کچھ ایسا ہو جو میرے تصورات کو ایک پُر لطف احساس سے بھر دے۔ لہٰذا، ایک اچھا مصنف اپنے تجربوں سے جتنا سیکھتا ہے، اپنے تصورات میں اتنا ہی سچا ہوتا ہے۔اور شاید اسی لیے میں نے بارہا محسوس کیا ہے کہ ایک 'سچے تصوراتی' ناول کو آپ خواہ کتنی بار ہی کیوں نہ پڑھ جائیں، یہ بتانا ہمیشہ مشکل ہوگا کہ وہ کیسے لکھا گیا ہوگا۔ ہر شہ پارہ اپنی اکائی میں پُر اسرار ہوتا ہے، آپ جتنی بار پڑھ جائیں، ہر بار اس میں سے کچھ نیا ڈھونڈ نکالیں گے۔

آپ ایسے ناولوں کی مدد سے اچھے ناول نگاروں کا طریق کار تلاش کر سکتے ہیں، ان کی ترجیحات اور ان کے تخلیقی عمل کو 'ڈی کوڈ' کر سکتے ہیں اور اس کے لیے آپ کو نقاد ہونے یا کہلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے پتہ نہیں کہ آپ کو کیسا ناول پسند ہے اور ظاہر ہے میں کسی دوسرے کی ترجیحات کو اپنی پسند نہیں بنا سکتا، لہٰذا میں اپنے cup of tea یعنی اپنے پسندیدہ ناول اور ناول نگار پر اپنی گفتگو محدود رکھوں گا۔

میرے پسندیدہ ناول نگار کی تمام تر ترجیحات میں کہانی کو اولیت حاصل ہوتی ہے، جس پر وہ بقیہ تمام چیزیں قربان کر دیتا ہے، حتیٰ کہ وہ نہایت بے دردی سے ان ابواب کو بھی ردی کی نذر کر دیتا ہے جو پُر تجسس اور پُر لطف ہونے کے باوجود مرکزی خیال سے منطقی وابستگی نہیں رکھتے۔ یہ سفا کی اس لیے ضروری ہے کہ جب میرا اگبروا ایک کہانی لکھ رہا ہوتا ہے تو وہ اسے کسی کو سنانا بھی چاہتا ہے، چنانچہ وہ جانتا ہے کہ اگر اس میں رتی برابر بھی غفلت ہوئی تو وہ اپنے مقصد میں ناکام ہو سکتا ہے۔لہٰذا وہ وہی کہانی نہیں لکھنا چاہتا، جسے لکھنے

کی ضرورت اس نے محسوس کی تھی بلکہ وہ ایک ایسی کہانی بھی لکھنا چاہتا ہے جسے وہ خود پڑھ سکے۔

لکھنے کے پیچھے بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں، مثلاً خود کو دوسروں سے زیادہ عقلمند ثابت کرنے کی خواہش، مشہور ہونے اور مرنے کے بعد یاد رکھے جانے کی تمنا وغیرہ۔لفظوں سے سماج میں انقلاب لانے اور لوگوں کی زندگیوں کو متاثر کرنے جیسے کئی مغالطے لکھنے والوں کو ہوتے ہیں۔لیکن یہ ایک جینوین قلم کار کے لکھنے کی وجہ نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس میرا ناول نگار جب سوچتا ہے کہ میں کیوں لکھتا ہوں تو اسے حیرت ہوتی ہے۔ لکھتے ہوئے نہ تو وہ کوئی خوبصورت چیز بنا رہا ہوتا ہے اور نہ تفریحی کہانیاں گڑھنے کی ہی اس کی کوئی منشا ہوتی ہے۔ پھر وہ شدت سے محسوس کرتا ہے کہ لکھنا دراصل زندہ رہنے کا ایک بہانہ ہے اور شاید سب سے ضروری کام بھی۔ایک ایسا کام جسے اگر وہ نہ کرے تو اسے اپنا وجود خود خوفزدہ کرنے لگتا ہے۔ میرے ناول نگار کے لیے لکھنا ہمیشہ خوشگوار عمل نہیں ہوتا، لیکن نہ لکھ پانے کے کرب سے ہمیشہ بہتر رہتا ہے۔

ایک نیا ناول لکھتے وقت میرا ناول نگار ویسا ہی نہتا ہوتا ہے جیسا وہ گذشتہ ناول لکھنے سے پہلے ہوا کرتا تھا۔ نیا ناول شروع کرتے ہوئے اسے یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ اس بار کھیل کے اصول کیا ہوں گے۔اسے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پھر سے کھیلنے جا رہا ہے۔ ہمیشہ یہی بے نام خوف اسے متشکک بنا دیتا ہے، اسے مبہم جو بنا دیتا ہے، وہ اس ادھیڑ بن کی گرفت کا شکار ہو جاتا ہے کہ پتہ نہیں اس بار اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے، کیا پانے والا ہے، اس بار وہ کیا کھونے والا ہے اور اس بار کون سی ایسی شے اس کے ہاتھ لگنی والی ہے جس کا اس سے پہلے تجربہ نہیں تھا۔ یہ ساری چیزیں ناول کو ایک ایسی قوت سے سرفراز کرتی ہیں جن میں بہت ساری چیزوں کے آنے نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ناول اپنی رفتار سے، اپنی قوت سے آگے جاری رہتا ہے۔

اگر میرے کسی ایک پسندیدہ مصنف کے دو ناولوں میں مجھے کچھ تبدیلی محسوس ہوتی ہے تو سمجھ جاتا ہوں کہ وہ کھیل کے اصولوں کی تبدیلی کے سبب ہے۔ میں نے بہت سارے ایسے ناول پڑھے ہیں، جن میں ایک خاص اسلوب اختیار کیا جاتا ہے، جس میں سب کچھ طے شدہ ہوتا ہے، کوئی الجھن نہیں نظر نہیں آتی۔ کھیل کے اصول بھی مقرر ہیں۔ایک ہی طرح سے ناول اپنا سفر کرتا ہے، ایک ہی طرح سے منزل پر پہنچتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اصول برسوں کی ریاضت کے بعد پیدا کیا گیا ہو، ممکن ہے کہ اس اسلوب کو وضع کرنے میں ناول نگار نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ جھونک دیا ہو، لہٰذا ایک صاحب اسلوب ناول نگار خوفزدہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی بھر کی کمائی کہیں لٹا نہ دے، اس لیے وہ تادم مرگ اس اسلوب سے چمٹا رہتا ہے، اس کے اندر نئی راہوں کو تلاش کرنے کی وہ فطری صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے جو گمنام جزیروں کی بازیافت کر سکتی تھی۔ پھر ایسا تن آسان ناول نگار یہ نہیں دیکھتا کہ اس کا نیا ناول اس سے کس اسلوب کا تقاضا کر رہا ہے، وہ تو بہر حال اس کی انگلی پکڑ کر اپنی چال چلانا چاہتا ہے۔اس کے اندر نئی شروعات کا جذبہ تقریباً ختم ہو چکا ہوتا ہے۔

خود اعتمادی اچھی چیز ہے لیکن یہ کبھی کبھی لکھنے والے کے لیے رکاوٹ کا سبب بھی بنتی ہے۔ایک خود اعتماد قلم کار متجسس اور مشتبہ نہیں ہوتا، چنانچہ اس کا سفر اور منزل دونوں متعین ہوتے ہیں۔اس کے برخلاف

ایک مبہم جو قلم کا رڈرا ہوا ہوتا ہے، اندھیرے میں ہاتھ پاؤں چلاتا رہتا ہے، کسی کو ڈسٹرب کیے بغیر وہ خود کو ہر لمحہ بیدار رکھتا ہے، چوکنا رہتا ہے۔ ہر کہانی یا ہر ناول کے ساتھ وہ خود کو سیکھنے والوں کی قطار میں پاتا ہے اور ہر بار زبان، اسلوب، ہیئت اور اظہار کی صلاحیت اسے کم ہوتی محسوس ہوتی ہے۔اس کے سامنے بنے بنائے سانچے پڑے ہوتے ہیں، نقادوں کے ہدایت نامے موجود ہوتے ہیں لیکن وہ اس کوڑا کرکٹ کے درمیان اپنی دنیا خلق کرنا چاہتا ہے۔ وہ لکھتے ہوئے لیبارٹری کا استعمال نہیں کرتا، ٹیسٹ ٹیوب، کیمیائی مرکبات، اسپرٹ لیمپ وغیرہ کا سہارا نہیں لیتا لیکن پھر بھی کہانی ایک طویل مرحلے کے بعد پوری شدت سے اسے شرابور کرتی رہتی ہے۔ کہانی یا تھیم سے چپکے رہنے کی نقادوں کی نصیحت کے باوجود کہانی اس پر چڑھ کر بولتی ہے اور کبھی کبھی اپنی حدیں پار بھی کر جاتی ہے۔

دراصل اکثر ناول نگار ان ایکسیڈنٹس سے ڈرتے ہیں جو دورانِ تحریر پیش آتے ہیں اور جن کے بارے میں ایک پُر تجسس اور مبہم جو ناول نگار نے کبھی سوچا نہیں ہوتا، لیکن وہ ایسے حادثوں کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوتا ہے، کیوں کہ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ تخلیق ادب موت کا سامنا کرنے کے مصداق ہے۔ چنانچہ آپ کو ناول کے شہیدوں کی ایک طویل فہرست مل جائے گی لیکن غازی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ لیونارڈو نے کہا کہ very great work of art is spontaneous۔ یہ بے ساختگی کیا ہے؟ یہ بے ساختگی صرف کچھ الفاظ کے دروبست سے عبارت نہیں ہے بلکہ یہ رویے سے بھی منسوب ہے، ایک وقفہ بھی ہے، ایک مہلت بھی ہے، ایک نجات بھی ہے، ایک رہائی بھی ہے اور ان ساری چیزوں کا امتزاج بھی ہے۔ان ساری چیزوں کے ایک ساتھ ملنے پر ایسا کچھ ہوتا ہے جو آپ کو حیرت زدہ کر جاتا ہے جس کا تصور بھی آپ نے نہیں کیا ہوتا ہے، وہ اچانک چھم سے آپ کے سامنے ٹپک پڑتا ہے۔

لیکن کیا یہ واقعی اچانک ہوتا ہے؟ منٹو کو پھر سے پڑھیں، اس نے اس بے ساختگی کو اتنی مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے کہ وہ اس کے اسلوب میں واضح طور پر نظر آ جاتا ہے۔اس سے یہ نتیجہ نکالنا آسان ہے کہ یہ بے ساختگی دراصل کچھ نہیں ہے، وہ ایک متواتر عمل سے جنما واقعہ ہے۔لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ مثلاً نیر مسعود کے ہاں حادثہ رونما ہوتا تو ہے لیکن وہ نظر آنا بند ہو جاتا ہے۔ بے ساختگی کا یہ فرق دراصل متواتر ہونے والے طرزِ عمل سے پیدا ہونے والے اثرات ہیں جو فن پارے میں نظر آتے ہیں۔

میرا ناول نگار کامیاب ناول لکھنے کی کوشش کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا، بلکہ وہ اپنے قیمتی وقت کا استعمال صرف 'لکھنے' میں لگاتا ہے، خود سپردگی ہی اس کے لیے راہ نجات ہے۔ میں اپنے پسندیدہ ناول نگار سے ہر بار 'بہترین' کی توقع نہیں رکھتا چونکہ جانتا ہوں کہ لکھنے کے ساتھ یہ بڑا المیہ ہے کہ آپ ہمیشہ ویسا کبھی نہیں لکھ پاتے جیسا لکھا جا سکتا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ خود کو دوہرانے اور قلم گھسنے سے بہتر ہے کہ ناول نگار یہ طے کر لے کہ اب وہ کچھ نہیں لکھے گا، نہ سوچے گا۔اس سے یہ ہوگا کہ وہ جو کچھ کہہ سکتا تھا، آنکھیں بند کر کے اسے تھپتھپائے گا، چپت لگائے گا جیسے کسی بلی کو کوئی لگاتا ہے۔

ممکن ہے کہ آپ میں سے کوئی مجھ سے پوچھ لے کہ میاں اتنی بکواس کر لی، یہ تو بتاؤ کہ تمھارے

نزدیک کہانی کیا ہے؟ تو میرے نزدیک اس کی بہت سادہ تعریف ہے؛ محض کچھ مکالمے، کچھ گفتگو، کچھ آوازیں یا پھر حرکتیں۔ میرے خیال میں، جس کہانی کو محسوس کرنے اور لکھنے میں تخلیق کار کی پانچوں حسیات کم پڑ جائیں اور قاری کی بھی پانچوں محسوسات ناکافی ہو جائیں بلکہ اسے دو چار مزید محسوسات کو بیدار کرنے کی ضرورت محسوس ہو جائے تو سمجھ لیجیے کہ وہ اچھی کہانی ہے۔

میں جب کبھی ٹرین میں جگہ نہ مل پانے کے سبب لٹک کر سفر کرنے والے مجبور اور بے بس مسافروں کو دیکھتا ہوں تو بے ساختہ کسی ناول کا کوئی کردار یاد آنے لگتا ہے، سماج میں اپنی جگہ تلاش کرتا ہوا کوئی کردار۔ یا پھر میرے زمانے کا ایسا کوئی ناول جو کبھی لٹک کر، کبھی چھت پر چڑھ کر، بجلی کے تاروں سے زندگی بچاتا ہوا سفر طے کر رہا ہو۔اس زمانے میں ناول لکھنا تیسرے درجے میں سفر کرنا ہی تو ہے۔ جس سماج میں اسے پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں ملتی، اسی سماج میں وہ ناول جگہ بنا کر اپنا سفر پورا کرنا چاہتا ہے۔ یہ سفر فرسٹ کلاس کے سفر کی طرح آرام دہ نہیں ہے لیکن عام کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی قدموں پہ پڑی ملتی ہے۔ کچھ ناول بنا ٹکٹ سفر کرتے ہیں اور وہ بھی ڈنکے کی چوٹ پر۔ کچھ دنیا بھر کا بوجھ اٹھائے چل رہے ہیں اور کچھ زمانے کو ٹھوکر رسید کرتے ہوئے اپنی چال چل رہے ہیں۔ایسا نہیں ہے کہ بنا ٹکٹ سفر کرتا ہوا ناول صرف عام کمپارٹمنٹ میں ہے بلکہ وہ سکنڈ اے سی، تھرڈ اے سی میں بھی موجود ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اسے ٹکٹ کلکٹر اشرافیہ کی آڑ میں نہیں پکڑتا۔ وہ اپنی امارت اور طبقہ اشرافیہ کے رکن ہونے کا ایسا سوانگ رچتا ہے کہ خود چوری کرتا ہوا دوسروں کو چور ٹھہرا دیتا ہے۔

بس مختصر میں ایک آخری بات کہہ کر اجازت چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک ایک ناول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ناول نگار کیا کہنا چاہتا تھا بلکہ ایک ناول خود کیا کہتا ہے اس سے سروکار ہوتا ہے۔ میرے لیے ناول پڑھنا آنکھوں سے سننے کا عمل ہے۔

کچھ اس شمارے کے بارے میں

زیر نظر شمارہ کی 'کور اسٹوری' کے لیے میرے ذہن میں جو پہلا خیال آیا تھا، وہ بطور خاص تین ناول تھے جو انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئے۔ان میں دو تو اروندھتی رائے اور گلزار کے ناول تھے، جن کے ابواب زیر نظر شمارے میں شامل ہیں۔اس کے علاوہ جنوبی افریقہ کے معروف ادیب جے ایم کوٹسی (John Maxwell Coetzee) کا "Waiting For The Barbarians" تھا جس کا اردو ترجمہ معروف اردو فکشن نگار صدیق عالم نے ''وحشیوں کا انتظار'' کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ ترجمہ اجمل کمال نے اپنے مؤقر رسالہ 'آج' (کراچی) میں شائع کر دیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ ہندوستانی قارئین اب تک اس سے محروم ہیں۔ ''وحشیوں کا انتظار'' نوآبادیاتی تسلط اور ظلم و ستم کے موضوعات کی کھوج کرنے والا ایک نہایت طاقتور بیانیہ ہے اور جدید حساس فکشن کی انتہائی بلندیوں کو چھو لیتا ہے۔

ظاہر ہے ان تینوں ناولوں کی ایک ہی شمارے میں شمولیت کے بعد بقیہ مشمولات کے لیے کوئی گنجائش ہی نہ بچتی، لہٰذا دل پر پتھر رکھ کر آخر الذکر ناول کی اشاعت کو موخر کر دیا گیا۔

اس شمارے سے شاعری کے حصے کو زیادہ متنوع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بیس پچیس شاعروں کی دو دو غزلیں یا نظمیں چھاپنے کی بجائے ہر شمارے میں ایک یا دو ایسے شاعر کی دس بیس غزلیں یا دس بارہ نظمیں کیوں نہ چھاپی جائیں جنھیں یا تو بھلا دیا گیا، یا پھر جن سے کم از کم ہندوستانی قارئین واقف تک نہیں ہیں۔ مجھے شک ہے کہ ثروت حسین، محمد انور خالد، سید کاشف رضا، عمیر نجمی وغیرہ جیسے پرانے اور نئے شاعروں سے ہندوستانی رسائل کے عام قارئین تو دور، مدیران تک واقف ہوں گے۔ یہی حال افسانے کا ہے، دس نان رائٹرس کے لنگڑے لولے افسانے چھاپنے سے بہتر ہے کہ کسی اچھے اور لائق افسانہ نگار کی ایک سے زیادہ چیزیں چھاپی جائیں۔ اس کے علاوہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب 'اثبات' میں صرف غیر رسمی اور ادب کے بنیادی موضوعات پر لکھے گئے ایسے مضامین کو ترجیح دی جائے گی جس سے قارئین اسی طرح لطف اندوز ہو سکیں، جس طرح وہ غزل اور فکشن پڑھتے ہوئے ہوتے ہیں۔

مجھ پر ایک الزام ہے کہ میں مطبوعہ چیزیں کثرت سے چھاپتا ہوں اور یہ کہ مشمولات میں انٹرنیٹ سے حاصل کی ہوئی بہت سی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ جی ہاں، کسی حد تک یہ بات درست بھی ہے، لیکن یہ کام تو میں پہلے شمارے سے اس اعلان کے ساتھ کرتا رہا ہوں کہ میں ایک خراب اور ناقص غیر مطبوعہ کلام پر ایک بہترین مطبوعہ فن پارے کو ترجیح دوں گا، چونکہ رسالوں کا کام صرف چھاپنا نہیں بلکہ ذہنی تربیت بھی ہوتا ہے۔ لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے ان لوگوں کی نکتہ چینی پر جنھوں نے 'اثبات' میں شامل ان چیزوں کو پہلے پڑھا بھی نہیں ہوتا اور شاید اس کے وجود سے واقف تک نہ ہوتے اگر مدیر کشادہ قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس تحریر کے آخر میں اس کا ماخذ درج نہ کر دیتا۔ انٹرنیٹ کا طعنہ مارنے والے بیچاروں کی نئی ٹیکنالوجی سے اتنی ہی شناسائی ہے کہ ان میں سے اکثر ایمیل تک کرنے کے اہل نہیں ہیں یا پھر زیادہ سے زیادہ فیس بک پر ایک ڈیڑھ سطری کمنٹ کرنے پر قادر ہیں اور وہ بھی اردو رسم الخط کی بجائے رومن میں۔ ایسے بیچاروں کو کیا علم کہ نئی ٹیکنالوجی نے علم کے سمندر کو کس طرح کوزے میں سمیٹ کر پیش کر دیا ہے۔ کل تک جن کتابوں اور تحریروں تک ہماری رسائی نہیں تھی، آج انٹرنیٹ کی ہی بدولت ان کا انبار ہمارے سامنے پڑا ہے۔ انھیں تو میرا شکر گذار ہونا چاہیے تھا لیکن احسان فراموشی بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔

زیر نظر شمارے سے پرچے میں ۱۰۰ صفحات کا اضافہ کیا جا رہا ہے لیکن قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ کئی لوگوں نے کاغذ کی کوالٹی کی شکایت کی جو بجا ہے لیکن فی الحال ہمارے لیے اپنے بجٹ میں رسالے کے تسلسل کو برقرار رکھنے کا چیلنج درپیش ہے۔ یوں بھی کسی ادبی رسالے کا معنوی پہلو اس کے صوری پہلو پر مقدم ہوتا ہے یا ہونا بھی چاہیے؛ 'شب خون'، 'ذہن جدید' یا 'نیا ورق' جیسے جریدے سامنے کی مثالیں ہیں۔ پھر بھی ہم مستقبل قریب میں کاغذ کی کوالٹی کو معیاری بنانے کی کوشش کریں گے جو قارئین کے گرانقدر مشوروں سے زیادہ ان کی قوت خرید پر منحصر کرتا ہے۔ ـــ

'بے پناہ شادمانی کی مملکت'

کتاب، کتب بینی، کتاب لکھنے اور چھاپنے والوں کا اگر باریکی سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ جب کسی معاشرے پر زوال آتا ہے تو بہت سے شعبہ ہائے زندگی متاثر ہوتے ہیں، کیوں کہ زوال اپنی پوری علامتوں کے ساتھ ظہور پذیر ہوتا ہے، جسے سمجھنے کے لیے کسی راکٹ سائنس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لہٰذا ادبی منظر نامہ بھی اس کی لپیٹ میں آیا۔ کچی پکی شاعری، ڈائجسٹ زدہ فکشن، یادداشتوں کے نام پر اپنی ذاتی اور غیر دلچسپ داستانیں، رعونت زدہ سفر نامے اور ناقص تراجم سمیت کئی اصناف پر کتابوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ خزف ریزے ادب کے مخلص قارئین کے لیے بوجھ ہوں لیکن ادبی تاجروں کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئے ہیں۔ انھی کے دم سے ادب میں کئی نئی صنعتوں کا اضافہ ہوا، مثلاً؛ سیمینار، ادبی کانفرس، جشن، ادبی فیسٹول اور تقریب رونمائی کا کاروبار چل پڑا اور یوں بالشتیوں اور طفیلیوں کی نکل پڑی۔ ادبی چہل پہل کو ادب کی چہل قدمی تسلیم کر لیا گیا۔ ہندو پاک کے ہر بڑے شہر میں یہ صنعت خوب پنپ رہی ہے اور اب زبان و ادب کے مسیحا یہی صنعت کار ہیں۔ اس کاروبار مسیحائی کو چمکانے میں جہاں نام نہاد تخلیق کاروں نے حصہ لیا، وہیں اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے سے وہ دانشور بھی پیچھے نہیں رہے جن کی کتابیں ہم سینوں سے لگائے پھرتے ہیں۔

دراصل کتاب کے ساتھ تنہائی کا رشتہ پرانا ہے اور بدقسمتی سے اب انسان تنہا نہیں رہا۔ کنزیومرزم یا صارفیت نے سب کچھ نگل لیا، ادب اور ادیب کو بھی۔ کتب بینی کی معدوم ہوتی اس روایت کے احیا کے لیے 'اثبات' ہمیشہ سے کافی سنجیدہ رہا ہے، یہی سبب ہے کہ شمارہ نمبر: ۱۰ میں خالد جاوید کے ناول 'موت کی کتاب' پر ہم نے سیر حاصل گفتگو کا اہتمام کیا تھا۔ ایک بار پھر علم و ادب کی ساکت جھیل میں ایک لرزش سی پیدا ہوئی ہے۔ اگر چہ اسے 'اردو کی کتاب' تو نہیں کہا جا سکتا، لیکن اس نے انگریزی کے علاوہ اردو اور ہندی کے قارئین میں زندگی کی لو بڑھا دی ہے۔ جی ہاں، میری مراد ارون دھتی رائے کے نئے ناول ''The Ministry of Utmost Hapiness'' سے ہے، جس کا اردو میں ترجمہ ارجمند آرا نے ''بے پناہ شادمانی کی مملکت'' کے عنوان سے کیا ہے اور

خوب کیا ہے۔

اروندھتی رائے کا نیا ناول ان کے پہلے ناول ’’The God of Small Things‘‘ کے ۲۰ سال بعد آیا ہے۔ یہ طویل عرصہ ان کے مداحوں کے لیے ایک پہیلی کی طرح رہا ہے، حتیٰ کہ اس دوران یہ سرگوشیاں بھی ہونے لگی تھیں کہ ان کا پہلا ناول محض ایک ’حادثہ‘ تھا۔ پہلا ناول جسے نیم سوانح عمری پر مبنی کہانی بھی گردانا گیا تھا، اس نے ’بوکر پرائز‘ جیتا تھا، ۴۲ زبانوں میں اس کی تقریباً ۸۰ لاکھ کاپیاں فروخت ہوئیں اور ایک غیر معروف اسکرین رائٹر راتوں رات عالمی شہرت یافتہ ادیبہ بن گئی۔

ایسا نہیں ہے کہ ان بیس سالوں میں اروندھتی بیٹھی رہیں بلکہ گذشتہ بیس برسوں میں ان کی نان فکشن پر کئی کتابیں سامنے آئیں، انھوں نے دستاویزی فلمیں بنائیں اور حکومتی بدعنوانی، ہندو قومیت پرستی، ماحولیاتی تباہی اور ناانصافی کے خلاف احتجاج کیا۔ انھوں نے کشمیریوں کی آزادی، ماؤنواز باغیوں اور آدیباسی قبائلیوں کے حقوق کے لیے مہم چلائی۔ ٹائم میگزین نے انھیں دنیا کے سو انتہائی بااثر شخصیات کی فہرست میں شامل کیا۔ اپنے سیاسی مداحوں کی نزدیک وہ اصولی مزاحمت کی آواز ہیں، جب کہ اپنے ناقدین کے نزدیک وہ بلوغت میں بدترین مثالیت پسندی، غیر حقیقت پسندی اور نرگسیت کی بدترین مثال ہیں۔ انھوں نے توہین عدالت و بغاوت تک کے الزامات کا سامنا کیا، قید کاٹی اور اپنی جان کے خطرے کے پیش نظر کچھ دنوں کے لیے جلاوطنی بھی برداشت کی؛ لیکن اس دوران انھوں نے ایک لفظ بھی فکشن کا نہیں لکھا۔ کیوں؟

اس ’کیوں‘ کا جواب اروندھتی رائے اپنے ایک انٹرویو میں دیتے ہوئے کہتی ہیں، ’’فکشن اپنا پورا وقت لیتا ہے۔ اسے کوئی جلدی نہیں ہوتی۔ تو میں جس رفتار سے لکھتی ہوں اس سے تیز یا آہستہ نہیں لکھ سکتی۔ یہ رسوبی چٹان کی طرح ہے جو تمام تہوں کو اکٹھا کر لیتی ہے اور یہ تہیں اس کے گرد تیرتی رہتی ہیں۔ فکشن اور نان فکشن کے درمیان وہی فرق ہے جو عارضی اور ابدی میں ہوتا ہے۔‘‘

ٹائمز آف انڈیا کی فیشن میگزین میں شائع اروندھتی رائے کے ایک انٹرویو کے دوران جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ کیا ان کا یہ ناول سوانحی ہے؟ تو انھوں نے جواب میں خود کچھ ایسے سوال کر دیے جن کے جواب آنے ابھی باقی ہیں، ’’سوانحی کسے کہا جاتا ہے؟ حقیقت کسے کہا جاتا ہے؟ کیا کوئی چیز ایسی ہے جسے آپ سوانحی تصور کرتے ہیں؟ آخر کار، آپ اپنے تخیل میں ہی اس کا تجربہ کرتے ہیں ...اور پھر کیا وہ حقیقت سے زیادہ حقیقی ہو جاتا ہے؟ اگر آپ ایسا تخیل رکھتے ہیں جو دوسروں کے دکھ اور مسرت کو محسوس کرتا ہو، تو کیا وہ سوانحی ہے؟؛ میں نہیں جانتی۔‘‘

ارجمند آرا دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ اس ناول سے پہلے آپ نے اردو کے معروف برطانوی عالم، مترجم اور استاد رالف رسل کی

خودنوشت کا ترجمہ ’’جوئندہ یابندہ‘‘ کے عنوان سے کیا تھا جو ’آج کی کتابیں‘، کراچی نے شائع کیا۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی اردو (ہند) نے ان کی دو اہم مرتب کردہ کتابیں شائع کیں، جن میں ایک کلاسیکی شاعر احسن اللہ خاں بیان کی ’’دیوان بیان‘‘ اور دوسری غالب کے شاگرد بال مکند بے صبر کی تصنیف ’’مثنوی لخت جگر‘‘ ہے۔ کلاسیکی شعری سرمائے پر مشتمل یہ دونوں کتابیں ارجمند آرا کی تحقیقی صلاحیتوں کو بھی نشان زد کرتا ہے۔ لہٰذا ارجمند آرا کا ترجمہ کسی نرے مترجم کا کارنامہ نہیں ہے۔ اس بات کو پورے اعتماد سے میں اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ اروندھتی رائے کا نیا ناول میں کافی پہلے انگریزی میں پڑھ چکا تھا، لیکن ایک دوست کے توسط سے جب اس کا اردو ترجمہ پڑھا تو نسبتاً زیادہ لطف اندوز ہوا، ظاہر ہے اسے مترجم کا کارنامہ سمجھا جانا چاہیے۔

پاکستان اس ناول کا اردو ترجمہ چھاپنے میں سبقت لے گیا، موقر جریدہ ’آج‘ نے اس ناول کو چھاپ دیا ہے۔ ہندوستانی قارئین ۲۰ اپریل کا انتظار کر رہے ہیں چونکہ معروف اشاعتی ادارہ ’راج کمل پرکاشن‘ سے اس ناول کے اردو اور ہندی ترجمے ایک ساتھ منظر عام پر آرہے ہیں۔ واضح رہے کہ ’راج کمل پرکاشن‘ جیسا بڑا اشاعتی ادارہ پہلی بار کوئی اردو کتاب شائع کر رہا ہے اور شاید یہ سلسلہ چل نکلے؛ لیکن ظاہر ہے کہ اس کا انحصار اردو ادب کے قارئین کے ذوق خرید پر ہوگا، اب اردو والے ہی اس اشاعتی ادارے کو بتائیں گے کہ اس کا فیصلہ درست ہے یا غلط۔

اگرچہ ’’بے پناہ شادمانی کی مملکت‘‘ کے دو ابواب ہندوستان سے نکلنے والے دو موقر ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں، لیکن میری درخواست پر ارجمند آرا نے ’اثبات‘ کے لیے ایک غیر مطبوعہ باب کا ایک حصہ عنایت فرمایا جس کے لیے میں ان کا شکر گذار ہوں۔ میں نے اس ناول پر جان بوجھ کر تبصرے یا ناقدانہ مضامین شامل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہندوستان میں ابھی اس کا اجرا باقی ہے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ناول کی قرأت کو متاثر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آصف فرخی اور محمد سلیم الرحمٰن کے جو مضامین شریک اشاعت ہوئے ہیں، ان کی نوعیت تاثراتی بلکہ تعارفی ہے۔ البتہ ارجمند آرا کا مضمون اس لیے اہم ہے، کیوں کہ وہ اس ناول کی مترجم ہیں۔ انھوں نے میری درخواست پر یہ مضمون لکھا ہے، چونکہ میں بحیثیت قاری اس ناول پر ان کی رائے جاننا چاہتا تھا جو حسن اتفاق سے اس کی مترجم بھی ہیں۔

بہر حال، آیئے مجلسی صنعت کاری کے اس کساد بازاری میں ہم ’کتاب کا جشن‘ مناتے ہیں اور گزرے ہوئے اس سنہرے دور کا احیا کرنے کی ایک کوشش کرتے ہیں جب ہم اپنی زبان جیتے تھے اور اس میں ادب کو زندہ و متحرک دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ لیکن یہ جشن قارئین کی شمولیت کے بغیر ادھورا بلکہ کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ لہٰذا، میری اپنے قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اس ناول کو مکمل پڑھیں اور اپنے مطالعہ کے تجربات سے ہمیں آگاہ کریں، ’اثبات‘ کے آئندہ شمارے کے صفحات آپ کی غیر رسمی اور بے لاگ رائے کے لیے حاضر ہیں۔ (مدیر)

مس جبین اول کی بے وقت موت

(’بے پناہ شادمانی کی مملکت‘ کے نویں باب سے مقتبس)

اروندھتی رائے

ترجمہ: ارجمند آرا

جن لوگوں نے موسیٰ یسوی کو اپنی بیوی اور بیٹی کو دفناتے دیکھا، انھوں نے دیکھا کہ اس دن وہ کس قدر خاموش تھا۔ اس نے غم ظاہر نہیں کیا۔ وہ اپنے آپ میں گم اور بکھرا ہوا لگ تھا، جیسے حقیقتاً وہاں موجود ہی نہ ہو۔ شاید یہی بات تھی جو آخر کار اس کی گرفتاری کا سبب بنی۔ یا ہو سکتا ہے اس کے دل کی دھڑکن اس کا سبب ہو۔ ایک بے گناہ شہری کے لیے یہ شاید حد سے زیادہ تیز یا مدھم تھی۔ بدنام چیک پوسٹوں پر فوجی بعض دفعہ نوجوان مردوں کے سینوں پر کان لگاتے اور ان کے دل کی دھڑکنیں سنتے تھے۔ افواہ تھی کہ بعض فوجی اپنے پاس اسٹیتھسکوپ بھی رکھتے ہیں۔ ’اس آدمی کا دل آزادی کے لیے دھڑک رہا ہے،‘ وہ کہتے، اور بہت تیز یا مدھم دھڑکنے والے اس دل کے میزبان بدن کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ اسے کارگو، پاپا۔ٹو، یا شیراز سنیما کی سیر پر بھیج دیا جائے — وادی کے سب سے خوف ناک تفتیشی مرکزوں میں۔

موسیٰ کو چیک پوسٹ پر گرفتار نہیں کیا گیا۔ تدفین کے بعد اس کے گھر سے اٹھایا گیا۔ یہ دن ایسے نہ تھے کہ اپنی بیوی اور بیٹی کے جنازے پر آپ کی انتہائی خاموشی کی طرف کوئی توجہ ہی نہ دی جائے۔

شروع میں، ظاہر ہے کہ ہر شخص خاموش اور سہما ہوا تھا۔ جنازے کا جلوس موت کی خاموشی اوڑھے، کیچڑ بھرے اداس شہر میں سانپ کی طرح رینگتا ہوا گزر رہا تھا۔ واحد آواز جو سنی جا سکتی تھی، بغیر موزوں والے ہزاروں جوتوں کی چپ چپ چپ تھی جو مزار شہدا کی طرف جانے والی گیلی، چاندی جیسی سڑک سے آ رہی تھی۔ نوجوانوں نے سترہ جنازے اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھے تھے۔ سترہ + ایک، جو کہ دوبارہ قتل کیے گئے عثمان عبداللہ کا جنازہ تھا، اور جو ظاہر ہے کہ دفتروں میں دوبارہ درج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ، ٹین کے سترہ + ایک

تابوت سڑکوں سے موجزن گزرے، سردیوں کے سورج کی جانب پلکیں جھپکاتے ہوئے۔ بلند و بالا کوہساروں کے حلقے سے، جو شہر کو گھیرے ہوئے تھا، اگر کوئی نیچے شہر کی جانب دیکھتا تو اسے یہ جلوس چیونٹیوں کی ایسی قطار کی مانند نظر آتا جو چینی کے سترہ + ایک دانے اٹھائے، اپنی رانی کی غذا لیے بانبی کی طرف جا رہی ہوں۔ شاید تاریخ یا انسانی تنازعات کے طالبِ علم کے نزدیک اس چھوٹے سے جلوس کا مطلب کچھ یوں ہوگا: چیونٹیوں کی ایک قطار جو کسی اونچی میز سے گرنے والے غذائی ریزوں کو لے کر بھاگ رہی ہے۔ جنگوں کی تاریخ میں یہ ایک چھوٹی سی جنگ تھی۔ اس پر کسی نے کچھ خاص توجہ نہیں دی۔ چنانچہ یہ چلتی رہی، چلتی رہی۔ چنانچہ یہ دسیوں برس پر محیط ہوتی گئی، اپنی بے لگام آغوش میں لوگوں کو سمیٹتی گئی۔ اس کی سفاکیاں اتنی ہی فطری ہوتی گئیں جتنے فطری بدلتے ہوئے موسم ہوتے ہیں۔ ہر موسم طرح طرح کی مخصوص خوشبوؤں اور پھل پھولوں کے ساتھ، زیاں اور تجدید کے، انتشار اور امن کے، شورش اور انتخابات کے اپنے اپنے دور کے ساتھ۔

سردیوں کی اس صبح چیونٹیاں چینی کے جو دانے لے کر جا رہی تھیں، ان میں سب سے چھوٹے دانے کا نام، ظاہر ہے مس جبین تھا۔

جو چیونٹیاں جلوس میں شامل ہونے سے گھبرا رہی تھیں، قطاروں میں سڑک کے کنارے، پرانی پڑ چکی مٹیالی برف کے پھسلواں کناروں پر کھڑی تھیں، اپنے اپنے فیرنوں کی حرارت کے اندر بازو سینے پر لپیٹے، فیرن کی آستینوں کو ہوا میں پھڑ پھڑاتی ہوئی۔ ایک ہتھیار بند شورش کے قلب میں بے بازو، بے ہتھیار لوگ۔ جو لوگ اتنے خوف زدہ تھے کہ گھروں سے باہر بھی نہیں نکل رہے تھے، اپنے دریچوں اور چھجوں سے جھانک رہے تھے (حالاں کہ اس کے جوکھم کو بھی وہ شدت سے محسوس کر رہے تھے)۔ ہر شخص واقف تھا کہ وہ ان فوجیوں کی بندوقوں کی نگاہوں کے گھیرے میں ہے جنھوں نے شہر بھر میں مورچے سنبھال رکھے ہیں — چھتوں پر، پلوں پر، کشتیوں پر، مسجدوں پر، پانی کی ٹنکیوں پر۔ انھوں نے ہوٹلوں پر، اسکولوں پر، دوکانوں اور بعض گھروں پر بھی قبضہ کر رکھا ہے۔

اس صبح سردی بڑی شدید تھی۔ برسوں بعد جھیل پر برف جمی تھی، اور پیش گوئی کی گئی تھی کہ مزید برف باری ہوگی۔ درختوں کی عریاں، دھبے دار شاخیں آسمان کی طرف اس طرح اٹھی تھیں جیسے ماتم دار سینہ کوبی کے عالم میں جم گئے ہوں۔

قبرستان میں سترہ + ایک قبریں تیار کی جا چکی تھیں۔ صاف ستھری، تازہ، گہری۔ ہر قبر کی مٹی کا انبار اس کے پہلو میں لگا تھا، گہرے رنگ کی چاکلیٹ کا اہرام۔ ایک جتھا وہ خون آلود آہنی اسٹریچر لے کر پہلے ہی پہنچ گیا تھا جن پر پوسٹ مارٹم کے بعد لاشیں گھر والوں کو لوٹائی گئی تھیں۔ وہ درختوں کے تنوں کے سہارے یوں کھڑے کر دیے گئے تھے جیسے کوہستانی گوشت خور درخت کے بڑے بڑے خون آشام آہنی پتے ہوں۔

جلوس جیسے ہی قبرستان کے دروازوں سے اندر داخل ہونا شروع ہوا، پریس والوں کا ایک

جمگھٹ، جو اپنے اپنے بلاک میں تیار کھڑے ایتھلیٹوں کی مانند اپنے بدن پھڑکا رہا تھا، قطاریں توڑ کر تیزی سے آگے بڑھا۔ تابوت نیچے اتارے گئے، کھولے گئے، اور برفیلی زمین پر ایک قطار میں لگا دیے گئے۔ ہجوم نے پریس والوں کے لیے بہ احترام جگہ بنا دی۔ اسے معلوم تھا کہ صحافیوں اور فوٹوگرافروں کے بغیر اس قتل عام کا نشان مٹا دیا جائے گا اور مرنے والے سچ مچ مر جائیں گے۔ چنانچہ، لاشیں ان کو پیش کر دی گئیں، توقع اور غم و غصے کے ساتھ۔ موت کی ضیافت۔ سوگوار رشتہ دار جو پیچھے ہٹ گئے تھے، انھیں فریم میں آنے کے لیے کہا گیا۔ ان کے غم کو محفوظ کرنا ضروری تھا۔ آنے والے برسوں میں جب جنگ ایک طرز زندگی بن جائے گی، کشمیر کے غم و اندوہ اور زیاں کے اس موضوع پر کتابیں اور فلمیں اور تصویری نمائشیں مرتب کی جائیں گی۔

موسیٰ ان میں سے کسی تصویر میں نہیں ہوگا۔

اس موقعے پر، مس جبین سب سے زیادہ توجہ کا مرکز تھی۔ کیمرے اس پر مرکوز ہو گئے، کسی بے چین بھالو کی طرح ٹچ ٹچ ٹچ کلک کرتے ہوئے۔ تصویروں کی اس فصل میں ایک تصویر مقامی کلاسک بن گئی۔ یہ اخباروں اور رسالوں میں، نیز حقوقِ انسانی کی ان رپورٹوں کے سرورق پر برسوں تک بار بار چھپتی رہی جنھیں کوئی نہیں پڑھتا تھا، اور جن پر اس طرح کے عنوانات ہوتے تھے: برف میں خون، اشکوں کی وادی، کیا غم و اندوہ کا کبھی خاتمہ نہیں ہوگا؟

مرکزی ملک میں، واضح اسباب سے، مس جبین کی تصویر اتنی مقبول نہیں ہوئی۔ غم و اندوہ کے بازار کی فہرستوں میں بھوپالی لڑکا، یونین کاربائیڈ گیس لیک کا شکار، اس سے بہت آگے ہی رہا۔ بہت سے مشہور فوٹوگرافر اس مرنے والے لڑکے کی تصویر کے کاپی رائٹ کے دعویدار تھے جو ملبے کی قبر میں گردن تک دبا ہوا تھا، اس کی تکتی ہوئی، دھندلی آنکھیں زہریلی گیس نے اندھی کر دی تھیں۔ اس خوفناک رات میں کیا کچھ پیش آیا تھا، اس کی کہانی وہ آنکھیں کچھ اس طرح سناتی تھیں کہ کوئی اور نہ سنا سکتا تھا۔ وہ دنیا بھر کی میگزینوں کے چمکیلے صفحوں سے تک رہی تھیں۔ آخر میں، ظاہر ہے کہ اس سب کی کوئی اہمیت نہ رہی۔ کہانی شعلے کی مانند لپکی اور بجھ گئی۔ تصویر کے کاپی رائٹ پر شروع ہونے والی جنگ البتہ برسوں تک جاری رہی، لگ بھگ اتنی ہی تندی سے جتنی تندی سے گیس لیک میں تباہی کا شکار ہونے والے ہزاروں لوگوں کے لیے ہرجانے کی جنگ لڑی گئی تھی۔

بے چین بھالو تتر بتر ہو گئے، اور مس جبین صحیح سالم، بے نُچی، گہری نیند میں سوئی ہوئی نمودار ہوئی۔ اس کا موسم گرما کا گلاب اب بھی اپنی جگہ پر موجود تھا۔

میتوں کو جیسے ہی قبروں میں اتارا جانے لگا، ہجوم نے دعائیں پڑھنی شروع کر دیں:

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ۔ وَیَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ۔
وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ۔ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ۔

اے پروردگار، میرا سینہ کھول دے۔ اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے۔ اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے، تا کہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔

کمر تک اونچے چھوٹے بچے، عورتوں کے الگ حصے میں اپنی ماؤں کے موٹے اونی لباسوں میں گھٹن کا شکار، زیادہ کچھ دیکھنے میں ناکام، بمشکل سانس لیتے ہوئے، اپنی ہی سطح کے لین دین میں مشغول تھے: تم مجھے اپنا بے کار گرینیڈ دے دو، میں تمھیں کارتوس کے چھ خول دوں گا۔

ایک تنہا عورت کی آواز عرش کی جانب چلی۔ مضطرب، بلند، خالص درد کسی سلاخ کی مانند عرش کو چیرتا چلا گیا:

روrہی ہے یہ زمیں! رو رہا ہے آسماں...

ایک اور عورت کی آواز اس میں شامل ہو گئی، اور پھر ایک اور کی:

رو رہی ہے یہ زمیں! رو رہا ہے آسماں!

کچھ دیر کے لیے پرندوں نے چہچہانا بند کر دیا، اور موتیوں جیسی آنکھوں والے پرندے انسانی نغمے کو سننے لگے۔ آوارہ کتے چیک پوسٹوں سے بغیر جانچ پڑتال کے گزر گئے، ان کے دلوں کی دھڑکنیں پتھر کی طرح ساکت تھیں۔ لائن آف کنٹرول کے دونوں طرف پرواز کرتی چیلیں اور گدھ گرم ہوا کے منطقے میں کاہلی سے چکر کاٹ رہے تھے، انسانوں کے اس چھوٹے سے دھبے کا مذاق اڑانے کو، جو نیچے جمع ہو گیا تھا۔

جب آسمان نوحہ سرائی سے معمور تھا، جیسے کوئی شے جل اٹھی؛ نوجوان لڑکے ہوا میں اچھلنے لگے، جیسے سلگتے ہوئے کوئلوں میں اچانک شعلے بھڑک اٹھے ہوں۔ اونچے، اور اونچے وہ اچھلے، جیسے ان کے پیروں کے نیچے اسپرنگ ہو، اور زمین تنی ہوئی ترپال۔ انھوں نے اپنے اندوہ کو زرہ بکتر کی مانند پہن لیا، ان کا غصہ ان کے جسموں پر بارودی پیٹی کی مانند لٹکا ہوا تھا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب وہ ناقابل شکست ہو گئے، شاید اس لیے کہ وہ اس طرح مسلح تھے، یا شاید اس لیے کہ انھوں نے موت کی زندگی کو گلے لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا، یا شاید اس لیے کہ وہ جان گئے تھے کہ وہ مر چکے ہیں۔

مزارِ شہدا کو گھیرے ہوئے فوجیوں کو واضح ہدایات تھیں کہ وہ کسی بھی صورت میں گولی نہ چلائیں۔ ان کے مخبروں کو (بھائی، عم زاد، باپ، چچا، ماموں، بھانجے، بھتیجے)، جو بھیڑ میں مل گئے تھے اور اتنے ہی جوش و خروش سے چیخ چیخ کر نعرے لگا رہے تھے جیسے بقیہ لوگ (اور شاید صداقت سے لگا رہے تھے) صاف ہدایتیں دی گئی تھیں کہ وہ ہر ایک ایسے نوجوان کی تصویر، اور اگر ممکن ہو تو ویڈیو فراہم کرائیں گے جو غصے کے طوفان پر سوار، ہوا میں اچھلا تھا اور جس نے خود کو شعلوں میں تبدیل کر لیا تھا۔

جلد ہی ان کے دروازوں پر دستک دی جائے گی، یا چیک پوائنٹ پر ایک طرف کر جایا جائے گا۔

کیا تم فلاں فلاں ہو؟ فلاں فلاں کے بیٹے؟ فلاں فلاں کام کرتے ہو؟

دھمکی اکثر و بیشتر اس سے آگے نہیں بڑھتی تھی — بس اتنی ہی ہلکی پھلکی، اتنی ہی سرسری تفتیش۔ کشمیر میں، بعض اوقات کسی کی زندگی کا ڈھرا بدلنے کے لیے اس کا بائیو ڈیٹا اس کے منہ پر مار دینا ہی کافی ہوتا تھا۔

اور بعض اوقات کافی نہیں بھی ہوتا تھا۔

وہ اپنے معمول کے وقتِ ملاقات پر موسیٰ کے لیے آئے، صبح کے چار بجے۔ وہ جاگا ہوا تھا، اپنی میز پر بیٹھا خط لکھ رہا تھا۔ اس کی ماں برابر والے کمرے میں تھیں۔ وہ ان کے رونے کی آواز سن رہا تھا، اور اپنی بہنوں اور دوسری رشتہ داروں کی آوازیں جو انھیں دلاسہ دے رہی تھیں۔ مس جبین کا پیارا ابھرواں (اور پھٹا ہوا)، سبز رنگ دریائی گھوڑا — اپنی V جیسی مسکراہٹ اور گلابی پیچ ورک کے دل کے ساتھ — اپنی مخصوص جگہ پر رکھا تھا، گاؤ تکیے کے سہارے، اپنی ننھی سی ماں اور سوتے وقت کی اس کی معمول کی کہانی کا منتظر (اَ کھ دلیلا وَن...)۔ موسیٰ نے گاڑی کی آواز سنی۔ اپنی پہلی منزل کی کھڑکی سے اس نے گاڑی کو گلی میں مڑتے اور اپنے گھر کے دروازے پر رکتے دیکھا۔ مسلح جیپ سے فوجیوں کو اترتے دیکھ کر اس نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا، نہ غصہ اور نہ ہی گھبراہٹ۔ اس کے والد، شوکت یسوی (موسیٰ اور اس کے دوستوں کے لیے گوڈزیلا) بھی بیدار تھے، اور سامنے کے کمرے میں قالین پر آلتی پالتی لگائے بیٹھے تھے۔ وہ عمارت سازی کے ٹھیکیدار تھے اور ملٹری انجینئرنگ سروسز کے ساتھ کام کرتے تھے، انھیں بلڈنگ میٹیریل سپلائی کرتے اور عمارتیں تیار کرنے کا کام کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو آرکی ٹیکچر کی تعلیم کے لیے دہلی اسی امید میں بھیجا تھا کہ وہ ان کے بزنس کی توسیع میں مدد کرے گا۔ لیکن جب 1990 میں تحریک شروع ہوئی اور گوڈزیلا فوج کے لیے ہی کام کرتے رہے تو موسیٰ نے ان سے بالکل ہی قطع تعلق کر لیا۔ بیٹا ہونے کے فرض اور اپنے خیال میں حکام کے ساتھ شراکت کے مزے لوٹنے کے احساس جرم کے درمیان پھنسے ہوئے موسیٰ کے لیے اپنے باپ کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے رہنا مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔

لگتا تھا کہ شوکت یسوی کو فوجیوں کے آنے کی توقع تھی۔ وہ ذرا بھی پریشان نہیں لگ رہے تھے۔

''امریک سنگھ نے بلایا ہے۔ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ پریشان نہ ہونا۔ صبح ہونے سے پہلے وہ تمھیں چھوڑ دیں گے۔''

موسیٰ نے جواب نہیں دیا۔ اس نے گوڈزیلا کی طرف نظر تک اٹھا کر نہ دیکھا۔ جس انداز سے اس نے اپنے کندھے اچکا رکھے تھے اور اس کی کمر جس طرح تنی ہوئی تھی، اس سے اس کی کراہت عیاں تھی۔ وہ دو مسلح فوجیوں سے گھرا صدر دروازے سے باہر نکلا اور جا کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اسے ہتھکڑی نہیں لگائی گئی، نہ سر پر غلاف منڈھا گیا۔ جپسی چکنی، برفیلی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ برف باری پھر سے شروع ہو چکی تھی۔

شیراز سنیما بہت سی بیرکوں اور افسروں کے کوارٹروں کے مرکز میں تھا، جنون خوف کے پیچیدہ پھندوں میں محصور — چاروں طرف لچھے دار کٹیلے تاروں کے دو حصار ایک اتھلی، ریتیلی خندق کے گرد ڈالے گئے تھے؛ چوتھا اور سب سے اندر کا حصار ایک بلند چہار دیواری کا تھا جس کے اوپر کانچ کے ٹوٹے ٹکڑے کنگوروں کی طرح لگائے گئے تھے۔ ٹین کی چادروں کے پھاٹک کے دونوں طرف واچ ٹاور تھے جن میں

فوجی مشین گنیں لیے کھڑے تھے۔ موسیٰ کو لے کر جپسی سبھی چیک پوسٹوں سے تیزی سے گزرتی گئی۔ ظاہر ہے کہ ان کی آمد متوقع تھی۔ کمپاؤنڈ سے گزر کر وہ براہِ راست صدر دروازے پر جا پہنچی۔

سنیما کی لابی میں تیز روشنیاں تھیں۔ پلاسٹر آف پیرس سے بنی ہوئی سفید آرائشی چھت کی نفیری نما جھالر پر ننھے ننھے شیشوں کا پچی کاری کا کام تھا، جو یوں لگ رہا تھا جیسے شادی کا بہت بڑا کیک اوندھا رکھا ہو اور یہ جھالر اس کی آئسنگ ہو۔ جھلملاتے ہوئے سستے قسم کے فانوسوں کی روشنی اس سے مزید بڑھ گئی تھی۔ سرخ قالین گھسا ہوا اور بوسیدہ تھا، اور سوراخوں میں سے سیمنٹ کا فرش نظر آ رہا تھا۔ گردش کرتی باسی ہوا میں بارود، ڈیزل اور پرانے کپڑوں کی بدبو تھی۔ کسی زمانے میں سنیما ہال کا ایک سنیک بار ہوتا تھا، وہ اب ٹارچر کرنے والوں اور ٹارچر ہونے والوں کے استقبال اور اندراج کا کاؤنٹر تھا۔ اس پر ابھی تک ان چیزوں کے اشتہار لگے تھے جو اَب اسٹاک میں نہ تھیں — کیڈبری فروٹ اینڈ نٹ چاکلیٹ، کئی ذائقوں کی کوالٹی آئس کریمیں، چوکو بار، اورنج بار، مینگو بار۔ پرانی فلموں کے رنگ اڑے پوسٹر (چاندنی، میں نے پیار کیا، پرندہ اور مختار عمر کی لوئن آف دی ڈیزرٹ)، اس زمانے کی یادگار فلمیں جب اللہ ٹائیگرس نے فلموں پر پابندی نہیں لگائی تھی اور سنیما ہال بند نہیں کرائے تھے، اب بھی دیواروں پر لگے تھے۔ ان میں سے بعض پر پان کی لال پچکاریاں تھیں۔ بندھے ہوئے، ہتھکڑی لگے لڑکے قطاروں میں فرش پر مرغوں کی طرح بیٹھے تھے۔ ان میں سے بعض کو اس بری طرح زدوکوب کیا گیا تھا کہ لڑھک گئے تھے، بمشکل زندہ تھے لیکن اب بھی گڑمڑی بنے، بیٹھے ہوئے لگ رہے تھے، کیوں کہ ان کی کلائیاں ان کی پنڈلیوں سے بندھی ہوئی تھیں۔ فوجی دندناتے پھر رہے تھے، قیدیوں کو اندر لاتے تھے، دوسرے قیدیوں کو پوچھ تاچھ کے لیے لے جاتے تھے۔ دھیمی آوازیں، جو آڈیٹوریم کے بڑے بڑے چوبی دروازوں کے پیچھے سے آ رہی تھیں، شاید کسی پُرتشدد فلم کے گنگ کر دیے گئے ساؤنڈ ٹریک کی ہوں گی۔ سیمنٹ کے کنگارو اپنی بے کیف مسکراہٹ اور اپنی تھیلیوں کے کوڑے دانوں کے ساتھ، جن پر 'یوز می' لکھا تھا، اِس کنگارو کورٹ پر نگراں تھے۔

موسیٰ اور اس کے محافظوں کو استقبال یا اندراج کی رسمی کارروائی کے لیے نہیں روکا گیا۔ زنجیروں میں بندھے، مار کھائے لوگوں کی تعاقب کرتی نظروں کے سامنے سے وہ شاہانہ شان سے سیدھے کشادہ، چکردار زینے کی طرف بڑھ گئے جو بالکنی کی سیٹوں — کوینز سرکل، Queen's Circle — کی سمت جاتا تھا، اور پھر وہاں سے ایک اور تنگ زینے کی طرف جو پروجیکشن روم تک پہنچتا تھا اور جسے توسیع دے کر آفس میں بدل دیا گیا تھا۔ موسیٰ کو احساس تھا کہ اس ڈرامے کا یوں اسٹیج کیا جانا بھی سوچا سمجھا فیصلہ ہوگا، معصومانہ نہیں۔

میجر امریک سنگھ ایک میز کے پیچھے سے موسیٰ کے استقبال کو اٹھا، جس پر اس کے جمع شدہ نادر قسم کے پیپر ویٹ بکھرے ہوئے تھے — کانٹوں والے چتی دار بحری گھونگھے، پیتل کی مورتیاں، بحری جہاز اور کانچ کے گولوں میں بند بیلے کرتی رقاصائیں۔ وہ سانولے رنگ کا، بے حد دراز قد آدمی تھا — کوئی چھ فٹ، دو انچ کا — عمر پینتیس کے آس پاس۔ اس رات اس کا منتخبہ اوتار ایک سکھ کا تھا۔ داڑھی کے خط کے اوپر اس کے رخساروں کی جلد پر بڑے بڑے ابھرواں نشان تھے، بالوشاہی کی سطح کی مانند اُپاڑ دار۔ اس کی گہری سبز پگڑی

نے، جو اس کے کانوں کے گرد اور پیشانی پر کسی ہوئی تھی، اس کی آنکھوں کے گوشوں کو کھینچ دیا تھا اور ابروؤں کو اوپر کی جانب اٹھا دیا تھا، جس سے وہ نیند کے خمار میں لگتا تھا۔ جو لوگ اس سے ذرا بھی واقف تھے، یہ جانتے تھے کہ اسے نیند کے خمار میں سمجھنا ایک خطرناک غلطی ہوگی۔ وہ میز کے گرد گھوم کر سامنے آیا اور اشتیاق کے ساتھ موسیٰ کا استقبال کیا، تشویش اور محبت کے ساتھ۔ جو فوجی موسیٰ کو لے کر آئے تھے، انھیں واپس جانے کا حکم دیا گیا۔

''السلام علیکم حضور... براے مہربانی تشریف رکھیں۔ آپ کیا لیں گے؟ چائے یا کافی؟'

اس کا لہجہ کچھ سوال اور کچھ حکم کے بین بین تھا۔

''کچھ نہیں۔ شکریہ۔''

موسیٰ بیٹھ گیا۔ امریک سنگھ نے سرخ انٹرکام کا رسیور اٹھایا اور چائے کے ساتھ افسروں والے بسکٹ لانے کا حکم دیا۔ اس کے لحیم شحیم وجود کے سامنے یہ میز کافی چھوٹی اور غیر متناسب لگ رہی تھی۔

یہ ان کی پہلی ملاقات نہیں تھی۔ موسیٰ پہلے بھی کئی بار اس سے مل چکا تھا، کہیں اور نہیں، بلکہ اپنے ہی گھر میں، جہاں امریک سنگھ گوڈزیلا سے ملنے چلا آتا تھا، جسے اس نے اپنی دوستی کا تحفہ عطا کرنے کا فیصلہ کیا تھا— ایک ایسی پیش کش جسے ٹھکرانے کی آزادی گوڈزیلا کو نہیں تھی۔ امریک سنگھ کے دو تین بار آنے کے بعد موسیٰ کو اپنے گھر کے ماحول میں زبردست تبدیلی کا احساس ہوا۔ یہ زیادہ پرسکون ہوگیا۔ تلخ سیاسی بحثیں جو موسیٰ اور اس کے باپ کے درمیان ہوتی تھیں، ختم ہوگئیں۔ لیکن موسیٰ نے محسوس کرلیا کہ گوڈزیلا کی اچانک مشکوک ہو چکی آنکھیں اسے مسلسل گھیرے رہتی ہیں، جیسے اس کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہی ہوں، اسے تولنے کی، اس کی گہرائی ناپنے کی۔ ایک سہ پہر کو، اپنے کمرے سے اتر کر آتے ہوئے، سیڑھیوں پر موسیٰ کا پیر پھسلا، پھسلنے کے عین درمیان میں اس نے خود کو سنبھالا اور زمین پر پیروں کے بل آ کھڑا ہوا۔ گوڈزیلا نے، جو اس مظاہرے کو دیکھ رہے تھے، موسیٰ کو ٹوکا۔ انھوں نے اپنی آواز اونچی نہیں کی لیکن وہ غصے میں تھے اور موسیٰ ان کی کنپٹیوں پر تنی ہوئی رگوں کی دھڑکن کو محسوس کر سکتا تھا۔

''اس طرح سے گرنا تم نے کب سیکھا؟ کس نے تمھیں اس طرح گرنا سکھایا؟''

انھوں نے ایک کشمیری باپ کی پینی فطری تشویش کے ساتھ اپنے بیٹے کا جائزہ لیا۔ انھوں نے اس میں غیر معمولی چیزوں کو تلاش کرنا چاہا— ٹریگر والی انگلی پر کوئی گٹا، نکیلے، سخت جلد والے گھٹنے اور کہنیاں، یا 'ٹریننگ' کا کوئی اور نشان جو اس نے مجاہدین کے کیمپوں میں پائی ہو۔ انھیں کوئی سراغ نہ ملا۔ انھوں نے موسیٰ سے امریک سنگھ کی دی ہوئی تشویش ناک خبروں کے بارے میں پوچھنے کا فیصلہ کیا— 'لوہے' سے بھرے ان بکسوں کے بارے میں جو گاندربل میں ان کے خاندانی باغیچوں میں لائے، لے جائے گئے تھے۔ پہاڑوں کے ان سفروں کے بارے میں جو موسیٰ نے کیے تھے، خاص 'دوستوں' سے اس کی ملاقاتوں کے بارے میں۔

''تمھیں ان سب کے بارے میں کیا کہنا ہے؟''

''اپنے دوست میجر صاحب سے ہی پوچھیے۔ وہ آپ کو بتائیں گے کہ نان ایکشن ایبل، ناکارہ

انٹیلی جنس ایسی ہی ہے جیسے کوڑے کا ڈھیر۔'' موسیٰ نے جواب دیا۔

''ژے چھوٗے مرنوے، اسہِ سارنی تہِ مارناوَ کھ،'' گوڈزیلا نے کہا۔

تمھیں تو مرنا ہی ہے لیکن اپنے ساتھ ہم سب کو بھی مرواؤ گے۔

اگلی مرتبہ جب امریک سنگھ آیا تو گوڈزیلا [موسیٰ کے والد] نے زور دیا کہ موسیٰ بھی موجود رہے۔ اس موقعے پر وہ پلاسٹک کے پھولدار دسترخوان کے گرد آلتی پالتی لگا کر بیٹھے، جب کہ موسیٰ کی ماں نے انھیں چائے پیش کی۔ (موسیٰ نے عارفہ سے کہا تھا کہ جب تک ملاقاتی رخصت نہ ہو جائے وہ اور مس جبین نیچے نہ آئیں۔) امریک سنگھ گرم جوشی اور برادرانہ رفاقت میں بھیگا جا رہا تھا۔ اپنی کمر گاؤ تکیے پر ٹکائے وہ پھیل کر بے تکلفی سے بیٹھ گیا۔ اس نے چند احمقانہ، گندے سکھ لطیفے سنتا سنگھ اور بنتا سنگھ کے بارے میں سنائے، اور دوسروں سے زیادہ زور زور سے ان پر خود ہی ہنستا رہا۔ اور پھر کچھ یوں ظاہر کرتے ہوئے کہ اس کی بیلٹ حسبِ خواہش کھانے سے اسے روک رہی ہے، اس نے اپنی بیلٹ کھولی، جس کے ہولسٹر میں پستول لگے رہنے دیا۔ اگر اس کی منشا یہ اشارہ کرنے کی تھی کہ وہ اپنے میزبانوں پر بھروسا کرتا ہے اور ان کے ساتھ آرام سے ہے، تو اس کا اثر الٹا ہوا۔ جالب قادری کا قتل ہونا ابھی باقی تھا، لیکن مسلسل ہونے والی قتل اور اغوا کی دیگر وارداتوں کے متعلق ہر کوئی جانتا تھا۔ تکلیف دہ پستول کیک اور نمکین کی پلیٹوں، اور نون چائے کے تھرمس فلاسکوں کے درمیان پڑا رہا۔ امریک سنگھ آخرکار، ڈکاروں کے درمیان تعریفیں کرتا ہوا، جانے کے لیے اٹھا تو وہ پستول کو اٹھانا بھول گیا، یا ایسا ظاہر کیا کہ بھول گیا ہے۔ گوڈزیلا نے اٹھایا اور اس کے حوالے کر دیا۔

بیلٹ پھر سے باندھتے ہوئے امریک سنگھ براہ راست موسیٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنسا۔

''بڑا اچھا ہوا جو تمھارے ابا نے یاد رکھا۔ سوچو کہ کورڈن اینڈ سرچ کے دوران اگر یہ یہاں مل جاتا تو کیا ہوتا۔ مجھے تو چھوڑو، خدا بھی تمھاری مدد نہیں کر سکتا تھا۔ ذرا تصور کرو۔''

ہر کوئی فرماں برداری سے ہنسا۔ موسیٰ نے دیکھا کہ امریک سنگھ کی آنکھوں میں ہنسی کا شائبہ تک نہ تھا۔ لگتا تھا کہ یہ آنکھیں روشنی جذب تو کرتی ہیں لیکن منعکس نہیں کرتیں۔ وہ غیر شفاف، اتھلی، سیاہ ٹکیاں تھیں جن میں چمک یا تابانی نام کو بھی نہ تھی۔

وہی غیر شفاف آنکھیں اس وقت شیراز کے پروجیکشن روم میں، پیپر ویٹوں سے بھری میز کے دوسری طرف سے موسیٰ کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ یہ ایک غیر معمولی منظر تھا— میز پر بیٹھا ہوا امریک سنگھ۔ یہ واضح تھا کہ اسے ذرا بھی اندازہ نہیں کہ اس میز کو شوپیسوں کی کافی ٹیبل بنانے کے علاوہ اور کیا کرے۔ یہ اس طرح لگائی گئی تھی کہ وہ اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے پیچھے گھوم کر دیوار میں بنی چھوٹی سی مستطیل کھڑکی سے، جو کبھی پروجیکشن والے کی کھڑکی تھی لیکن اب جاسوسی کا سوراخ— مرکزی ہال کی سرگرمیوں پر نظر رکھ سکے۔ تفتیش کی کوٹھریوں تک پہنچنے کا راستہ وہیں سے تھا، ان دروازوں سے جن کے سرخ، نیون سے چمکتے ہوئے سائنوں پر لکھا تھا: باہر، EXIT (اور بعض اوقات ان کی مراد بھی یہی ہوتی تھی)۔ اسکرین پر اب بھی پرانے فیشن کا مخملی

گچھوں والا سرخ پردہ پڑا ہوا تھا—ویسا ہی جو پرانے زمانے میں پاپڈ میوزک، مثلاً 'پوپ کورن' اور 'بے بی ایلیفنٹ واک' کی دھن بجاتے وقت اٹھتا تھا۔ اسٹال والی سستی کرسیاں ہٹا کر ایک گوشے میں ڈھیر کر دی گئی تھیں، اور خالی جگہ میں انڈور بیڈمنٹن کورٹ بنا دیا گیا تھا جہاں تناؤ کا شکار فوجی اپنی جھنجلاہٹ نکال سکتے تھے۔ اس وقت بھی ریکٹ پر شٹل کاک کے ٹکرانے کی دھیمی آوازیں امریک سنگھ کے کمرے تک آ رہی تھیں۔

''میں نے تمھیں یہاں اس لیے بلوایا ہے تاکہ معافی مانگ سکوں اور جو کچھ ہوا ہے اس پر ذاتی طور پر اپنا گہرا دکھ جتا سکوں۔''

کشمیر میں زنگ کا زہر اتنا گہرا بیٹھ چکا تھا کہ امریک سنگھ کو واقعی احساس نہ تھا کہ ایک ایسے شخص کو، جس کی بیوی اور بیٹی کو حال ہی میں گولی ماری گئی ہے، اس طرح مسلح گارڈوں کی معیت میں صبح کے چار بجے جبراً اٹھا کر ایک تفتیشی مرکز میں لانا، اور وہ بھی صرف تعزیت پیش کرنے کے لیے، کس قدر ستم ظریفی کی بات ہے۔

موسیٰ کو معلوم تھا کہ امریک سنگھ گرگٹ ہے، اور یہ کہ اپنی پگڑی کے نیچے وہ صرف 'مونا' ہے—اس کے سکھ کیش لمبے نہیں۔ سکھ مت کے خلاف، بال کٹوانے کا یہ انتہائی بدعت کا فعل اس نے بہت عرصہ پہلے انجام دیا تھا۔ موسیٰ نے اسے گوڈزیلا سے فخریہ کہتے سنا تھا کہ ایک شورش مخالف مہم کے دوران وہ کس طرح ضرورت کے مطابق خود کو ہندو، سکھ یا پنجابی بولنے والا پاکستانی مسلمان بنا کر پیش کرتا تھا۔ وہ یہ بتاتے ہوئے زور زور سے ہنس رہا تھا کہ کس طرح 'ہمدردوں' کو شناخت کرنے اور انھیں پکڑنے کے لیے وہ اور اس کے ساتھی شلوار قمیص پہن کر— 'خان سوٹ' میں—رات کے اندھیرے میں گاؤں والوں کے دروازوں پر دستکیں دیتے اور خود کو پاکستانی مجاہد ظاہر کر کے آسرا مانگتے تھے۔ اگر ان کا استقبال کیا جاتا تو دوسرے دن کس طرح انھیں اوورگراؤنڈ ورکرز (overground workers) کہہ کر گرفتار کر لیا جاتا تھا۔

''نہتے گاؤں والے آخر کس طرح ایسے گروہ کو منع کر سکتے تھے جن کے پاس ہتھیار ہوں اور آدھی رات کو وہ ان کے دروازوں پر دستک دیں تو وہ مجاہد ہیں یا ملٹری کے لوگ، اس سے کیا فرق پڑتا؟'' موسیٰ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''ارے، ان کے استقبال میں چھپی گرمی کو جانچنے کے ہمارے اپنے طریقے ہیں،'' امریک سنگھ نے کہا تھا۔ ''ہمارے اپنے تھرمامیٹر ہیں۔''

ہوسکتا ہے۔ لیکن تمھیں کشمیری منافقت کی گہرائی کا اندازہ نہیں، موسیٰ نے اپنے دل میں سوچا لیکن کہا نہیں۔ تمھیں بالکل اندازہ نہیں کہ ہم جیسی قوم، جو ہم جیسے تاریخی اور جغرافیائی حالات میں زندہ بچ گئی ہو، اپنے غرور کو چھپانا سیکھ گئی ہے۔ دوغلاپن ہمارا واحد ہتھیار رہ ہے۔ تم نہیں جانتے کہ جب ہمارے دل ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں تب بھی ہم کس قدر آب و تاب سے مسکراتے ہیں۔ جن سے ہم محبت کرتے ہیں ان پر کتنا غصہ نکال سکتے ہیں، اور جن سے نفرت کرتے ہیں ان کو کتنی فراخ دلی سے گلے لگاتے ہیں۔ تمھیں کچھ اندازہ نہیں کہ ہم تمھارا استقبال کتنی گرم جوشی سے کرتے ہیں لیکن درحقیقت ہم سب یہ چاہتے ہیں کہ تم چلے جاؤ۔ یہاں تمھارا تھرمامیٹر خاصا ناکارہ ہے۔

لیکن دیکھنے کا یہ ایک نظریہ تھا۔ دوسری جانب، اس مخصوص لمحے میں، ہوسکتا ہے کہ موسیٰ ہی نادان ہو۔ کیوں کہ امریک سنگھ نے اس خوف ناک 'سرزمین جنگ' (dystopia) کی بخوبی پیمائش کر رکھی تھی جس میں وہ سرگرمِ عمل تھا—ایسی سرزمین جس کے باشندوں کے لیے سرحدیں نہ تھیں، وفاداریاں نہ تھیں، اور اس پاتال کی کوئی انتہا نہ تھی جس میں وہ گر رہی تھی۔ جہاں تک کشمیری ذہنیت کا تعلق ہے، اگر کوئی ایسی چیز ہے تو، امریک سنگھ نہ تو اس کی تفہیم کا متلاشی تھا اور نہ بصیرت کا۔ اس کے نزدیک یہ ایک کھیل تھا، ایک شکار، جس میں اس کے صید کی ذہانت خود صیاد کی ذہانت کے مقابل نبرد آزما تھی۔ وہ خود کو سپاہی نہیں، کھلاڑی سمجھتا تھا، جس نے اسے بشاش دل بنا دیا تھا۔ میجر امریک سنگھ ایک جواری تھا، خطروں کا کھلاڑی افسر، خوف ناک تفتیش کار، اور بشاش، سفاک قاتل۔ اسے اپنے کام میں بڑا مزہ آتا تھا، اور مسلسل ایسے طریقے ڈھونڈتا رہتا تھا جن سے اپنی تفریح کو دوبالا کر سکے۔ وہ چند مخصوص مجاہدین کے رابطے میں تھا، جو بعض دفعہ اس کی وائرلیس فریکونسی سے منسلک ہو جاتے، یا وہ ان کی فریکونسی سے، اور پھر وہ ایک دوسرے پر اسکولی لڑکوں کی طرح طنز کستے۔ ''ارے یار، میری حیثیت ایک معمولی ٹریول ایجنٹ سے زیادہ کیا ہے؟'' ان سے یہ کہنا اسے اچھا لگتا تھا۔ ''تم جہادیوں کے لیے کشمیر تو بس ایک پڑاؤ ہے۔ ہے نا؟ تمھاری اصل منزل تو جنت ہے جہاں تمھاری حوریں تمھارا انتظار کر رہی ہیں۔ میں یہاں تمھارے سفر کو آسان بنانے کے لیے ہی تو ہوں۔'' وہ خود کو 'جنت ایکسپریس' کہتا تھا۔ اور اگر وہ انگریزی میں بات کر رہا ہو (جس کا مطلب تھا کہ وہ نشے میں ہے)، تو پھر اس کا ترجمہ کر کے 'پیراڈائز ایکسپریس' کہا کرتا تھا۔

اس کا ایک معروف داستانوی جملہ یہ تھا: دیکھو میاں، میں بھارت سرکار کا لنڈ ہوں، اور میرا کام ہے چودنا۔

کہتے ہیں کہ تفریح کی اپنی بے لگام جستجو میں ایک بار اس نے ایک ایسے مجاہد کو چھوڑ دیا تھا جسے اس نے بڑی دقتوں کے بعد ڈھونڈا اور پکڑا تھا۔ صرف اس وجہ سے چھوڑا تھا کہ اسے دوبارہ پکڑنے کے ہیجان کو ایک بار پھر محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اپنی اسی فطرت کے عین مطابق تھا اس کے ذاتی رہنمائے شکار رسالے کا مفسدانہ متن، جس پر عمل کرتے ہوئے اس نے اظہار معذرت کے لیے موسیٰ کو شیراز بلوایا تھا۔ چند مہینوں پہلے امریک سنگھ نے موسیٰ کو، شاید درست ہی، ایک امکانی سطح پر اہم دشمن کے طور پر شناخت کیا تھا، ایک ایسا شخص جو اس کا قطعی متضاد تھا، اور پھر بھی اس میں وہ ہمت اور دانش تھی کہ جوکھم لے سکے اور شاید شکار کی نوعیت کو اس قدر بدل ڈالے کہ طے کرنا مشکل ہو جائے کہ صید کون ہے اور صیاد کون۔ یہی سبب تھا کہ جب امریک سنگھ کو موسیٰ کی بیوی اور بیٹی کی موت کا پتہ چلا تو اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ موسیٰ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس معاملے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ کہ یہ ایک غیر متوقع، اور اس کی رائے میں یہ موسیٰ کے ساتھ ناروا زیادتی ہے، امریک سنگھ کے منصوبے کا حصہ ہرگز نہیں۔ شکار کا کھیل جاری رہے، اس کے لیے اس نے اپنے شکار پر یہ معاملہ واضح کرنا ضروری سمجھا تھا۔

شکار کرنا امریک سنگھ کا واحد جنون نہیں تھا۔ اس کے شوق مہنگے تھے، اور طرز زندگی ایسا جو وہ اپنی تنخواہ

سے نہیں گزار سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے دوسرے کاروباری امکانات کا پورا فائدہ اٹھایا تھا، جو ایک عسکری قبضے کے تحت فاتحین کے خیمے میں ہونے کے سبب اسے فراہم تھے۔ اغوا اور جبری وصولی کے کاروبار کے علاوہ وہ پہاڑوں پر خراد کے ایک کارخانے اور وادی میں فرنیچر کے بزنس (بیوی کے نام پر) کا بھی مالک تھا۔ وہ جتنا بے رحم تھا، اتنا ہی فراخ دل بھی تھا، اور چوبی نقاشی کی کافی ٹیبلز اور اخروٹ کی لکڑی کی کرسیوں جیسے مہنگے تحفے ان لوگوں کو دیتا رہتا تھا جنھیں وہ پسند کرتا، یا جن کی اسے ضرورت ہوتی تھی۔ (گوڈزیلا کو دو سائڈ ٹیبلز اسی طرح زبردستی ملی تھیں۔) امریک سنگھ کی بیوی لولین کور پانچ بہنوں میں چوتھی تھی — تولین، ہرپریت، گرپریت، لولین اور ڈمپل — اپنے حسن کے لیے مشہور، اور دو چھوٹے بھائی۔ ان کا تعلق سکھوں کے اس اقلیتی فرقے سے تھا جو صدیوں پہلے وادی میں آبسا تھا۔ اس کے والد معمولی کسان تھے جن کے پاس اپنے بڑے سے خاندان کی کفالت کے ذرائع معمولی تھے، یا تقریباً صفر کے برابر تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اتنے غریب تھے کہ ایک بار اسکول جاتے ہوئے جب ایک لڑکی کا پاؤں پھسل گیا اور اس کے ہاتھ میں سے ٹفن کیریر گر پڑا، جس میں ان کا لنچ ہوتا تھا، تو بھوکی بہنوں نے گرے ہوئے کھانے کو سڑک پر سے ہی اٹھا کر کھالیا تھا۔ جب لڑکیاں بڑی ہوئیں تو ہر قسم کے مردان کے گرد بھڑوں کی مانند منڈلانے لگے، طرح طرح کی پیشکشیں لیے ہوئے، جن میں شادی کی پیشکش کسی کی بھی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ ان کے والدین اپنی ایک بیٹی کی شادی (جہیز کے بغیر) میدانی علاقے کے ایک سکھ، اور وہ بھی آرمی افسر سے کر کے پھولے نہیں سمائے تھے۔ شادی کے بعد، سری نگر اور آس پاس کے مختلف کیمپوں میں امریک سنگھ کے تبادلوں کے دوران، لولین آفیسرز کوارٹرس میں کبھی منتقل نہیں ہوئی۔ کیوں کہ سنتے ہیں (افواہ تھی) کہ کام پر اس کے ساتھ ایک اور عورت تھی، ایک اور 'بیوی'، سینٹرل ریزرو پولس کی ایک رفیق کار، اے سی پی پنکی، جو فیلڈ آپریشنز پر عموماً اس کے ساتھ ہوتی تھی اور کیمپوں میں تفتیش کے اجلاسوں میں بھی۔ ہفتہ واری تعطیل میں جب امریک سنگھ اپنی بیوی اور گود کے بیٹے سے ملنے کے لیے جواہر نگر میں واقع اپنے پہلی منزل کے فلیٹ پر آتا تھا، جو سری نگر میں سکھوں کی ایک چھوٹی سی کالونی تھا، تو گھریلو تشدد اور مدد کے لیے اس کی بیوی کی گھٹی گھٹی چیخوں کے بارے میں اس کے پڑوسی آپس میں کانا پھوسی کرتے تھے۔ لیکن کسی نے کبھی دخل دینے کی ہمت نہیں کی تھی۔

امریک سنگھ حالاں کہ مجاہدین کا شکار اور خاتمہ بڑی بے رحمی سے کرتا تھا، لیکن اصل میں وہ ان کا احترام کرتا تھا — یا کم از کم ان میں سے بہترین لوگوں کا — ایک طرح سے کینہ بھری تحسین کے جذبے کے ساتھ۔ لوگ جانتے تھے کہ وہ بعض مجاہدین کی قبروں پر اظہار عقیدت کے لیے بھی گیا تھا، جب کہ ان میں سے بعض کو اس نے خود مارا تھا۔ (ایک کو بندوق سے غیر سرکاری سلامی تک ملی تھی۔) ایسے لوگ جن کی وہ ذرا بھی عزت نہیں کرتا تھا، بلکہ دراصل نفرت کرتا تھا، حقوق انسانی کے کارکنان تھے — زیادہ تر وکیل، صحافی اور اخباروں کے مدیر۔ اس کے نزدیک وہ ایسے موذی درندے تھے جو اپنی مسلسل شکایتوں اور فریادوں سے اس کے شاندار کھیل کے اصولوں کو خراب اور مسخ کرتے رہتے تھے۔ امریک سنگھ کو جب بھی ان میں سے کسی کو اٹھانے اور 'بے اثر' کرنے کی اجازت دے دی جاتی ('یہ اجازتیں' کبھی انھیں مارنے کے احکامات کی صورت

میں نہیں ملتی تھیں، بلکہ عموماً نہ مارنے کے حکم کے فقدان کی صورت میں) تو وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں بڑی مستعدی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ جالب قادری کا معاملہ الگ تھا۔ حکم صرف اتنا دیا گیا تھا کہ ڈرا دھمکا کر اسے بند کر دو۔ لیکن معاملہ الٹ گیا۔ جالب قادری نے نڈر ہونے کی غلطی کی۔ پلٹ کر جواب دینے کی غلطی۔ امریک سنگھ بعد میں اس پر پچھتایا تھا کہ اس نے خود پر سے قابو کھو دیا اور اس پر اور زیادہ پچھتایا تھا کہ اس کے نتیجے میں اسے اپنے ایک دوست اور شریک کار، اخوان والے سلیم گوجری کا صفایا کرنا پڑا۔ انھوں نے، یعنی اس نے اور سلیم گوجری نے، ایک دوسرے کے ساتھ اچھا وقت گزارا تھا، اور بہت سی مہموں میں ساتھ ساتھ کام کیا تھا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ اگر سلیم اس کی جگہ ہوتا تو وہ بھی اس کے ساتھ بالکل یہی سلوک کرتا۔ اور امریک سنگھ یقیناً اس صورتِ حال کو بخوبی سمجھ پاتا۔ یا اس نے خود کو یہی سمجھا لیا تھا۔ اس نے اب تک جو کچھ کیا تھا اس میں سلیم گوجری کا قتل ایسا تھا جس نے اس کے دل کو جھٹکا دیا تھا۔ سلیم گوجری دنیا کا واحد شخص تھا جس کے تئیں وہ، اپنی بیوی لولین سمیت، کوئی ایسا جذبہ رکھتا تھا جو مبہم طور پر محبت سے شباہت رکھتا تھا۔ اسی جذبے کے اعتراف میں، جب وقت آیا تو اس نے اپنے دوست کو خود ہی گولی ماردی۔

البتہ وہ ایسا نہیں تھا کہ غم کو دل سے لگا کر بیٹھ جائے، اس لیے ایسی کیفیتوں سے جلد ہی نکل آتا تھا۔ موسیٰ کے سامنے، میز کے دوسری جانب بیٹھا ہوا میجر معمول کے مطابق اپنے آپے میں تھا، گھمنڈ اور خود اعتمادی سے بھرا ہوا۔ اسے فیلڈ سے ہٹا کر ڈیسک جاب دے دیا گیا تھا، بے شک، لیکن حالات اس کے حق ابھی بگڑنا شروع نہیں ہوئے تھے۔ وہ اب بھی بعض اوقات فیلڈ میں جاتا تھا، ایسے آپریشنوں پر جو کسی خاص جنگجو یا اوور گراؤنڈ ورکر کے معاملات سے متعلق ہوں۔ وہ معقول حد تک مطمئن تھا کہ نقصان کو اس نے قابو میں کر لیا ہے اور اب خطرے سے باہر ہے۔

'افسروں والے بسکٹ' اور چائے آ گئی۔ بسکٹ لانے والے کے نمودار ہونے سے پہلے موسیٰ نے اپنی پشت کی جانب دھات کی ٹرے پر پیالیوں کے کھڑکھڑانے کی مدھم آواز سنی تھی۔ بیرے اور موسیٰ نے ایک دوسرے کو فوراً پہچان لیا، لیکن ان کے تاثرات بے نیازی کے اور دھندلے رہے۔ امریک سنگھ دونوں کو غور سے دیکھتا رہا۔ کمرے میں اچانک حبس بڑھ گیا۔ سانس لینا ناممکن ہو گیا، بس ایک ڈھونگ ہی رہ گیا۔

جنید احمد شاہ، حزب المجاہدین کا ایریا کمانڈر تھا، جو چند مہینے پہلے اس وقت پکڑا گیا تھا جب اس نے بہت عمومی لیکن مہلک غلطی کی تھی اور آدھی رات کو اپنی بیوی اور گود کے بیٹے سے ملنے سوپور میں اپنے گھر چلا گیا تھا جہاں فوجی اس کے منتظر تھے۔ وہ ایک دراز قد، پھرتیلا آدمی تھا جو اپنی خوب صورتی کے لیے، نیز اپنی بہادری کے حقیقی اور مشکوک، دونوں طرح کے کارناموں کی وجہ سے مشہور تھا اور لوگ اس سے محبت کرتے تھے۔ کسی زمانے میں اس کے کندھوں تک لمبے بال اور گھنی، سیاہ داڑھی ہوتی تھی۔ اس وقت وہ کلین شیو تھا، سر کے بال نہایت چھوٹے تھے، فوجی کٹ۔ اس کی بے چمک، دھنسی ہوئی آنکھیں اپنے گہرے، سلیٹی حلقوں میں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ٹریک سوٹ کے ایک بوسیدہ پائجامے میں تھا جو اس کی پنڈلیوں کو صرف آدھا ہی ڈھک رہا تھا۔ وہ اونی موزے، آرمی کے جاری کردہ پی ٹی شوز، کیڑوں کی کھائی ہوئی سرخ رنگ کی سنہری

بٹن لگی ویٹروں والی جیکٹ پہنے تھا جو نہایت چھوٹی تھی اور اس میں وہ مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر طاری لرزے کے سبب ٹرے میں رکھی ہوئی کراکری رقص کر رہی تھی۔

''ٹھیک ہے، اب دفع ہو جاؤ۔ یہاں کیوں منڈلا رہے ہو؟'' امریک سنگھ نے جنید سے کہا۔

''جی جناب! جے ہند!''

جنید نے سلامی دی اور کمرے سے چلا گیا۔ امریک سنگھ موسیٰ کی طرف پلٹا، ہمدردی کی تصویر بنا ہوا۔

''تمھارے ساتھ جو کچھ ہوا، ایسا دنیا میں کسی انسان کے ساتھ نہ ہو۔ تم گہرے صدمے میں ہو گے۔ یہ لو، کریک جیک لو۔ تمھارے لیے بہت اچھے ہیں۔ ففٹی ففٹی۔ ففٹی پرسینٹ سگر، ففٹی پرسینٹ سالٹ۔''

موسیٰ نے جواب نہیں دیا۔

امریک سنگھ نے اپنی چائے ختم کی۔ موسیٰ نے چھوئی بھی نہیں۔

''تمھارے پاس انجینئرنگ کی ڈگری ہے۔ ایسا ہی ہے نا؟''

''نہیں۔ آرکی ٹیکچر کی۔''

''میں تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ آرمی کو ہمیشہ انجینئروں کی تلاش رہتی ہے۔ کام بہت زیادہ ہے۔ اچھا پیسہ ملتا ہے۔ سرحد کی باڑیں، یتیم خانوں کی تعمیر، اور اب تھوڑے بہت تفریحی مراکز اور نوجوانوں کے لیے جم وغیرہ کھولنے کے منصوبے بھی بنائے جا رہے ہیں۔ اس جگہ کو بھی مرمت کی ضرورت ہے... میں تمھیں چند اچھے ٹھیکے دلوا سکتا ہوں۔ تمھارے لیے کم از کم اتنا قرض تو ہم پر ہے ہی۔''

موسیٰ نے نظریں اٹھائے بغیر، ایک بحری گھونگھے کے کانٹے کو اپنی شہادت کی انگلی سے چھو کر دیکھا۔

''میں حراست میں ہوں، یا پھر مجھے جانے کی اجازت ہے؟''

وہ چونکہ اوپر نہیں دیکھ رہا تھا، اس لیے اس نے غصے کا وہ شفاف پردہ نہیں دیکھا جو امریک سنگھ کی آنکھوں پر آن گرا تھا، بالکل اتنی ہی خاموشی اور تیزی کے ساتھ جیسے کوئی بلی نیچی دیوار پر سے کود پڑے۔

''تم جا سکتے ہو۔''

جب موسیٰ اٹھا اور کمرے سے نکلا تو امریک سنگھ بیٹھا رہا۔ اس کی گھنٹی کے جواب میں جو آدمی آیا اسے امریک سنگھ نے حکم دیا کہ موسیٰ کو باہر چھوڑ آئے۔

نیچے، سنیما کی لابی میں ٹار چر بریک چل رہا تھا۔ بڑی سی، بھاپ اگلتی ہوئی کیتلیوں سے فوجیوں کو چائے دی جا رہی تھی۔ لوہے کی بالٹیوں میں ٹھنڈے سموسے، ہر ایک کے لیے دو دو۔ موسیٰ نے لابی پار کی، اس بار بندھے ہوئے، مضروب، خون بہتے زخمی لڑکوں میں سے ایک لڑکے سے نظریں ملاتے ہوئے، جس سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس لڑکے کی ماں کیمپ سے کیمپ، پولس اسٹیشن سے پولس اسٹیشن جاتی رہی، اپنے بیٹے کو پاگلوں کی طرح ڈھونڈنے۔ شاید اس کی ساری عمر یوں ہی گزر جاتی۔ چلو کوئی اچھی بات تو نکلی اس رات کے بطن سے، خوف ناک ہی سہی، موسیٰ نے سوچا۔

وہ دروازے سے تقریباً باہر نکل چکا تھا جب امریک سنگھ سیڑھیوں پر نمودار ہوا، خوشی سے دمکتا ہوا، خوش خلقی بشرے سے ٹپکتی ہوئی۔ اس شخص سے بالکل مختلف جسے موسیٰ نے پروجیکشن روم میں چھوڑا تھا۔ اس کی آواز پوری لابی میں گونج اٹھی۔

''ارے حضور! ایک چیز میں بالکل بھول گیا تھا!''

ہر شخص نے —— ایذا دہندگان اور ایذا کے شکاروں نے ایک ساتھ —— اس کی طرف نظر گھمائی۔ ایک مکمل احساس کے ساتھ کہ سامعین کی توجہ پوری طرح اس کی طرف ہے، امریک سنگھ چستی سے سیڑھیوں سے اترا، ایک مسرور میزبان کی طرح جو اپنے ایسے مہمان کو وداع کرنے آیا ہو جس کی صحبت سے وہ بے حد لطف اندوز ہوا ہو۔ اس نے موسیٰ کو محبت سے گلے لگایا اور اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھما دیا جو پہلے سے ہی اس کے ہاتھ میں تھا۔

''یہ تمھارے ابا کے لیے ہے۔ ان سے کہنا کہ میں نے خاص طور سے انھی کے لیے منگوائی ہے۔''

یہ ریڈ اسٹیگ وِسکی کی بوتل تھی۔

لابی میں سناٹا چھا گیا۔ سب لوگ، سامعین اور ڈرامے کے مرکزی کردار اسکرپٹ سمجھ گئے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ اگر موسیٰ تحفہ ٹھکرا دیتا ہے تو یہ امریک سنگھ کے خلاف کھلا اعلان جنگ ہوگا، اس صورت میں موسیٰ کو مردہ ہی سمجھو۔ اگر وہ قبول کرتا ہے تو اس سے امریک سنگھ اس کی سزائے موت کا پروانہ مجاہدین کے ہاتھ میں تھما دے گا۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ یہ خبر باہر جائے گی، اور مجاہدین کے سارے گروہ، ان کے آپس میں جو بھی اختلافات ہوں، اس پر متفق ہیں کہ غاصب طاقتوں کے دوستوں اور ان سے ساز باز رکھنے والوں کی سزا صرف موت ہی ہے۔ اور وِسکی پینا —— چاہے پینے والا ساز باز نہ رکھتا ہو —— ایک غیر اسلامی حرکت ہے۔

موسیٰ اسنیک بار کی طرف بڑھا اور وِسکی کی بوتل اس نے کاؤنٹر پر رکھ دی۔

''میرے والد شراب نہیں پیتے۔''

''ارے اس میں چھپانے کی کیا بات ہے؟ اس میں شرم کی کوئی بات نہیں۔ تمھارے والد یقیناً پیتے ہیں! تم بھی یہ اچھی طرح جانتے ہو۔ میں نے یہ بوتل خاص طور سے انھی کے لیے خریدی ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں خود ہی انھیں دے دوں گا۔''

ابھی تک مسکراتے ہوئے امریک سنگھ نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ موسیٰ کے پیچھے جائیں اور اسے بہ حفاظت گھر پہنچا دیں۔ حالات نے جو رخ اختیار کیا تھا، اس پر وہ خوش تھا۔

خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے!

ارجمند آرا

اروندھتی رائے کا نیا ناول ''The Ministry of Utmost Happiness'' انگریزی میں ۶ جون ۲۰۱۷ کو منظر عام پر آیا تھا۔ پہلے ناول 'گاڈ آف اسمال تھنگس' کے بعد، بیس سال کے طویل وقفے سے۔ اس کے اردو ترجمہ کا پاکستانی ایڈیشن 'بے پناہ شادمانی کی مملکت' کے عنوان سے جنوری ۲۰۱۸ میں 'آج کی کتابیں' کے زیر اہتمام شائع ہو چکا ہے۔ ہندوستانی ایڈیشن راج کمل پرکاشن، دہلی سے اپریل کے آخر تک شائع ہونے کی امید ہے۔ ایسے میں جب کہ یہ ہندوستان میں ابھی چھپا نہیں، پڑھا نہیں گیا، اس پر مترجم کے تنقیدی مضمون کی اشاعت کچھ عجب جیسی بات لگتی ہے، لیکن پھر خیال آیا کہ میں صرف مترجم نہیں، قاری بھی ہوں اور اپنی رائے دینے کا حق رکھتی ہوں۔ حالاں کہ یہ بھی ہے کہ اردو میں اس قسم کے تعارفی مضامین بعض ایسے ناقدین کا حلوہ مانڈا بن جاتے ہیں جو تخلیق کو پڑھنے کے بجائے، اس پر چھپنے والے مضامین اور تبصروں کی دعوتیں اڑانے اور صحت بنانے کے عادی ہیں، اور اس سے یہ خدشہ رہتا ہے کہ بہت سے قارئین بھی تنقیدوں اور تبصروں ہی سے سیر ہو جائیں گے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ جنھیں پڑھنا نہیں وہ آج بھی نہیں پڑھیں گے، کل بھی نہیں۔ اور جنھیں پڑھنا ہے وہ ترجمے کی اشاعت کے منتظر ہوں گے کہ اروندھتی رائے کی ہر تحریر کا لوگ اسی طرح انتظار کرتے ہیں۔ پھر اس ناول کی تو دھوم مچی ہیں۔

چنانچہ بسم اللہ کرتی ہوں۔ اپنے چند معروضات قلم بند کرنے کی نیت باندھتے ہوئے ایک اچھے مومن کی طرح اپنی بات 'لا' سے شروع کرتی ہوں؛ یعنی اس اقرار سے کہ کن کن لوگوں کو یہ ناول پڑھنے سے انکار کر دینا چاہیے۔ لیکن واضح رہے کہ یہ 'انکار' مترجم کی جانب سے نہیں بلکہ 'اقرار' ہے ان لوگوں کا، جن کی 'دیش بھکتی' بھارت کی ایسی اکھنڈتا میں یقین کا نام ہے جس میں تنوع کی گنجائش نہیں، اقلیتیں جن کے نزدیک غیر ہیں، اور اسی لیے تحقیر کی مجاز بھی۔ یہ انکار ان لوگوں کا ترجمان بھی ہے جنھوں نے ہزاروں سال سے ذات پات کو اپنا وطیرہ بنایا، دلت، پسماندہ بہوجن کو اپنا خدمت گار بنایا، ان کا انسان ہونے کا منصب چھینا اور آج کہ جب ان میں اس انتہائی استحصال کے خلاف بیداری کی مہمیں تیز ہوئی ہیں، اعلیٰ ذات کے یہ نمائندے الٹا انھی پر

الزام دھر رہے ہیں کہ یہ لوگ ذات پات پھیلا رہے ہیں۔ یہ انکار ان لوگوں کا بھی ترجمان ہے جو جمہوریت کی حمایت میں سینہ سپر، وحدت میں کثرت کے حامی، سیکولر قدروں کے پاسدار اور حقوق انسانی کے پرچم بردار ہیں لیکن ان کی یہ روشن خیالی مشروط روشن خیالی ہے۔ ان کا بھی اپنا ایک 'قوم' اور 'غیر قوم' کا تصور ہے۔ اسی لیے وہ بنگلہ دیش کے بنگالیوں کی پاکستان سے آزادی کے حامی رہے (برحق ہی)، لیکن کشمیریوں کا حق انتخاب تو دور کی بات، کشمیر میں انسانی حقوق کا نام لینا تک ان کے نزدیک شجر ممنوعہ ہے جس کا پھل چکھنے سے عقل و ادراک کے دروازے وا ہو جاتے ہیں، اور ایسا وہ کرنا نہیں چاہتے کیوں کہ ان کے نزدیک کشمیر عقل پرستی کا نہیں، عوامی جذبات کا مسئلہ ہے۔ یہ انکار ان لوگوں کی طرف سے بھی ہے جو کنفرمسٹ، اخلاق پرست، مہذب اور ایسے 'امن پسند' شہری ہیں جنھیں آدیباسیوں پر زیادتیوں کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز 'دہشت گرد' ماؤنوازوں کی آواز معلوم دیتی ہے۔ یہ انکار ان کا بھی نمائندہ ہے جن کے نزدیک ادب اجتماعی زندگی کا نہیں بلکہ فرد کے جزیرۂ ذات کے اظہار کا نام ہے، یا ایسا کشف والہام ہے جو غیب سے سیدھا ان کے دل میں اترتا ہے۔ اور جو ادب کشف والہام ہو، اس کی تبلیغ کے لیے ان کے پاس اپنی اپنی امتوں کا ہونا بھی ضروری ہے، سو وہ کار پیغمبرانہ بڑی تندہی سے انجام دے رہے ہیں۔

چنانچہ، ان تمام دیش بھکتوں، مذہب پرستوں، دلت اور آدیباسی مخالفوں، نظریاتی تعصب کے سبب حقوق انسانی کو پامال کرنے والوں، عوام کو تحقیر کی نظر سے دیکھنے والے اشراف پسندوں، اخلاق پرستوں، نام نہاد 'اعلیٰ' تہذیب اور ادب کے نمائندوں، نفاست پسندوں، طہارت پسندوں، مہذب شہریوں کی جانب سے اس منشور کا اعلان کیا جاتا ہے: اس ناول کو نہ پڑھا جائے، بلکہ یکسر نظر انداز کر دیا جائے، کیوں کہ اس میں وہی سب غلاظت بھری ہے جس سے ہم لوگ نفرت کرتے ہیں، مخالف ہیں، اور ہمارے 'سوچھ' بھارت کے 'سوچھ' سپنے، پاک صاف اور صالح معاشرے کے خواب میں، اس کاٹھ کباڑ کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ تکثیریت کے بت شکن، بھارت ماتا کے سچے اُپاسک اور رکشک، ہم سچے قوم پرست، یہ تنبیہ کرتے ہیں کہ اروندھتی رائے اور ان جیسے ننگ وطن، کیڑے مکوڑے جو اپنی بھن بھن سے خواہ مخواہ ہمارے پیارے وطن کو دنیا بھر میں بدنام کرتے پھرتے ہیں اور جو چپ رہنے کی معمولی سی قربانی بھی نہیں دے سکتے، اپنے منفی رویوں سے باز آئیں، ورنہ ان کے برے دن دور نہیں۔'' (یہ دھمکی مضمون نگار کے خرافاتی ذہن کی اڑان اور بے جا جذباتیت نہیں بلکہ ایسی حقیقت ہے جس کا نزول اروندھتی رائے اور اس جیسے بہت سے غداروں کے اِن باکس میں رات دن ہوتا رہتا ہے۔)

لیجیے صاحبو! ان لوگوں سے میدان صاف ہوا جن کو یہ ناول نہیں پڑھنا چاہیے۔ اب دیکھیں کہ خود ناول نگار کن لوگوں کے لیے اور کن کے متعلق یہ ناول لکھ رہی ہیں۔ ان کے انتساب کے مطابق یہ ناول unconsoled لوگوں کے لیے ہے۔ یعنی 'جنھیں قرار نہیں' وہ بھی اور 'جنھیں کوئی تسلی نہیں دیتا' وہ بھی (اردو میں unconsoled کے یہ دونوں معنی ایک ہی لفظ میں سمانے مشکل ہیں، اس لیے وضاحت ضروری ہوئی)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہندوستان کے کثیر ثقافتی سماج میں حاشیے پر جیتے ہیں، اور جن کے خلاف تعصب

برتنے کا کوئی نہ کوئی جواز ہمارا نام نہاد مہذب معاشرہ کھوج ہی نکالتا ہے۔ مارجن پر رہنے والے یہ لوگ صرف مذہبی اور سیاسی، ذات پات اور سماجی تعصب کا شکار نہیں، بلکہ ایک بہت ہی تہ در تہ اور پیچیدہ نظام ہے اس تعصب اور تشدد کا، جو ہر طرح کے کمزور لوگوں کے خلاف اس ملک میں سانسوں کی طرح بے شکست جاری ہے۔ یہی لوگ، جن کا کوئی پرسان حال نہیں، اس ناول کے مرکز میں ہیں۔

اس مضمون کے پڑھنے والوں کو شاید لگے کہ اس ناول میں نیا کیا ہے؟ اروندھتی رائے نے تو اپنے متنازع سیاسی خیالات کو ہی اس ناول میں یکجا کر دیا ہے۔ بھئی جہاں تک میری سمجھ میں آتا ہے تو انھوں نے لکھا تو فکشن ہی ہے، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ جس زمان و مکان میں، جس ماحول کے متعلق یہ فکشن لکھا گیا ہے اس کی فضا ہی زہریلی ہے، اور اس کو سونگھ لینے والی ناک اور بھانپ لینے والی حس بہت سوں کے پاس ہو گی لیکن اس کو بیان کرنے کی قوت سب میں نہیں ہوتی۔ یہ ناول جو بظاہر ریاستی جبر، فرقہ پرست ہندو تنظیموں کی متشدد آئیڈیالوجی، مسلمانوں کی دگرگونی، ان کے خلاف تعصب، دلتوں پر تشدد، کشمیر اور آدیباسیوں کی تحریکات جیسے موضوعات کا احاطہ کرتا ہے، یہ تاثر دیتا ہے کہ گزشتہ بیس برس کے ایکٹیوزم میں اروندھتی رائے جن مسائل پر بے خوفی اور جرأت سے لکھتی رہی ہیں، انھی کو اس ناول میں بھی سمویا گیا ہے۔ لیکن اس الزام پر مصنفہ اپنے مزاج کے عین مطابق، مدافعتی رویہ ہرگز نہیں اپنا تیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے لکھ کر ناول قارئین کے حوالے کر دیا ہے، وہ آزاد ہیں، جیسی چاہیں رائے قائم کریں۔ ویسے اس ناول کو ہندوستان کے کچھ لوگوں اور مسئلوں پر مرکوز ناول نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ اس فضا کو پیش کرتا ہے جس میں ہم سانس لیتے ہیں۔ اور جس فضا میں ہم سانس لیتے ہیں اس سے لاتعلق کیسے رہ سکتے ہیں؟ اگر بقول غالب ''زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی'' تو اس میں ارندھتی کا کیا قصور! اور ہاں، اسی پر یاد آتا ہے منٹو کا وہ بیان جو بمبئی کے جوگیشوری کالج میں پڑھے گئے ایک مضمون کا حصہ تھا، بے شک اس کا سیاق و سباق الگ تھا، سیاسی نہیں تھا:

> زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں، اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابل برداشت ہے۔...لوگ مجھے سیاہ قلم کہتے ہیں لیکن میں تختۂ سیاہ پر کالی چاک سے نہیں لکھتا، سفید چاک استعمال کرتا ہوں، کہ تختۂ سیاہ کی سیاہی اور بھی زیادہ نمایاں ہو جائے۔

(دیباچہ، منٹو کے افسانے، جنوری ۱۹۴۴)

اسی طرح کی ایک سیاہی کو اروندھتی رائے بھی نمایاں کر رہی ہیں۔ بس۔ وہ تو بریخت کی مانند 'ظلمتوں کے دور میں بھی ظلمتوں کے ہی گیت' گا رہی ہیں۔

لیکن گزشتہ تیس چالیس برس کی اس پراگندہ، سیاہ فضا کو اپنے ناول میں اروندھتی رائے کس طرح مصور کر سکیں؟ اتنے پھیلے ہوئے موضوع کو انھوں نے کیوں کر سمیٹا؟ یہ کام ایک چست، درست، نفیس قسم کے پلاٹ پر مبنی ناول میں کرنا ممکن نہیں تھا شاید۔ اپنے ناول کو وہ خود ''ایک ٹوٹی بکھری کہانی'' سے تعبیر کرتی ہیں

(ناول کے بیک کور پر شائع شدہ نظم کے مطابق)۔ اسی لیے ناول پڑھتے ہوئے قاری کو جھٹکے پر جھٹکے لگتے ہیں۔ کبھی لگتا ہے کہ موضوع کے اعتبار سے کم از کم دو یا تین ناولوں کا مواد ایک ہی ناول میں ڈال دیا گیا ہے۔ کہاں کشمیر کا مسئلہ، کہاں آدیباسیوں کی تحریکیں، اور کہاں ہندو رائٹ ونگ کی کارستانیاں! ان کا آپس میں کیا تعلق؟ لیکن تعلق ہے، جس کی نقاب کشائی کے لیے جس بصیرت اور ادراک کی ضرورت ہے، اسے کوتاہ بیں اور بے بصیرت لوگ نہیں دیکھ سکتے۔ اتھلی نظر سے دیکھنے والوں کو کبھی لگتا ہے انشا پردازی کی جا رہی ہے، کبھی لگتا ہے تاریخ لکھی جا رہی ہے، کبھی لگتا ہے کسی دستاویز پڑھ رہے ہیں۔ کہیں اخبار کی رپورٹنگ جیسا تاثر ملتا ہے تو کہیں افسانچے پڑھنے کو ملتے ہیں اور کہیں داخلی امور کی پالیسی پر کسی چالاک بیوروکریٹ کی ڈائری پڑھنے کا تاثر حیران کرتا ہے۔ یعنی ناول دولخت (انجم اور تلوتما کے ذواساسی کردار ہونے کے سبب)، بلکہ لخت لخت ہے۔ کئی کہانیوں کا یہ ادغام اسلوب کے تنوع کا بھی متقاضی تھا۔ اسی لیے غائب راوی جو ناول کے بیشتر واقعات کا راوی ہے، بیچ ناول میں اچانک غائب ہو جاتا ہے، ناول کا کوئی کردار اسے کھدیڑ کر کہانی سے باہر کر دیتا ہے اور واحد متکلم میں کہانی کو آگے بڑھاتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ناول کی ساخت بھی عجیب و غریب ہے۔ کوئی باب سوسوا سو صفحے پر مشتمل ہے، کوئی آدھا صفحے پر۔ یہ اسلوب اور اسٹرکچر کچھ ایسا تاثر دیتا ہے کہ اروندھتی رائے نے ناول لکھنے کے بعد اسے اچھی طرح ایڈٹ نہیں کیا ہے۔ لیکن کیا سچ مچ ایسا ہو سکتا ہے؟ شاید نہیں۔ ایسا سوچنا خود کو فریب دینے کے مترادف ہوگا کہ یہ ان کا عجز بیان ہے۔ دانستہ طور پر اپنایا گیا یہ اسلوب فریب کا ایک جال ہے، انجم کے والد ملاقات علی کے ایک صحافی کو سنائے ہوئے میر کے شعر کی مانند جو کچھ یوں سنایا گیا جیسے وہ ''کنایے کا ناشتہ، فریب کا سموسہ، نوحے میں لپٹی ہوئی تنبیہ ہے۔'' (ص ۲۵)

لیکن بظاہر الگ الگ مسائل کو جس طرح باہم گوندھا گیا ہے، اور جن میں نہایت مہارت اور دقت نظری سے بنائے گئے تلو اور انجم کے کرداروں کے وسیلے سے باہم آمیز کیا گیا ہے، اس پر اروندھتی رائے کی ذہانت اور بے پناہ تخلیقی قوتوں کو داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ مذکورہ نظم میں وہ کہتی ہیں:

کس طرح سنائی جائے، ایک ٹوٹی بکھری کہانی؟
دھیرے دھیرے ہر شخص میں ڈھل کر
نہیں

دھیرے دھیرے ہر شے میں ڈھل کر!

یہ نظم ان کے اسی بیانیے، بلکہ رزمیہ کا دیباچہ یا preamble ہے، حرف اول ہے جسے 'حرف آخر' کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اروندھتی رائے نے محض چند کرداروں کی کہانی بیان نہیں کی، بلکہ وہ ہر شخص میں اور سچ مچ ہر شے میں ڈھل گئی ہیں۔ اس میں پایل (گھوڑی)، کامریڈ لالی (کتیا)، بیرو (کتا)، گدھ، کوا، سانڈ، چتی دار الو، بکرے، سلطان (مرغا)، آغا اور خانم (بلی کے بچے) اور گوہ کیوم (گوبر کا کیڑا) تک اتنے ہی جاندار اور ضروری کردار ہیں جتنے انسان۔ شاہجہان آباد کا فصیل بند شہر اور اس کے گلی کوچے، سرمد شہید کی درگاہ، خواب گاہ (گلی دکوتان میں واقع ہیجڑوں کی حولی)، نئی دہلی کی سڑکیں اور فلائی اوور، جنتر منتر، اسپتال

کے عقب میں واقع اجاڑ قبرستان، کشمیر میں ایچ بی شاہین (ہاؤس بوٹ)، شیراز سنیما (جہاں انٹیروگیشن سینٹر یا ٹارچر سیل قائم ہے) بھی سانس لیتے، دھڑکتے ہوئے کردار ہیں۔ یہ مقامات کس طرح زندہ کردار بن جاتے ہیں، ایک مثال سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ نوے کی دہائی میں نئی معاشی پالیسی آنے کے بعد دلی کی کایا پلٹ ہوگئی، ہر طرف فلائی اوور، شاپنگ مال، فلک بوس عمارتیں اُگ آئیں جن کی تعمیر 'غیر ضروری لوگوں'، ناداروں کی قیمت پر ہورہی تھی۔ اسی دلی کی یہ تصویر ملاحظہ ہو:

> اس کے اردگرد شہر میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ ہزار سالہ بوڑھی ڈائن، نیند میں جھونٹے کھاتی ہوئی، لیکن سوئی نہیں، رات کی اس گھڑی میں بھی۔ بے شمار سرمئی فلائی اوور دوشیزہ میڈوسا کی کھوپڑی پر اُگے ہوئے سانپوں کی مانند، پیلے سوڈیم کے دھندلکے میں الجھتے سلجھتے ہوئے۔ بے گھر بے در لوگوں کے خوابیدہ بدن ان کے اونچے تنگ فٹ پاتھوں پر قطاریں لگائے تھے: سر سے انگوٹھا، سر سے انگوٹھا، دور تک ایک لمبی زنجیر بنائے ہوئے۔ اس کی ڈھلکی ہوئی، چمرخ جلد کی جھریوں میں قدیم رازوں کی پرتیں تھیں۔ ہر جھری ایک سڑک تھی، ہر سڑک ایک کاروان جشن۔ گٹھیا کا مارا ہر جوڑ ایک ٹوٹا پھوٹا اسٹیج تھا جس پر عشق و جنون کی، حماقتوں کی، مسرت اور ناقابل بیان مظالم کی داستانیں صدیوں سے کھیلی جارہی تھیں۔ لیکن اس طلوع صبح کو میلادموعود کی صبح ہونا تھا۔ اس کے نئے آقا چاہتے تھے کہ اس کی پھولی ہوئی، گانٹھ دار رگوں کو امپورٹڈ جالی والی لمبی جرابوں میں چھپا دیا جائے، اس کے مرجھائے ہوئے پستان گدی دار، شوخ رنگ انگیا میں ٹھونس دیے جائیں اور درد میں مبتلا اس کے پیروں کو اونچی ایڑی کے نوک دار جوتوں میں جکڑ دیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ اپنے اکڑے ہوئے بوڑھے کولہے مٹکائے اور کرب سے مسخ لبوں کی اینٹھن کو ایک منجمد، خالی مسکراہٹ میں بدل دے۔ یہ وہ موسم تھا جب نانی اماں کو رنڈی بنادیا گیا۔ (صفحہ ۱۰۴)

ظاہر ہے کہ ابھرتی ہوئی اس نئی دلی کے جاندار کردار کرائے بغیر، اس نئی فضا کی عکاسی کے بغیر اس ماحول کو گرفت میں نہیں لیا جاسکتا تھا جس کی کہانی ناول میں بیان ہوئی ہے۔

میں نے اوپر کہیں لکھا ہے کہ فضا کو محسوس بہت سے لوگ کرتے ہیں لیکن اس کو بیان کرنے کی قوت سب میں نہیں ہوتی۔ ناول بنیادی طور پر ایک بیانیہ صنف ہے، اگر ناول نگار عجز بیان کا شکار ہوجائے تو اسے پڑھنا دشوار ہوجائے۔ اچھا بیانیہ بہت کچھ مصنف کی قوت مشاہدہ اور اس مشاہدے کے پیچیدہ ترین پہلوؤں کے موثر ڈھنگ سے بیان کرنے سے ترتیب پاتا ہے۔ اسی لیے اچھا ناول نگار اپنے موضوع سے اس طرح واقف ہوتا ہے جیسے ہتھیلی کی لکیروں سے۔ دور سے مشاہدہ کرکے کسی ماحول اور اس میں پنپنے والے کرداروں کو مجسم نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی افغانستان یا لاطینی امریکہ کے متعلق کچھ لکھنا چاہے تو اپنے تمام تر اکتسابی علم کو بروئے کار لا کر بھی ویسا بیانیہ ترتیب نہیں دے سکتا جو وہ ادیب دے گا جس نے مذکورہ ممالک کی

تہذیبی، عمرانی، نفسیاتی اور سیاسی و تاریخی دنیا کا قریب سے مشاہدہ کیا ہوگا۔ ضروری نہیں کہ ادیب اسی سماج کا حصہ ہو، لیکن یہ ضرور ہے کہ اسے اس ماحول میں رما ہوا ہونا چاہیے۔ رمنے کو ہم علمی اصطلاح میں internalize اور empathize کرنا کہہ سکتے ہیں۔ اروندھتی رائے ظاہر ہے شمالی ہندوستان کی اس تہذیب کا حصہ نہیں ہیں جو اردو ہندی کے مشترک علاقوں پر مشتمل ہے۔ ان کی پرورش کیرالہ میں ہوئی اور جب وہ دہلی آئیں تو ہندی کا صرف ایک ہی جملہ جانتی تھیں، جو انھوں نے اپنی ہندی کی نصابی کتاب میں پڑھا تھا۔ شاید مسلمانوں اور اردو سے تو وہاں کوئی واسطہ ہی نہ پڑا ہو۔ درست ہے کہ دہلی میں رہ کر انھوں نے یہاں کی بول چال کی زبان ہندی لکھنا پڑھنا سیکھی، لیکن وہ اردو پڑھنا نہیں جانتیں البتہ سمجھ سکتی ہیں۔ اس کے باوجود اس ناول کو پڑھتے ہوئے قاری کو ضرور دھوکا ہوگا کہ وہ اردو اور اردو تہذیب سے بخوبی واقف ہیں۔ میں نے اسی حیرانی کے ساتھ ان سے کہا بھی کہ پرانی دہلی کے مسلمانوں کے بارے میں آپ کی تحقیق حیرت زدہ کرتی ہے۔ انھوں نے مختصر سا جواب دیا 'کوئی ریسرچ نہیں کی۔ اس زندگی کو جیا ہے۔' میں نے ان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو آگے بتایا کہ پرانی دہلی میں ان کے پاس اب بھی ایک گھر ہے جہاں رہ کر انھوں نے اس زندگی کو قریب سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ اپنا مضمون *Walking with the Comrades* لکھنے کے لیے انھوں نے کس طرح کا جوکھم اٹھا کر دانتے واڑہ کے جنگلوں میں سفر کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ وہ زندگی کے ہر ممکن پہلو کا تجزیہ کرتی ہیں، اپنے منفرد انداز میں۔ پرانی دہلی کو کھوجتی ہیں تو صرف گلی کوچوں کو ہی نہیں، وہاں کی زندگی کی گہما گہمی بھی ہے، مزاروں کی تاریخ بھی ہے، سرمد شہید کی کہانی بھی، مشہور و معروف برانڈ روح افزا کی تاریخ کے بہانے سے ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ہاتھوں مقامی صنعتوں کی بربادی کا نوحہ بھی اور بقرعید پر گلیوں میں ہونے والی بھینسوں کی قربانیاں بھی۔ ایک منظر دکھانا کافی ہوگا۔

> ایک چکنی، موٹی، تیل لگی اور چمکتی ہوئی بھینس کو ان تنگ گلیوں میں، جن کی چوڑائی بھینس کے برابر ہی تھی کھینچ کر اس چوراہے کی طرف لے جایا گیا جہاں پچھاڑنے کے لیے جگہ ذرا کشادہ تھی۔ آڑی کھڑی ہوئی، بجلی کے کھمبے سے بندھی، اگلی دونوں ٹانگیں رسی سے جکڑی ہوئی، وہ اس جگہ میں جیسے تیسے فٹ ہوگئی جو گلی کا چوک کہلاتا تھا۔ نئے کپڑوں میں ملبوس اور جوش سے معمور لوگ عمران کو بھینس ذبح کرتے دیکھنے کے لیے دروازوں، کھڑکیوں، چھوٹے چھجوں اور چھتوں پر جمگھٹے لگائے تھے۔ دبلا پتلا، خاموش اور بے تصنع عمران بھیڑ میں راستہ بناتا ہوا نمودار ہوا۔ ہجوم کی بھنبھناہٹ جیسے ہی بدلنے لگی، بھینس کی جلد کپکپانے لگی اور اس کی آنکھیں گردش کرنے لگیں۔ اس کا بھاری سر، جس کے سینگ پیچھے کی جانب لمبوتری محراب کی صورت میں گھومے ہوئے تھے، آگے پیچھے یوں جھومنے لگا جیسے اسے کلاسیکی محفل موسیقی میں وجد آگیا ہو۔ جوڈو کے ایک پھرتیلے داؤ کے ساتھ عمران اور اس کے مددگار نے اسے پہلو کے بل گرا دیا۔ ایک لمحے میں عمران نے اس کے

گلے کی رگیں کاٹ دیں اور خود کود کر خون کے اس فوارے کے سامنے سے ہٹ گیا جو ہوا میں اچھل رہا تھا، اور جس کا آہنگ بھینس کے ڈوبتے ہوئے دل کی دھڑکن کے ساتھ ہم آہنگ تھا۔ خون کا فوارہ دکانوں کے بند شٹروں سے ٹکرایا اور دیواروں پر چسپاں پھٹے پرانے پوسٹروں میں سیاستدانوں کے مسکراتے ہوئے چہروں سے بھی۔ وہ گلی میں بہتا ہوا کھڑی ہوئی موٹر سائیکلوں، اسکوٹروں، رکشوں اور سائیکلوں کے قریب سے گزرا۔ جڑاؤ چپلیں پہنے ننھی لڑکیاں چیخیں مارتی اس کے راستے سے ہٹ گئیں۔ ننھے لڑکوں نے بے نیازی کا بہانہ کیا، جب کہ نسبتاً شریر لڑکے سرخ تالاب میں دھیرے دھیرے کودنے اور اپنے جوتوں کے خونیں نشانوں کو تعریفی نظر سے دیکھنے لگے۔ بھینس کی جان نکلنے میں تھوڑا وقت لگا۔ جب وہ مرگئی تو عمران نے اسے چاک کیا اور اس کے اندرونی اعضا نکال کر گلی میں ڈالنے لگا؛ دل، گردے، تلّی، پیٹا، جگر، آنتیں۔ چونکہ گلی ڈھلواں تھی، وہ یوں پھسلنے لگے جیسے عجیب ڈھنگ کی کشتیاں خون کی ندی میں چل رہی ہوں۔ عمران کے مددگار نے انھیں سنبھالا اور قدرے سپاٹ جگہ پر رکھ دیا۔ کھال اتارنے اور ٹکڑے کرنے کا کام سپورٹنگ کاسٹ کو کرنا تھا۔ سپر اسٹار نے اپنے بغدے کو کپڑے سے صاف کیا، ہجوم کا جائزہ لیا، انجم سے نظریں ملائیں اور سر کو خفیف سی جنبش دی۔ پھر وہ ہجوم میں گھسا اور نکلتا چلا گیا۔ انجم پیچھے لپکی اور اگلے چوک پر اسے جا لیا۔ سڑکیں چل رہی تھیں۔ بکروں کی کھالیں، بکروں کے سینگ، بکروں کے سر، بکروں کے بھیجے اور بکروں کی آلائشیں جمع کی جا رہی تھیں اور ان کے ڈھیر لگائے جا رہے تھے۔ آنتوں سے گوبر نکالا جا رہا تھا، جنھیں بعد میں اچھی طرح صاف کر کے اور ابال کر صابن اور گوند بنایا جانا تھا۔ بلیاں لذیذ مال غنیمت لے کر بھاگ رہی تھیں۔ کچھ بھی ضائع نہیں ہوا۔

میں نے کوشش کی کہ اس اقتباس کو مختصر کر دوں، لیکن لگا نہیں کہ اس منظر کو کٹ شارٹ کیا جا سکتا ہے۔ قربانی کی یہ سرد تصویر کشی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

اس کہانی کو سنانے اور حالات کی ستم ظریفی کو اجاگر کرنے کے لیے اروندھتی رائے نے جس اسلوب کی تشکیل دی ہے، وہ بھی منفرد اور چونکانے والا ہے۔ اروندھتی ویسے بھی اپنے منفرد تخلیقی سوتوں اور طنزیہ اسلوب کے لیے معروف ہیں۔ طنز، تمسخر اور تضحیک کے زیرک ہتھیاروں سے لیس ان کی زبان ایسی ہے جس کی کاٹ خنجر سے بھی زیادہ گہری ہے۔ مثال کے طور چند مختصر جملے تحریر کر کے چھوڑتی ہوں، لیکن اس caution کے ساتھ کہ ان کی کاٹ اپنے سیاق میں ہی زیادہ اجاگر ہوتی ہے:

☆ یہ امن کا دور تھا۔ یا ایسا کہا جاتا ہے۔ (ص ۱۰۴)

☆ مسابقت میں مبتلا ٹی وی چینلوں نے بریکنگ سٹی (ٹوٹتے شہر) کی کہانی کو ’بریکنگ

نیوز‘ بنا کر پیش کیا۔ (ص ۱۰۷)

☆ اپنے کتوں کے لیے وہ [اعلیٰ طبقے کے لوگ] کاریں رکھتے ہیں، اور کاروں کے لیے باغ۔ (ص ۱۴۸)

☆ آج کل، کشمیر میں، کوئی بھی فقط اس لیے مارا جا سکتا ہے کہ وہ بچ کیوں گیا ہے۔‘‘ (ص ۲۸۶)

☆ جنگ میں دشمن ہمت نہیں توڑ سکتے،... صرف دوست توڑ سکتے ہیں۔ (ص ۲۸۶)

☆ کشمیر میں جب ہم صبح کو جاگتے ہیں اور ’گڈ مارننگ‘ (صبح بخیر) کہتے ہیں تو ہماری مراد اصل میں ’گڈ مورننگ‘ (Good Mourning) (ماتم بخیر) ہوتی ہے۔ (ص ۲۹۷)

☆ آپ فوجیوں کے غصے اور احساس توہین کو محسوس کر سکتے ہیں۔ آپ ان کی بے بسی بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک لمحے میں سب کچھ بدل سکتا ہے۔ انھیں بس اتنا ہی کرنا ہے کہ گھومیں اور گولی چلا دیں۔ لوگوں کو بس اتنا ہی کرنا ہے کہ لیٹیں اور مر جائیں۔ (ص ۲۹۹-۳۰۰)

☆ میں اب کوئی ایسی مہذب کہانی لکھنا چاہوں گی جس میں کچھ زیادہ واقع نہیں ہوتا، پھر بھی لکھنے کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے۔ یہ کام کشمیر میں نہیں کیا جا سکتا۔ جو کچھ یہاں ہوتا ہے وہ مہذب نہیں۔ یہاں اس قدر خون ہے کہ اچھا ادب لکھا ہی نہیں جا سکتا۔ (ص ۳۰۱)

ناول کی کہانی یا پلاٹ پر بات نہیں کروں گی، اسے سمجھنے کے لیے ناول ہی کا انتظار کرنا بہتر ہوگا، البتہ چند کرداروں کا تعارف کرایا جا سکتا ہے۔

ناول کی ایک اساسی کردار انجم (سابق آفتاب) ہے جو پرانی دہلی کی چتلی قبر کے علاقے میں ایک غریب لیکن معزز حکیم کے گھرانے میں پیدا ہوئی، پلی بڑھی۔ ٹرانس جینڈر (ذو صنفی) ہونے کی وجہ سے لوگوں کے طنز اور دشنام کی جراحتیں برداشت کرتے ہوئے اس نے ’درخت‘ کی طرح جینا سیکھ لیا؛ ردعمل ظاہر کیے بغیر، سہن تک محسوس کیے بغیر۔ لیکن گجرات کے فسادات میں اتفاقی طور پر گھرنے کے بعد اس نے جو خونریزی دیکھی، اس کے زخم کبھی مندمل نہ ہو سکے۔ ’ہیجڑا‘ ہونے کے سبب، بدشگونی کے خوف سے بے شک ’بھگوا طوطوں‘ کی فوج نے اس کی جاں بخشی کر دی، لیکن دہلی لوٹنے کے بعد انجم اپنی زندگی کو ہمیشہ قاتلوں کا شگون، ’قصائیوں کا سو بھاگیہ‘ ہی مانتی رہی۔ موت کے ساتھ اس دو بدو مکالمے نے اسے جینے کی ہر خواہش سے محروم کر دیا اور وہ انجم جس کی نوعمری میں یہ تمنا تھی کہ ’’جب پانی کے کسی گڈھے کو پھلانگے تو اپنی شلوار تھوڑی سی اچکالے؛ بس اتنی کہ اس کی چاندی کی پازیبیں نظر آجائیں‘‘ (ص ۲۸)، جو زندہ دل، اپنے حسن اور

نسوانیت پر نازاں تھی، اپنے سب سامان کو آگ لگا، ضرورت کا بہت تھوڑا سا سامان لے کر ایک قبرستان میں اٹھ آئی اور اپنی ذات کے اونچے قلعے میں محصور ہوگئی۔ ''انجم اس کے طلائی حجروں میں گھبرائی ہوئی یوں چکر کاٹا کرتی جیسے کوئی مفرور آدمی خود ہی سے بچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ بھگوا مسکراہٹوں والے بھگوا جلوس کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتی، جو اپنے بھگوا ترشولوں پر ننھے بچوں کو بلند کیے اس کا پیچھا کرتا، لیکن اپنی کوشش میں ناکام رہتی'' (ص ۷۰)۔ یہ انجم تھی، ایک محصور شہر، شاہجہان آباد کی محصور باشندہ، حاشیہ نشین اقلیت کی حاشیہ نشین رکن، جنس کے اعتبار سے ایک حاشیہ نشین کردار، بالآخر زندگی کے حاشیے، یعنی قبرستان میں پناہ گزین ہوئی۔

ناول کی دوسری اساسی کردار تلوتما انگریزی داں ملیالی عیسائی ہے اور دہلی میں آرکی ٹیکچر کی تعلیم پاتی ہے۔ وہ ایک اعلیٰ ذات کی سیرین کرسچین ماں اور دلت باپ کی بیٹی ہے۔ ماں برسرعام اسے اپنی اولاد نہیں کہہ سکتی لیکن اولاد کی محبت اسے اپنانے پر مجبور بھی کر دیتی ہے۔ اس صورت حال نے تلوتما کو نفسیاتی طور پر بالکل تنہا کر دیا ہے۔ اس کی کوئی جڑیں نہیں، اپنے سگے نہیں اور اسے وہ محفوظ گھریلو ماحول نہیں ملا جو انجم کو ملا تو تھا لیکن جینڈر کے بحران نے جسے تنہا اور marginalized کر دیا تھا۔ اپنے تمام تر نامساعد حالات کے باوجود تلوتما اور انجم اپنی اپنی تنہائی سے کس طرح نمٹتی ہیں، کس طرح استقامت سے ایک نئی زندگی شروع کرتی ہیں، یہی وہ پیغام ہے جو ہندوستان کے تمام حاشیہ نشین لوگوں کے لیے شعاع امید بنتا ہے۔

تلوتما کے اردگرد تین مرد دوست ہیں جو اپنے اپنے طور پر اس کی محبت میں مبتلا ہیں۔ ایک کشمیری نوجوان موسیٰ یسوی ہے جو تلو کا کلاس میٹ ہے اور جس سے تلوتما بھی محبت کرتی ہے، دوسرا ناگ راج ہری ہرن جو صحافت کا پیشہ اختیار کرتا ہے اور کامیاب روشن خیال صحافی بنتا ہے، اور تیسرا بپلب داس گپتا (عرف گارسن ہوبارٹ) جو انٹیلی جنس بیورو میں افسر ہے۔ موسیٰ آرکیٹکٹ کے طور پر اپنے کیریر کو خیرباد کہہ کر کشمیر کی تحریک آزادی میں کود پڑتا ہے اور اسی کے وسیلے سے تلوتما کشمیر کے معاملات میں الجھ جاتی ہے۔ تینوں مرد کرداروں میں بیوروکریٹ گارسن ہوبارٹ شاید سب سے دلچسپ اور پیچیدہ کردار ہے۔ اسے ہم نہرووین ماڈل، اس زمانے کی اقدار کا پابند ایسا کردار پاتے ہیں جو اپنے ذہن و دل سے روشن خیال اور حساس ہے لیکن حکومت کا کل پرزہ ہونے کے سبب جو ٹھنڈے دل اور غیر جانب داری سے ریاستی جبر کی کارفرمائیوں کو جواز فراہم کرسکتا ہے، انھیں دلائل کے ساتھ جائز ٹھہرا سکتا ہے۔ گارسن ہوبارٹ ہی ہے جس کے متعلق اروندھتی رائے کا کہنا ہے کہ ناول لکھنے کے دوران وہ ان کے قابو سے باہر ہوگیا اور واحد متکلم کے طور پر کہانی میں کود پڑا اور کہانی کا بیانیہ جس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کشمیر کے مسئلے پر گارسن ہوبارٹ حکومت کے موقف کا ترجمان ہے، غالباً اسی وجہ سے کہ ناول کا غائب راوی حکومت ہند کے موقف کے بیان میں وہ غیر جانب داری نہیں برت سکتا تھا جس کی نمائندگی ناول میں ضروری تھی۔ اسی ضرورت نے اروندھتی رائے سے دو الگ الگ راویوں کو متعارف کروایا۔

ان مرکزی کرداروں کے علاوہ یاد رہ جانے والے کردار اور بھی ہیں، ہر ایک اپنی جگہ ضروری اور

اہم۔ لیکن مس جبین اول، مس جبین دوم، گلریز، امریک سنگھ، صدام حسین اور ڈاکٹر آزاد بھارتیہ ایسے کردار ہیں جو کئی جگہ کہانی کو اہم موڑ دیتے ہیں۔ مس جبین اول جو موسیٰ یسوی کی ننھی بیٹی ہے، جو فوجیوں کے ہاتھ اتفاق سے لگی گولی کا شکار ہونے کے بعد ناول میں متعارف کرائی جاتی ہے لیکن اس کی موت کہانی کا ایک اہم حوالہ بن جاتی ہے۔ گلریز بےوقوفی کی حد تک سیدھا سادہ، ایک معمولی کشمیری ہے جس کا تعلق موسیٰ کے آبائی گاؤں سے ہے اور وہ موسیٰ کے ساتھ رہتا ہے۔ موسیٰ کے دھوکے میں اس معصوم کا سفاکانہ قتل تلوتما کو نظریاتی طور پر کشمیریوں کی آزادی کی حامی اور سرگرم کارکن بنا دیتا ہے۔ امریک سنگھ حکومت کے جبر اور عوام کے خلاف سازشوں اور مظالم کا نمائندہ کردار ہے۔ اس کے وسیلے سے کشمیر میں جاری فوج کے مظالم کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ اور صدام حسین ایک ایسا دلت ہے جو گئو رکشکوں کی بھیڑ کے ہاتھوں اپنے باپ کے قتل کے بعد اپنا نام بدل کر صدام حسین بن جاتا ہے تاکہ اپنے باپ کے قاتل پولس افسر سے بدلہ لینے کے بعد عراقی صدر کے مانند ایک وقار سے اور بہادری کے ساتھ پھانسی کے تختے پر چڑھ جائے۔ مردہ گھر میں ملازمت سے لے کر گھوڑے کی نعلیں اور کبوتروں کا دانہ بیچنے کا آزاد کاروبار کرنے والے اس کردار کی زندگی ان ناداروں کے جہد روزگار کی علامت ہے جو دہلی جیسے شہر میں اس جیسی معمولی لیکن دشوار زندگی گزارتے ہیں، پھر بھی زندہ دلی سے جیتے ہیں۔ یہ سب وہ کردار ہیں جن کے بغیر ہندوستان کے سیاسی اور سماجی فضا کی یہ 'ٹوٹی بکھری کہانی' سنائی نہیں جاسکتی تھی۔

ایک اہم کردار وہ ننھی بچی ہے، جو دلی کے قلب، جنتر منتر میں جاری طرح طرح کی تحریکوں، حقوق انسانی کی لڑائی لڑنے والی تنظیموں کے جمگھٹوں کے احتجاجی دھرنوں کے عین وسط میں نمودار ہوئی۔ ''کوڑے کے پنگوڑے میں: سگریٹ کی چاندی جیسی پنیوں، پلاسٹک کی چند تھیلیوں، اور انکل چپس کے خالی پیکٹوں کے درمیان۔ وہ روشنی کے تالاب میں لیٹی تھی، نیون لائٹ میں جھلملاتے مچھروں کے جھنڈ میں، بالکل برہنہ۔'' (صفحہ ۱۰۳) اور تلوتما اسی لاوارث بچی کو لے کر فرار ہوگئی جسے بستر کے جنگلوں سے آنے والی ایک آدیباسی ماؤ نواز عورت چھوڑ گئی تھی، کیوں کہ وہ اس کی پرورش کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی تھی۔ تلوتما نے اس بچی میں مستقبل کو دیکھا، اس کا نام مس جبین رکھا، موسیٰ کی مقتول بیٹی کے نام پر۔ ''یہ بچی کسی چیز کی شروعات تھی... یہ بچی ضرور مِس جبینِ واپسیں ہے۔ وہ لوٹائی گئی ہے، لیکن اس کے پاس نہیں... بلکہ دنیا کے پاس۔ مس جبین دوئم جب بڑی ہو کر عورت بنے گی تو حساب برابر کرے گی...''۔ شاید اس پیغمبر کی طرح نجات دہندہ بنے گی جس کی ولادت پر فرشتوں نے حمدیں گائی تھیں، دانا لوگ تحفے لے کر آئے تھے۔

ڈاکٹر آزاد بھارتیہ جنتر منتر پر جاری احتجاجی دھرنوں کے ترجمان ہیں جو ہر طرح کی تحریکات کی حمایت میں 'گیارہ سال، دو مہینے، سترہ دن' سے بھوک ہڑتال پر بیٹھے ہیں۔ جنتر منتر پر جاری ساری گہما گہمیوں اور سرگرمیوں کے پرزم، اس عجیب و غریب کردار پر شاید کسی کو الگ ہی سے کوئی مضمون لکھنا چاہیے۔

ایسی کئی سیاسی شخصیات بھی اس ناول کا حصہ ہیں جن کے اصل نام نہ دیے جانے کے باوجود ان کی

صفات سے آپ ہر ایک کو صاف پہچان لیں گے۔ لکشمن کے کارٹونوں کی مانند اپنے آڑے ترچھے خطوط سے ہی یہ کردار خود بخود نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ذرا بوجھیں تو جانیں:

☆ یہ نیا ستارہ ایک گول مٹول [بچہ نما] بوڑھا گاندھی وادی تھا، سابق فوجی سپاہی اور حالیہ دیہات کا سماجی کارکن، جس نے ہندوستان کو کرپشن سے نجات دلانے کا اپنا خواب سچ کر دکھانے کے لیے آمرن اَن شن کا اعلان کیا تھا۔ وہ ایک بیمار سادھو کے سے ناز سے پھولا ہوا پشت کے بل لیٹا تھا، بھارت ماتا کے ایک پورٹریٹ کے سایے میں۔ (ص ۱۰۹-۱۰)

☆ اگروال جی ایک دبلے پتلے، ادھیڑ عمر آدمی تھے۔ مونچھیں ترشی ہوئی، سفاری شرٹ، ٹیری کاٹ کی پتلون اور گاندھی کیپ پہنے ہوئے، جس پر لکھا تھا: 'میں بھرشٹاچار کے خلاف ہوں، کیا آپ بھی ہیں؟' ان کے ہاؤ بھاؤ میں ایک کاٹ اور کسی بابو کا سا استحکام تھا، جو کچھ عرصہ پہلے تک وہ واقعی تھے بھی۔ انھوں نے اپنی کام کاجی زندگی کا بیشتر زمانہ ریونیو ڈپارٹمنٹ میں گزارا تھا۔ (ص ۱۲۸)

☆ سرد آنکھوں اور سیندور کے تلک والے وزیرِ اعلیٰ کو اگلے انتخابات میں کامیابی ملنے والی تھی۔ (ص ۲۷)

☆ یہ پندرہ اگست کا دن تھا، یومِ آزادی۔ چھوٹا سا سہما ہوا وزیرِ اعظم، جو تو تلے شاعر وزیرِ اعظم کی جگہ آیا تھا (وہ جس سیاسی پارٹی سے وابستہ تھا وہ اصولاً یہ نہیں مانتی تھی کہ ہندوستان ہندو راشٹر ہے)، لال قلعے کی فصیل سے قوم کو خطاب کر رہا تھا۔ (ص ۸۹)

اور ایک کردار اور ہے جس میں آپ خود اروندھتی رائے کو پہچان سکتے ہیں۔ حلیے سے لے کر اس کے طرزِ فکر تک۔ اس کو بوجھنے کے لیے ناول ہی پڑھ ڈالیے۔

یہاں قلم کو روکتی ہوں، اس کمنٹ کے ساتھ کہ یہ ناول 'بے پناہ شادمانی کی مملکت' اس وجہ سے بھی ہے کہ انجم نے قبرستان میں ایک نئی زندگی کا آغاز کیا، اپنی خود کفیل دنیا بنائی جس میں باہر سے آکر شامل ہونے والوں کے لیے ایک ہی شرط تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح زمانے کے ٹھکرائے اور ستائے ہوئے لوگ ہوں۔ یہ قبرستان ان سب کا مامن تھا، بیک وقت 'جنت گیسٹ ہاؤس' بھی اور 'کفن دفن مرکز' بھی۔ یہیں بالآخر تلو کو بھی پناہ ملی جس نے قبرستان کے ارد گرد بسنے والی جھگیوں کے بچوں کو پڑھانے کا کام شروع کر دیا۔ انجم کی اس 'مملکت' میں آکر تلوتما کو زندگی کے جو معنی ملے، جو 'شادمانی' ملی وہ اس زندگی کے مقابلے میں 'بے پناہ' تھی جس سے آج کا معاصر ہندوستان گزر رہا ہے۔ کیا یہ ستم ظریفی کی بات نہیں کہ ایک اجاڑ اور کھنڈر قبرستان ہی ایک نئی زندگی کے آغاز کا استعارہ بنایا گیا؟ یا یہ کہیں کہ موجودہ حالات میں قبرستان ہی ہے جو ہماری آخری پناہ گاہ بن سکتا ہے!!

قصہ اروندھتی رائے کے ناول کا

آصف فرخی

بات اتنی ہے کہ کتاب مجھے مل گئی۔ اس کتاب کو میں ہاتھوں میں لیے لیے یوں پھر رہا ہوں کہ غالب کے شعر والے غیر کا سا حال ہو گیا:

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

میں تو چاہتا ہوں کہ لوگ اد بدا کر پوچھیں۔ سو بار پوچھیں تو میں ایک بار بتاؤں۔ آپ چاہے مجھے اس شعر کے لحاظ سے غیر قرار دے دیں لیکن میں اس کتاب کے ساتھ سلوک وہ محبوب کے خط والا کروں گا۔

نہیں، غالب کے زمانے کا کوئی مخطوطہ میرے ہاتھ نہیں آ گیا ہے لیکن پتہ قریب قریب کا ہے غالب کے زمانے کی دہلی۔ ارون دھتی رائے کا نیا ناول میرے ہاتھ لگ گیا ہے، اسی لیے میں گھبرایا ہوا سا ہوں۔ کروں تو اب کیا کروں۔ جاؤں اور سب کو دکھلاؤں۔ لیکن میں یہ کیوں سوچ رہا ہوں۔ کتاب مل جاتی ہے تو اور کیا کرتے ہیں، اسے پڑھ ڈالتے ہیں، مگر اس کتاب کے ساتھ اتنی معمولی بات کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کا حاصل کر لینا اور اس وقت، یہ بھی کامیابی کی کوئی دلیل بن گئی ہے جس کا اس کی ادبی قدر و قیمت سے بس دور کا تعلق ہے۔

یہ اس کتاب سے پھیلنے والی سنسنی کا حصہ ہے۔ ایک بار آپ نے کتاب دیکھ لی تو پھر یہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گی۔ اس کے بعد کے مرحلے تو کتاب کی اپنی حیثیت پر منحصر ہوں گے اور یہ مرحلے بہت کڑے ہوتے ہیں۔

میں چھپا نہیں سکتا کہ اس کتاب کو حاصل کرنے کے لیے بیتاب ہو رہا تھا۔ بس کسی طرح مل جائے۔ پچھلے ہفتے لندن کی دکانوں میں پوچھ دیکھا۔ انھوں نے ٹکا سا جواب دے دیا کہ چھ جون کو بین الاقوامی اجرا ہوگا۔ اسی شہر میں آپ تب آیئے گا، اب ان سے کیا کہتا کہ اتنی دور سے میں کیسے آؤں۔ چنانچہ ہاتھ ملتا ہوا آ گیا۔ ساری دنیا کے میڈیا پر اس کتاب کی اشاعت جس طرح خبر بن رہی ہے، میں وہ بھی بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا ہوں۔ مصنفہ کی تصویر، بیانات، انٹرویو ذرا ذرا سے وقفے کے ساتھ سامنے آ رہے ہیں کہ

شوق کو مہمیز ملتی رہے۔ اس کے ساتھ لوگوں کی قیاس آرائیاں، چند ایک تبصرے۔ لندن کے 'گارجین' اخبار نے ابتدائی صفحات پہلے سے چھاپ دیے اور میں نے وہ فوراً کمپیوٹر سے پرنٹ کیے، بستر میں لیٹ کر اسی اہتمام سے پڑھ ڈالے جس طرح میں کوئی بھی اچھے سے اچھا ناول پڑھتا ہوں۔

مصنفہ کی تصویریں متاثر کن مگر انٹرویو بھی ایک سے ایک عمدہ۔ مان لیجیے کہ اسے گفتگو کا فن آتا ہے۔ اس کی ناول نگاری کے بارے میں آپ دو رائے رکھ سکتے ہیں مگر حالاتِ حاضرہ اور ناول کے فن کے بارے میں وہ اس طرح بات کرتی ہے کہ آپ توجہ دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ پھر خالی خولی چونکانا نہیں۔ اس میں گہری نکتہ آفرینی بھی خوب ہوتی ہے۔ دنیا کے بدلتے حالات اور اپنے ملک کی دگرگوں صورت کے بارے میں وہ کوئی لگی لپٹی نہیں رہتی۔ وہ جو کچھ بھی کہتی ہے، اسے لوگوں کی توجہ حاصل کر لینا آتا ہے۔ اور یہ کوئی معمولی فن نہیں۔

لوگوں کی قیاس آرائیاں سب کے اشتیاق کو بڑھاوا دے رہی ہیں۔ کسی کو یقین ہے کہ اس کے قلم سے شاہکار کے علاوہ کچھ اور نہیں نکل سکتا۔ ایک صاحب دوسروں کو باور کرا رہے ہیں کہ اب وہ ادب تخلیق کرنے کے کام سے گئی۔ فیس بک پر ہمارے ایک ادیب دوست نے ارشاد فرما دیا کہ ایسے ناول تو دنیا بھر میں روزانہ چھپتے رہتے ہیں، اردو میں بھی اچھے ناول چھپ رہے ہیں لیکن ان کو دنیا کی توجہ حاصل نہیں ہونے پاتی۔ چلیے صاحب، معاملہ ہی صاف ہو گیا۔ اس ناول کے بارے میں تمام خوش فہمی کا قلع قمع کر دیا؛ ظاہر ہے کہ کتاب کو پڑھے بغیر۔

اب تو ہم جیسوں کو بھی کتاب پڑھنے کا موقع مل گیا ہے۔ آٹھ سات چھ پانچ چار تین دو ایک؛ جس طرح فضا میں راکٹ چھوڑا جاتا ہے اسی طرح یہ کتاب بھی لانچ ہو گئی۔ اب اسے دنیا دیکھ سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ بہت کامیاب مارکیٹنگ کی حکمتِ عملی اس سارے سلسلے کے پیچھے کام کر رہی ہے۔ میڈیا پر ہائپ کس طرح قائم کیا گیا، اس میں تھوڑی تھوڑی انفورمیشن وقفے وقفے سے ریلیز کی گئی، لوگوں کی توقعات قائم کی گئیں، تجسّس کو بیدار کیا گیا.... یہ سب کتاب کے سامنے آنے سے پہلے۔ سب نے یہ قصہ سن لیا ہے کہ اس نامعلوم ہندوستانی خاتون کے پہلے ناول نے دھوم مچا دی۔ نامعلوم نام کو بین الاقوامی اسٹار بنا دیا۔ بُکر پرائز مل گیا اور بین الاقوامی حیثیت بھی۔ اس کے بعد وہ ایکٹی وزم کی جنگ لڑتی ہے۔ حکومت کے خلاف بات کرتی ہے اور بیس سال کے بعد اگلا ناول لکھتی ہے۔ ناول سے پہلے بنا بنایا قصہ تو آپ کو مل گیا۔

اس کے حلقۂ اثر میں آپ بھی آ گئے۔ جیسے مارکیٹ میں کوئی نئی پروڈکٹ لانچ کی جاتی ہے۔ چلیے، ہم اسی میں خوش ہیں کہ یہ سلوک کتاب کے ساتھ بھی برتا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کے چھپنے سے پہلے اس کی کامیابی کی تیاری کر لی گئی۔ یاد آیا انتظار صاحب ایک کتاب کے بارے میں یہ کہا کرتے تھے۔ چھپنے سے پہلے اس کا پروپیگنڈا شروع کر دیا گیا کہ آخر کار ایک عظیم ناول سامنے آ رہا ہے، انھوں نے کہا تھا اور اس مہم کے پیچھے اس کا ناشر تھا۔ اب اس کے بعد یہ بات محض ایک ضمنی تفصیل رہ جاتی ہے کہ انتظار صاحب کی عمومی ناپسندیدگی کے باوجود مجھے وہ کتاب اب بھی خاصی پسند ہے۔

میری اس رائے کو یہ کہہ کر وہ ایک طرف کر دیتے تھے کہ تم نے یہ سب نہیں دیکھا ہے، باقاعدہ تیاری کی گئی تھی عظمت کا ڈھول بجانے کے لیے۔

چلیے مان لیا۔ ناولوں کے قصے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں سب کچھ ممکن ہے، ہر بات قرینِ قیاس ہے۔ ارون دھتی رائے نے یہ ثابت کر دکھایا ہے۔

میرے اشتیاق کا یہی عالم تھا کہ دو چار دفعہ جا کر کتابوں کی اس دکان پر پوچھ آیا جہاں سے عام طور پر کتابیں خریدا کرتا ہوں۔ وہ ہر بار یہی کہتا، آئے گی تو بتا دیں گے۔ مگر اس نے آخر وقت تک بتایا نہیں۔

اس کیفیت میں آج پھر وہاں پہنچ گیا۔ کتابوں کی دکان نہ ہوئی محبوب کا کوچہ ہو گیا، کسی نہ کسی بہانے وہاں پہنچ جاتا۔ کاؤنٹر پر کوئی اور شخص بیٹھا ہوا تھا۔ چاروں طرف دیکھ لیا اور کتاب کی جھلک بھی دکھائی نہیں دی تو اس سے پوچھ بیٹھا۔

سر سے پاؤں تک مجھے گھور کر دیکھنے کے بعد اس نے پوچھا، ''آپ نے بکنگ کرائی ہے؟''

بکنگ؟ میں ہکلا کر رہ گیا۔ اگر بکنگ کرا سکتا تو پلاٹ کی نہ کرتا، بحریہ ٹاؤن کی بہتی گنگا میں ہاتھ خوب ہاتھ دھوتا۔

''آپ پرانے کسٹمر ہیں'' اس نے مجھ پر احسان جتاتے ہوئے کہا۔ ''یہ آخری دو کاپیاں رہ گئی ہیں، ان میں سے ایک اٹھا لیں۔''

اس نے بتایا کل جتنی کاپیاں نکالی تھیں، سب کی سب محض ایک گھنٹے میں بک گئیں۔ لوگ مانگتے ہوئے آئے اور ہاتھ ملتے ہوئے چلے گئے۔ وہ شکایت کرنے لگا کہ ہیڈ آفس سے جتنی کاپیاں مانگ رہے ہیں، اس کی آدھی ہماری برانچ کو الاٹ ہو رہی ہیں۔ اب کاپیوں کی ڈیمانڈ لکھوا دی ہے، تین چار دن کے بعد مل سکیں گی۔''

ڈیمانڈ اور سپلائی کی پوری کہانی اس نے مجھے سمجھا دی۔ لندن میں کتاب ریلیز ہوتی ہے اور کراچی میں بیسٹ سیلر بن جاتی ہے۔

کتاب سامنے ڈسپلے پر نہیں رکھی تھی۔ سیلز مین نے کسی دراز میں سے نکال کر دی۔ اور تھیلی میں رکھ کر کہ کسی کی نظر نہ پڑے؛ جیسے کتاب نہ ہو کوکین کی پڑیا ہو۔ ''لوگ دیکھ لیتے ہیں تو مانگنے لگتے ہیں۔'' وہ کہنے لگا۔

اپنے حصے کی کتاب تھام کر میں پلٹا تو یاد آیا آج فیس بک پر بینا سرور نے وڈیو کلپ لگایا ہے کہ جب ارون دھتی رائے ۲۰۰۲ میں کراچی آئی تھی تو آواری ہوٹل میں کیا زوردار تقریر کی تھی۔ میں بھی اس جلسے میں موجود تھا۔ پہلا ناول پڑھ کر جس قدر گرویدہ ہوا تھا، اس سے زیادہ اس تقریر کے بعد ہو گیا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان دو ضدی بچوں کی طرح پٹاخے پھوڑ چکے تھے اور اندوہ ناک تباہی کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ پاکستان کے سائنس داں نے ان شہروں کے نام گنوا دیے تھے جن کو چند سیکنڈ میں تباہ کیا جا سکتا تھا۔ میں ایسا سہم گیا کہ ایک ٹوٹی پھوٹی کتاب کا خاکہ جو کاغذ پر بن رہا تھا، خاک ہو کر اُڑ گیا۔ ''تخیّل کی موت'' کی دلیر اور

نڈر مصنفہ نے ببانگ دہل کراچی میں اعلان کیا کہ اگر اس کو کسی طرح پتہ چل جائے کہ اس کا ملک ہندوستان، پاکستان کے کس شہر کی جانب ایٹمی بم یا میزائل پھینک رہا ہے تو وہ پسند کرے گی کہ اس میزائل کو وصول کرنے کے لیے پاکستان میں موجود ہوں اور سامنا کریں۔ ہمارے آنسوؤں کی دھندلاہٹ تالیوں کی گونج کو نہ دبا سکی۔ پورا مجمع کھڑے ہو کر جانے کتنی دیر تک تالیاں بجاتا رہا۔

ایک کے بعد ناول تو اور نہیں آیا لیکن میں بڑے شوق سے ارون دھتی رائے کے مضامین پڑھتا۔ سرمایہ دارانہ نظام اور کارپوریٹ حرص و ہوس کے کتنے پہلو اس کی تحریر سے روشن ہو جاتے اور جدید ریاست کی ستم گری صاف ظاہر۔

یہ بھی کسی اخبار میں پڑھا کہ وہ گھنے جنگلوں میں جنگجو سورماؤں سے ملنے گئی ہے۔ ریاست کے جبر وتشدد کے خلاف اس کو احتجاج کرتے اور سینہ سپر ہوتے دیکھا۔ میں نے بڑی خوشی سے قبول کیا، جب شہ بانو علوی نے مجھ سے جنگل میں باغیوں سے ملاقات کا احوال اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے کہا۔ ترجمے کی شرط کڑی تھی۔ مصنفہ خود کسی سے پڑھوا کر سنیں گی اور فیصلہ کریں گی کہ ترجمہ ان کے معیار کے مطابق ہے۔ میری محنت وصول ہو گئی جب ان کی طرف سے اطلاع ملی کہ ترجمے کا کام جاری رکھیں، وہ اشاعت کے لیے منظور کر رہی ہیں۔

ان کو یاد بھی نہیں ہوگا کہ ایک اور موقعے پر ایک دوست کے فلیٹ میں بڑی عمدہ ملاقات ہوئی تھی جہاں وہ مختصر سفر کے دوران ٹھہری ہوئی تھیں۔ ان کے انداز میں سادگی تھی مگر گفتگو نہایت عمدہ۔ اس کے بعد ساری ملاقاتیں کتابوں میں ہوئی ہیں، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ان کے بارے میں باخبر ہوں۔ یہ ناول حاصل کرنے کے لیے بے تابی اسی وجہ سے تھی۔ اور اسی انتظار میں، میں اس کے بارے میں شائع ہونے والی خبریں پڑھتا رہا۔

ناول کی اشاعت سے پہلے ہی اس پر تبصرے آنے لگے۔ ایک سے ایک تعریفی، زیادہ تر رعب میں آ کر لکھے ہوئے۔ ایک آدھ تبصرہ کسی نے برا منھ بنا کر لکھا۔ بعض میں تو ایسا لگا کہ کتاب کے بجائے مصنفہ کے رویوں پر اعتراض کیا جا رہا ہے۔ آج ہی صبح کلیر میسیڈ (Claire Messud) کا تبصرہ پڑھا جو خود ذہین و زیرک ناول نگار ہیں۔ انھوں نے پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے دو چار دھموکے بھی جڑ دیے ہیں۔

ان اخباری تبصروں کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کی ضرورت نہیں، میں نے سوچا۔ ناول تو بہرحال پڑھ کر دیکھوں گا۔ اس کا ناول کچھ اور نہیں تو سنجیدگی سے پڑھے جانے کا تقاضا کرتا ہے۔ زبان و بیان پر اسے غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ اس بار موضوع ایسا ہے کہ میرے لیے بہت اہم ہو گیا ہے؛ پرانی دلّی، محلے اور عمارتیں، ہندوستانی مسلمان، کشمیر کی جدوجہد، معاصر صورت حال کے خلاف احتجاج کے انداز۔ کسی کا یہ اعتراض بھی نظر سے گزرا کہ ناول کا بہت گہرا تعلق مصنفہ کے ایکٹی وزم سے ہے اور اپنی اس عملی دل چسپی کو انھوں نے ناول میں ٹھونس دیا ہے۔ پتہ نہیں ہم ایکٹی وزم کو گالی کیوں سمجھنے لگے ہیں۔ میں تو یہ ضرور دیکھنا چاہتا ہوں کہ ارون دھتی رائے نے ان سماجی معاملات کو ناول میں کیسے ڈھالا۔ ناول کی فارم میں ان معاملات سے

نمٹنے کے لیے گنجائش کیسے پیدا کی۔ اس نے ناول کو کیا سے کیا بنا ڈالا، یہ بھی دیکھنے کی بات ہے۔

اس بھاگ دوڑ کے بعد ناول تو میں نے حاصل کر لیا ہے۔ اس کے بارے میں اپنی رائے پکی سیاہی سے لکھ دی ہے۔ خدا نے چاہا تو ایک نہ ایک دن یہ ناول پڑھ بھی لوں گا۔ لیکن یہ ارون دھتی رائے کے ناول کے قصے میں ایک ضمنی تفصیل ہے۔

ناول کم، سیاست نامہ زیادہ

شیخ نوید

''بے پناہ شادمانی کی مملکت'' کی کہانی مختلف ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے، جیسے کسی سانحہ میں شیشہ کا کوئی بڑا ٹکڑا ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا ہو، کچھ ٹکڑے خون آلود ہیں، کچھ کو جوڑنے میں قارئین کا تخیل خون آلود ہو جاتا ہے۔ کرداروں کی بھرمار ہے۔...

بظاہر ''بے پناہ شادمانی کی مملکت'' ہمیں ایک ناول کم اور سیاست نامہ زیادہ نظر آتا ہے، درمیان میں پلاٹ غائب ہو جاتا ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ ارون دھتی رائے اپنے مضامین کے طریقہ کار کے مطابق معلومات کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کو جوڑ کر کوئی حساس بیانیہ تشکیل دینا چاہتی ہیں۔ ایک موقع پر میرا سانس بھی اکھڑنے لگا، مجھے لگا کہ ناول کے سیاسی فضا نے فکشن کی سرحدوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے لیکن پھر ناول کے بیانیے نے پلٹا کھایا، وہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات جسے میں 'سیاسی ٹوٹے' سمجھ کر غیر اہم سمجھ رہا تھا، اپنی معنویت آشکار کرنے لگے، کڑیوں سے کڑیاں لگیں اور پلاٹ نے کاملیت کا اشارہ دیا۔

کوئی شک نہیں کہ ارون دھتی رائے نے ''بے پناہ شادمانی کی مملکت'' کے ذریعے ایک ایسے معاشرے کا المیہ لکھا جس میں انسان اپنے بنیادی حق، جینے کے حق کو قائم رکھنے کے لیے کوشاں ہے، جرأت مندی اور بہادری کے الفاظ ارون دھتی رائے کے عظیم کارنامے کے سامنے چھوٹے ہیں۔

آخری بات، ناول میں بعض پاکیزہ نقادوں کے بقول 'بازاری زبان' کا وافر مقدار میں استعمال کیا گیا ہے، ایک باوضو قاری کو یہ گالیاں ایمانی کشمکش سے دوچار کر سکتی ہیں۔ بطور نمونہ صرف ایک شعر لکھوں گا جو ناول میں دو دفعہ استعمال ہوا ہے اور میرے خیال سے ناول کا فلسفہ بھی اسی شعر میں بند ہے۔ اب اس شعر میں بلبل، قفس، صیاد اور فصل بہار سے کیا مراد ہے، اس کے لیے آپ کو ناول پڑھنا پڑے گا۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

مر گئی بلبل قفس میں کہہ گئی صیاد سے
اپنی سنہری گانڑ میں تو ٹھونس لے فصل بہار

اروندھتی رائے کا ناول اور محمد سلیم الرحمٰن

محمود الحسن

کسی عالم کی صحبت میں بیٹھ کر بندۂ خاکی کو علم کی مد میں جو کچھ ملتا ہے، بہت سی کتابیں اس کا بدل نہیں ہوسکتیں۔ محمد سلیم الرحمٰن ایک ایسے ہی عالم ہیں۔ یہ خوبیِ قسمت پر ناز کی جا ہے کہ ان سے ہماری گاہے کی ملاقات نہیں بلکہ آئے روز کا ملنا ہے۔ ان کے پاس جو بھی جاتا ہے، خالی ہاتھ نہیں لوٹتا، دولت علم سمیٹ کر اٹھتا ہے۔ کتاب ان کی زندگی کا محور ہے، ان کے ساتھ نشست میں اسے ہی مرکزی حیثیت حاصل رہتی ہے۔ چند دن پہلے ان کے یہاں جانا ہوا تو جانا کہ وہ ارون دھتی رائے کا نیا ناول "The Ministry of Utmost Happiness" پڑھ چکے ہیں۔ اس پر تھوڑی حیرت بھی ہوئی کہ ابھی تو اس ناول کو پڑھ لینے کی ان احباب کی طرف سے بھی اطلاع موصول نہیں ہوئی جو کسی دھوم مچا دینے والے ناول کو جھٹ سے پڑھ جاتے ہیں اور پھر اس کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں اور اب تو اکثر کو فیس بک کی صورت میں عالمگیر ڈھول بھی میسر ہے، جس کے ذریعے آن کی آن میں یہ خبر کہ فلاں کتاب آپ کے زیرِ مطالعہ ہے اور فلاں آپ چاٹ چکے ہیں، چار دانگ عالم میں پھیل جاتی ہے۔ سلیم صاحب کی طبیعت میں ایک ٹھہراؤ اور کسی سے بازی نہ لے جانے کی جو خو ہے، وہ ان کے شوقِ مطالعہ میں بھی ساتھ چلتی ہے، نئی کتابوں کے بارے میں انھیں چیٹک تو بہت رہتی ہے لیکن وہ سب سے پہلے کی دوڑ میں شامل نہیں ہوتے۔ کوئی کتاب اپنے مطالعے کے واسطے منتخب کرلیں اور ان کا کوئی دوست اسے پڑھنے کی خواہش ظاہر کردے تو وہ بڑی فراخ دلی سے اسے دان کردیں گے۔ یہ ان کا بڑاپن ہے اور ہم جیسوں کے شوق مطالعہ کی دھیمی لو اونچی کرنے کا طریق بھی۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، دراصل ہمیں سلیم الرحمٰن صاحب سے ارون دھتی رائے کے نئے ناول سے متعلق ہونے والی غیر رسمی گفتگو میں پڑھنے والوں کو شریک کرنا ہے۔ ارون دھتی رائے کی ایک بیباک لکھاری ہونے کے باعث وہ بڑی قدر کرتے ہیں۔ ان سے ہم نے کئی دفعہ سنا کہ بڑا فکشن بڑی نثر کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔ فکشن میں زبان کی اہمیت کو وہ باقی چیزوں سے مقدم جانتے ہیں۔ اس لیے انھیں ''گاڈ آف سمال تھنگز'' پسند آیا تھا جس میں ان کی دانست میں زبان کا خلاقانہ اظہار ہوا، یہ وہ خوبی ہے جو ہند

سندھ کے انگریزی لکھنے والوں میں شدہ شدہ ہی ان کو نظر آتی ہے۔ ان سے ہم نے ارون دھتی رائے کے پہلے اور بیس سال بعد آنے والے اس دوسرے ناول میں زبان کے تخلیقی استعمال سے متعلق فرق کے باب میں پوچھا تو بتایا؛ ''نثر میں اتنی کاٹ نہیں جتنی پہلے ناول میں تھی، کہیں کہیں جملے جگمگا اٹھتے ہیں اور دل کو چھیڑتے ہیں لیکن مجموعی تاثر اعلیٰ درجے کی صحافت کا ہے۔'' سلیم صاحب کو مصنفہ کے اردو سے واقفیت بڑھنے پر خوش گوار حیرت ہوئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ناول میں اردو کے کئی اشعار شامل ہیں جن میں میر تقی میر کا یہ معروف شعر بھی ہے:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

عبداللہ حسین پر تو الزام ہی ہے کہ انھوں نے ''اداس نسلیں'' میں گالیاں بہت لکھی ہیں۔ یہ بات کرنے والوں میں ایک اردو اخبار میں کالم لکھنے والی افسانہ نگار بھی ہیں جن کے بقول ''اداس نسلیں کی دھوم مچی ہوئی تھی لیکن اسے پڑھ کر مجھے لطف نہیں آیا۔ سب سے زیادہ کوفت اس بات سے ہوئی تھی اس میں ہر صفحے پر مسجع مقفیٰ گالیوں کی بہار تھی۔'' ان محترمہ کے پاس نہ جانے ''اداس نسلیں'' کا کون سا ایڈیشن ہے جس کے ہر صفحے پر گالیوں کی بہار ہے، ہم نے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن بھی دیکھ رکھا ہے اور تازہ بھی، ہم کو تو اس کے ہر صفحہ پہ گالیاں دکھائی نہیں دیں البتہ "The Ministry of Utmost Happiness" میں سلیم الرحمٰن صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ واقعتاً گالیاں ہیں۔ سلیم صاحب کو پہلی قرأت میں یہ ناول کئی حصوں میں بٹا ہوا محسوس ہوا اور جوڑ اتنے الگ الگ کہ اس میں وحدت کی تلاش مشکل معلوم ہوتی ہے۔ اس بات کا احساس ان کی دانست میں شاید مصنفہ کو بھی ہے؛ ''ایک ٹکڑے ٹکڑے کہانی کو کیسے بیان کیا جائے؟''

اس مسئلہ کا تسلی بخش جواب ان کے خیال میں شاید دوسری خواندگی میں سامنے آئے۔ کہانی کا بیان کیسے آگے بڑھتا ہے، اس بابت پوچھا تو بتایا؛ ''دہلی کے ایک قبرستان میں ایک ہیجڑے نے چھوٹی سی بستی آباد کی ہے، اس میں دنیا بھر کے دھتکارے ہوئے لوگ پناہ لے سکتے ہیں؛ صرف انسانوں ہی کی نہیں، جانوروں اور پرندوں کی بھی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ گویا یہ دکھانا مقصود ہے کہ ان بے نوا لوگوں کے درمیان زیادہ انسانیت، ہمدردی اور خوشی موجود ہے۔ کوئی جگہ جسے گھر سمجھا جاسکے۔ دوسری طرف بھارتی فوج اور حساس ادارے کشمیر میں جو ظلم و ستم روا رکھے ہوئے ہیں، وہ اس بستی کے پیشِ نظر، بالکل متضاد منظر دکھاتا ہے بلکہ تضاد کچھ زیادہ ہی نمایاں ہوجاتا ہے۔ چھتیس گڑھ کے صوبے میں سرکاری آمریت کے خلاف، جس کے تانے بانے عالم گیر تاجرانہ مفادات سے جڑے ہیں، جو جدوجہد جاری ہے اس کا ذکر بھی آگیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا خطہ کسی ٹگر پر کھڑا ہے، کسی نئی ٹوٹ پھوٹ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ افلاس، ناانصافی، تشدد اور تضاد کے تمام مظاہر خطرے کے نشان سے اوپر نظر آرہے ہیں۔''

محمد سلیم الرحمٰن کا خیال ہے کہ کشمیر میں بھارتی ظلم و تشدد کا جو نقشہ ناول میں کھینچا گیا ہے اس سے دنیا میں رائے عامہ پر اثر پڑسکتا ہے اور اس اعتبار سے نظر ڈالی جائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ناول وہ کچھ کرسکتا ہے

جو پاکستان کی خارجہ پالیسیاں یا دفتر خارجہ کی کارکردگی ستر سال میں نہ کر سکی۔ ان کے بقول ''البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ کوئی خاطر خواہ نتیجہ سامنے آئے گا کہ نہیں۔'' انھوں نے بتایا کہ عالمی ضمیر محض واہمہ ہے، ضمیر افراد کا ہو سکتا ہے، اور ہوتا ہے، دنیا کا نہیں۔ ان کے بقول ''ملکوں، قوموں، مذہبوں اور زبانوں میں بٹی ہوئی دنیا کا، طرح طرح کے مفادات میں جکڑی ہوئی دنیا کا ضمیر؟ خود کو یا دوسروں کو فریب دینے کے لیے اس کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔'' وہ سمجھتے ہیں کہ مصنفہ کی نیت بخیر ہے، ناول کی عمر کتنی ہوگی اس کی ابھی خبر نہیں۔ انھوں نے ایستونیا کے ایک کم معروف لیکن بہت قابل قدر ناول نگار جان کروس کے ایک ناول سے یہ برمحل عبارت سنائی ''جہاں قومیں اپنی داخلی زندگیوں میں شہریوں کو ایسے حقوق عطا نہیں کرتیں جن سے انھیں کبھی محروم نہ کیا جا سکتا ہو تو ہمیں نہ عدالتی نظم وضبط نصیب ہوگا نہ بین الاقوامی معاملوں میں قانون کا کوئی احترام۔'' جوزف کانریڈ کے بے مثل ناول "Heart of Darkness" کا ''قلب ظلمات'' کے عنوان سے ترجمہ سلیم صاحب کے قلم سے ہے، اس کے تعارفی مضمون کے آخر میں انھوں نے ایک بڑی پتے کی بات لکھی ہے، اسی پر ہم اپنی بات ختم کرتے ہیں، ''جو لوگ اپنے عہد کے ضمیر کی گہرائیوں میں اتر کر پیش گوئی کرتے ہیں کہ برے دن آنے والے ہیں ان کی دانائی پر کوئی کان نہیں دھرتا۔''

بیٹھا جائے اور لکھا جائے

اروندھتی رائے

میرا بیان بے ربط ہو جاتا ہے جب میں بیان کرنے کی کوشش کرتی ہوں، کیوں کہ جو میں کر رہی ہوتی ہوں وہ آورد سے زیادہ آمد ہوتی ہے۔ میرا بیانیہ جس ساختیاتی راستے سے اپنے آپ کو کھولتا ہے، وہ میرے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ...اب جب میں اس لکھنے کے عمل میں ہوں، میں واقعی اسے ایک تھیوری کی شکل میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ میرے لیے اسے بیان کرنا یا سمجھنا بالکل ہی مشکل ہے۔ میں کہوں گی کہ بہت اہم یہ ہے کہ بیٹھا جائے اور لکھا جائے۔ پھر میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ کتاب تو ہمیشہ وہاں ہوتی ہے۔ یہ میوزک کی طرح ہے جو پہلے سے ہی آپ کے دماغ میں بج رہا ہوتا ہے۔...

جب آپ کو یوں لگتا ہے کہ جیسے ایک کہانی نے آپ کو اپنا معمول بنا رکھا ہے نہ کہ آپ نے کہانی کو، تو آپ منتظر رہتے ہیں کہ یہ آپ کو جاننے کی اجازت دے کہ اسے کیسے بیان کرنا ہے۔ یہ میری سوچ کے ہر ایک دائرے کو خود پر مرکوز کراتی ہے اور میں اس کی بے انتہا شکر گزار ہوں۔ یہ بہت خوب صورت شے ہے۔ اس کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ آپ ایک حیران کن کہانی لکھ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو بلکہ اس کا صرف اتنا سا مطلب ہے کہ کوئی چیز ایسی ہو سکتی ہے جو آپ کو مکمل طور پر اپنے ساتھ مشغول رکھے۔ یہ ایک عطیہ ہے۔

ثروت حسین کی غزلیں

ثروت حسین کی تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۹۴۹ ہے۔ وہ ایک خوش گو شاعر تھے اور اپنا ایک جداگانہ اسلوب رکھتے تھے۔ ان کا پہلا مجموعہ ''آدھے سیارے پر'' ۱۹۸۹ میں شائع ہوا تھا جس کی ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی تھی۔ ان کا دوسرا مجموعۂ کلام ''خاک دان'' ان کی وفات کے بعد ۱۹۹۸ میں اشاعت پذیر ہوا۔ ثروت حسین نے ۹ ستمبر ۱۹۹۶ کو کراچی میں ٹرین کے نیچے آ کر خودکشی کر لی تھی، یہ ان کی تیسری کوشش تھی۔

ثروت حسین کی غزلوں اور نظموں کا اسلوب نہایت الگ اور دلچسپ ہے۔ آئندہ صفحات پر ان کی کچھ غزلیں قارئین کی نذر ہیں۔ آئندہ کسی شمارے میں ان کی نظمیں بھی شامل کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ غزلوں کو پڑھ کر شاعر کے یہاں موجود کسی خاص قسم کے نظریے کو قائم کیا جائے، کیونکہ اکثر شاعر غزل کی دیرینہ اور پکی پکائی شعریات سے کام چلا کر خود کی ہی تردید اور تائید کرتا رہتا ہے اور مضمون آفرینی کے چکر میں ادھر اُدھر کی ہانکتا رہتا ہے، لیکن ثروت کے یہاں ایسا نہیں ہے، ان کے یہاں دنیا کو سمجھنے، اسے جاننے اور پہچاننے کی کوشش اور ایک قسم کا ذہنی اضطراب ان غزلوں میں ہر جگہ صاف دکھائی دیتا ہے اور کہیں کہیں یہ رجحان پوری غزل میں متواتر موجود رہتا ہے۔

بقول سہیل احمد، ''ثروت حسین کا تعلق اس شعری دائرے سے ہے، جہاں چھوٹی چھوٹی تصویریں کسی وضاحتی طوالت کے بغیر، اپنے اندر احساساتی اشاریت کو سمیٹ لیتی ہیں۔ ایسی شاعری کی تفہیم کے لیے شاعر کی مخصوص شعری زبان، اس کے رویے کی وحدت اور اس کی تمثالوں کے جھرمٹ کی بدلتی ہوئی رنگا رنگ کیفیتوں کو دھیان میں رکھنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیقی طور پر ثروت حسین نے منیر نیازی، ناصر کاظمی، محمد سلیم الرحمن اور کہیں کہیں مجید امجد کے بعض شعری عناصر اور احمد مشتاق سے ذہنی قربت محسوس کی ہے۔'' (مدیر)

گھر سے نکلا تو ملاقات ہوئی پانی سے
کہاں ملتی ہے خوشی اتنی فراوانی سے

خوش لباسی ہے بڑی چیز مگر کیا کیجے
کام اس پل ہے ترے جسم کی عریانی سے

سامنے اور ہی دیوار و شجر پاتا ہوں
جاگ اٹھتا ہوں اگر خواب جہانبانی سے

عمر کا کوہ گراں اور شب و روز مرے
یہ وہ پتھر ہے جو کٹتا نہیں آسانی سے

شام تھی اور شفق پھوٹ رہی تھی ثروت
ایک رقاصہ کی جلتی ہوئی پیشانی سے

غنچہ و گل کا شمار سب کے لیے کیوں نہیں
دامن ابر بہار سب کے لیے کیوں نہیں

چشمۂ آب صفا تیرے تصرف میں کیوں
اے مرے ناقہ سوار سب کے لیے کیوں نہیں

باغ کی بنیاد میں سب کا لہو ہے تو پھر
ذائقۂ برگ و بار سب کے لیے کیوں نہیں

چند گھرانوں تلک تیرے کرم کی جھلک
جنبش ابروے یار سب کے لیے کیوں نہیں

تیری عنایت کے در مجھ پہ کھلے ہیں مگر
اے مرے پروردگار سب کے لیے کیوں نہیں

بھر جائیں گے جب زخم تو آؤں گا دوبارا
میں ہار گیا جنگ مگر دل نہیں ہارا

روشن ہے مری عمر کے تاریک چمن میں
اس کنج ملاقات میں جو وقت گزارا

اپنے لیے تجویز کی شمشیر برہنہ
اور اس کے لیے شاخ سے اک پھول اتارا

کچھ سیکھ لو لفظوں کو برتنے کا سلیقہ
اس شغل میں گزرا ہے بہت وقت ہمارا

لب کھولے پری زاد نے آہستہ سے ثروت
جوں گفتگو کرتا ہے ستارے سے ستارا

میری کشتی ٹوٹ رہی ہے سر سے اونچا پانی ہے
پانی کاٹتے جیون بیتا، پھر بھی کتنا پانی ہے

تم بھی خوش ہو اپنے گھر میں اور میں اپنے سمندر میں
اپنی اپنی مٹی ہے اور اپنا اپنا پانی ہے

تم اک ندی تم اک دریا اس سے آگے کیا ہو تم
جتنا تم نے سوچ رکھا ہے اس سے زیادہ پانی ہے

کھلا سمندر میرا گھر ہے میری قبر بھی ہو تو کیا
بازوؤں جیسی لہریں ہیں اور آنکھوں جیسا پانی ہے

اتنی سچی، ایسی مکمل تنہائی کب دیکھی تھی
دور دور تک کوئی نہیں ہے، سورج ہے یا پانی ہے

جانے عمر کے کس حصے میں اس پر یہ احوال کھلے
اس کی کہانی مٹی ہے اور میرا قصہ پانی ہے

اک لڑکی کا چہرہ ثروت دل کی تہوں میں تیر گیا
ٹوٹتے بنتے ساحل ہیں اور جھاگ اڑاتا پانی ہے

یہ ہونٹ ترے ریشم ایسے
کھلتے ہیں شگوفے کم ایسے

یہ باغ چراغ سی تنہائی
یہ ساتھ گل و شبنم ایسے

مری دھوپ میں آنے سے پہلے
کبھی دیکھے تھے موسم ایسے

کس فصل میں کب یکجا ہوں گے
سامان ہوئے ہیں بہم ایسے

سینے میں آگ جہنم سی
اور جھونکے باغ ارم ایسے

ہاتھ ہمارے بھی شامل تھے پر بت کاٹنے والوں میں
دیکھو ہم نے راہ بنائی بے ترتیب سوالوں میں

رات اور دن کے الجھاؤ میں کون ہے وہ آہستہ خرام
جس کے رنگ ہیں دیواروں پر جس کی گونج خیالوں میں

دروازوں میں لوگ کھڑے تھے اور ہماری آنکھوں نے
پانی کا چہرہ دیکھا تھا مٹی کی تمثالوں میں

کنج خزاں آثار میں ثروت آج یہ کس کی یاد آئی
ایک شعاع سبز اچانک تیر گئی پاتالوں میں

وصل کی شام گلستاں پھر اسی شعلہ رو سے ہے
رنگ ستون و سقف و بام آمد ہم سبو سے ہے

بہجت بے مثال میں ایک ملال کی جھلک
یا مری خامشی سے تھی یا تری گفتگو سے ہے

رزم گہ وجود میں آنکھ جھپک نہیں سکی
یورش باد واپسیں مجھ پہ چہار سو سے ہے

موسم ابر و باد میں اور بھی کچھ چمک اُٹھا
سنگ سفید جابجا سرخ مرے لہو سے ہے

جنبش برگ بے خزاں آمد و رفت کا سماں
وسعت ریگزار میں موجۂ آبجو سے ہے

آنکھوں میں سوغات سمیٹے اپنے گھر آتے ہیں
بجرے لاگے بندرگاہ پہ سوداگر آتے ہیں

زرد زبور تلاوت کرتی ہے تصویر خزاں کی
عین بہار میں کیسے کیسے خواب نظر آتے ہیں

گندم اور گلابوں جیسے خواب شکستہ کرتے
دور دراز زمینوں والے شہر میں در آتے ہیں

شہزادی تجھے کون بتائے تیرے چراغ کدے تک
کتنی محرابیں پڑتی ہیں کتنے در آتے ہیں

بند قبائے سرخ کی منزل ان پر سہل ہوئی ہے
جن ہاتھوں کو آگ چرا لینے کے ہنر آتے ہیں

شہزاد ہیں گلیوں کی پہچان بھی رکھتے ہیں
اور بھٹکتے رہنے پر ایمان بھی رکھتے ہیں

رستہ رستہ اُگنے والے یہ ہم شکل درخت
دھوپ میں ہیں اور ہم جیسوں کا دھیان بھی رکھتے ہیں

دور افتادہ ویرانوں پر لہراتے بادل
اک دہلیز سے کچھ عہد و پیمان بھی رکھتے ہیں

اندیشوں میں جھلنے والے دلوں کے یہ دالان
خوابوں اور خیالوں کو مہمان بھی رکھتے ہیں

رات کی رات چمکنے والے آسمان کے رنگ
دیواروں کو صدیوں تک حیران بھی رکھتے ہیں

اچھا سا کوئی سپنا دیکھو اور مجھے دیکھو
جاگو تو آئینہ دیکھو اور مجھے دیکھو

سوچو یہ خاموش مسافر کیوں افسردہ ہے
جب بھی تم دروازہ دیکھو اور مجھے دیکھو

صبح کے ٹھنڈے فرش پہ گونجا اس کا ایک سخن
کرنوں کا گلدستہ دیکھو اور مجھے دیکھو

بازو ہیں یا دو پتواریں ناؤ پہ رکھی ہیں
لہریں لیتا دریا دیکھو اور مجھے دیکھو

دو ہی چیزیں اس دھرتی پہ دیکھنے والی ہیں
مٹّی کی سندرتا دیکھو اور مجھے دیکھو

زین

ژولیاں

ژولیاں اردو کے فرانسیسی نژاد افسانہ نگار ہیں جو اردو کے ساتھ ساتھ ہندی، سنسکرت، پنجابی اور سرائیکی بھی جانتے ہیں۔ ژولیاں کا پورا نام ’ژولیاں کولومؤ‘ (Julien Columeau) ہے۔ ژولیاں ۱۹۹۳ میں فرانس سے ہندوستان آئے جہاں انھوں نے ہندی سیکھی، وہ بتاتے ہیں؛ ’’تب تک مجھے ہندی میں بات کرنا آ گیا تھا اور مجھے ایک کتاب ملی جس میں بتایا گیا تھا کہ اردو کو ہندی میں کیسے ترجمہ کرنا ہے۔ پھر میں اردو پڑھنے کی مشق کرتا رہا اور کوئی ایک سال بعد مجھے اردو پڑھنا آ گیا تھا۔‘‘ بعد ازاں، ژولیاں انٹرنیشنل کمیٹی آف ریڈ کراس کے ساتھ پاکستان منتقل ہو گئے جہاں وہ زیادہ تر بحران زدہ علاقوں میں بطور مترجم کام کرتے رہے۔ اردو میں انھوں نے پہلا ناول ساغر صدیقی کے بارے میں لکھا جو ۲۰۱۰ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک ناول ’زلزلہ‘ کے نام سے لکھا جس کا ایک حصہ ’دنیا زاد‘ میں شائع ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے تیسرا ناول ’’میرا جی کے لیے‘‘ کے عنوان سے لکھا جو اجمل کمال کے ’آج‘ میں شائع ہوا۔ اس ناول پر انتظار حسین کا کہنا تھا، ’’ژولیاں کی نثر جس میں جنسی مناظر کو کھول کھول کر بیان کیا جاتا ہے اور کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر منشیات کے استعمال کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں، اردو کے اس روایتی طرز بیان سے ہٹ کر ہے، جس میں اس طرح کی باتوں کو سات پردوں میں چھپا کر بیان کیا جاتا ہے۔‘‘ ژولیاں کا ایک اور معروف ناول ’’میر جعفری شہید‘‘ بھی ’آج‘ نے شائع کیا۔

لیکن یہ حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ (کم از کم میرے علم کے مطابق) ہندوستان کے کسی ادبی رسالے میں ژولیاں کا نام نظر نہیں آتا۔ یہ بے حسی اور بے خبری نئی نہیں ہے۔ آج سے آٹھ سال قبل تک علی اکبر ناطق بھی اسی بے توجہی کا شکار رہ چکے ہیں، ’اثبات‘ نے ہی انھیں ہندوستانی قارئین سے متعارف کرایا تھا۔

ژولیاں ان دنوں ماسکو میں قیام پذیر ہیں۔ ایک دوست کے توسط سے میری فرمائش پر انھوں نے اپنی کئی کہانیاں بھیجیں جن میں سے دو کہانیاں پیش خدمت ہیں۔ (مدیر)

لارنس روڈ کے اس طرف ایک میدان ہے جہاں شہر کے باسی تفریح کی خاطر اکثر شام کو آتے ہیں۔ میدان بڑا سرسبز ہے اور اس کی گھاس پر بیٹھ کر خاندان پکنک مناتے ہیں، عاشق اپنی سیلفیاں بناتے ہیں، شاعر حضرات ایک دوسرے کو اپنا کلام سناتے ہیں اور مشٹنڈے تاش کھیلتے ہیں۔ میدان کے بیچ میں کچھ کھنڈر کھڑے ہیں؛ بہت انوکھے کھنڈر، جنھیں دیکھ کر ایسے لگتا ہے جیسے قدیم زمانے میں اس جگہ ایک الف لیلوی محل کھڑا تھا جسے کسی بدنیت ساحر نے برباد کر دیا۔ شام کو اس میدان میں بڑی رونق ہوتی ہے۔ پاپڑ والے، آئس کریم والے، مونگ پھلی والے میدان میں اپنی ریڑھیاں سجاتے ہیں اور غباروں والے ان کے آس پاس چلتے پھرتے اپنا مال بیچتے ہیں۔ خاندان، عاشق، شاعر، مشٹنڈے پورے میدان میں پھیل چکے ہیں، اور ان خاندانوں کے بچے کھنڈرات میں چھپن چھپائی کھیلتے ہیں۔ تمام لوگ اس واقعے سے بالکل انجان لگتے ہیں جو ایک سال پہلے یہاں رونما ہوا تھا۔ ایک سال پہلے مصور زین کی کوٹھی یہاں موجود تھی۔ رات کو کوٹھی میں آگ لگ گئی جس نے کوٹھی کو برباد کر دیا؛ کوٹھی کالے کھنڈروں میں تبدیل ہوگئی۔

زین کی کوٹھی میں آگ کیسے لگی؟ اِس سوال کا جواب کسی آدمی کے پاس نہیں ہے۔ بس لوگ اتنا ہی جانتے ہیں کہ آگ رات کے دو بجے لگی تھی۔ زین اس وقت کوٹھی میں موجود تھا اور وہ کوٹھی سے باہر نہیں آ سکا تھا۔ وہ اپنی کوٹھی کے ساتھ ہی جل مرا تھا۔ فائر بریگیڈ تین بجے کوٹھی پر پہنچا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ آگ صبح تک بجھ گئی؛ اور جب بجھی تو نہ زین باقی تھا نہ کوٹھی۔ یہ بات سننے میں آئی کہ کوٹھی میں زین کی بے شمار قیمتی تصویریں موجود تھیں جو اپنے خالق کی طرح اس خوفناک حادثے میں جل گئیں۔ سننے میں یہ بھی آیا کہ پولیس نے کچھ دنوں تک اس حادثے کی تفتیش کی مگر وہ کسی ٹھوس نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ شروع میں لینڈ مافیا کے دو بدمعاشوں کو آتش زنی کے الزام میں پکڑا گیا تھا؛ مگر انھیں جلد ہی رہا کر دیا گیا اور تفتیش ختم ہوگئی۔

زین بین الاقوامی شہرت کا حامل ایک مصور تھا؛ مگر اس کی تصویروں نے مجھے کبھی متاثر نہیں کیا۔ میں ایک صحافی ہوں اور بارہ برس سے اپنے اخبار کے لیے اس شہر کے فنکاروں اور نمائشوں کے بارے میں تبصرے لکھتا ہوں۔ زین کی بہت سی تصویریں میری نظر سے گزری ہیں؛ مگر اس کی کوئی تصویر ایسی نہیں جسے میں یادگار یا دلچسپ کہہ سکوں۔ اس کی برہنہ رقاصائیں اور بنجارنیں مجھے مری مری سی لگتیں، اور اس کی تجریدی خطاطی کے نمونے مجھے پھیکے پھیکے دِکھائی دیتے۔ میرے خیال میں زین ایک کاروباری مصور تھا، جس کی تصویروں کو شہر کے بدذوق، نودولتیے بہت پسند کرتے تھے۔ ان لوگوں کی چمکیلی، رنگ برنگ بیٹھکوں میں وہ شوخ اور سجاوٹی تصویریں یقیناً فٹ ہو جاتیں۔ شروع شروع میں زین ایک سچا اور عمدہ تخلیق کار تھا۔ میں نے ایک بار ایک کلیکٹر کے پاس جوانی میں بنائی گئی اس کی ایک تصویر دیکھی تھی، جس کا انداز Cubistic تھا اور وہ مجھے بڑی مضبوط لگی تھی، مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس طرح کی تجرباتی تصویریں بنانے کے بعد زین مصوری کی مارکیٹ کے گھیرے میں آ گیا اور اس کا فن کاروباری ہوگیا۔ اس کی تخلیقیت ختم ہوگئی۔

زین کی شخصیت اتنی نرالی تھی کہ وہ اس کی مصوری کو پس پشت ڈال دیتی تھی۔ اسی باعث شہر کے علمی حلقوں میں؛ عام طور پر، اس کی مصوری کے بجائے اس کی الگ سی شخصیت اور الٹی سیدھی حرکتیں

گفتگو کا موضوع بنتیں۔ پرانے لوگ اس کے بارے میں عجیب و غریب کہانیاں دہراتے۔ جوانی میں زین اپنے آپ کو سپت سندھو کا باسی کہتا تھا۔ کمر میں لنگی باندھتا اور ننگے پاؤں پھرتا تھا۔ وہ ایک دن گانجا پینے کے بعد بھارت کی سرحد عبور کر گیا تھا اور وہاں قید ہو گیا تھا۔ وہ کالج آف آرٹ میں استاد لگ گیا تھا مگر ایک فحش حرکت کے باعث اسے نوکری سے برطرف کر دیا گیا تھا وغیرہ۔ جب بھی زین کا ذکر چھڑتا، اس طرح کے قصے سننے میں آتے مگر اس کی مصوری کے بارے میں سب خاموش تھے۔ شاید علمی لوگ یہ مانتے تھے کہ زین کی کھوکھلی مصوری ذکر کے قابل ہی نہیں۔

زین سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ ویسے بھی ملاقات کس طرح ہو سکتی تھی؟ وہ ان مجلسی فنکاروں میں سے نہیں تھا جو ہر نمائش اَور ہر پارٹی میں درشن دیتے ہیں۔ زین ایک مدت سے گوشہ نشین تھا۔ وہ اپنی کوٹھی میں بند رہتا اور اپنی نمائشوں میں بھی آنے کو راضی نہیں ہوتا تھا۔ اس گوشہ نشینی کے باعث لوگ اسے فراموش کرنے لگے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی وفات کے بعد اخبارات میں اس کے بارے میں صرف ایک آدھ سطر چھپی، کوئی تفصیلی تعزیت نامہ (Obituary) نہ شائع ہوا۔ سو ایک دن میرے اخبار کے مدیر نے مجھے بلایا اور 'سنڈے میگزین' کے لیے زین کی پروفائل لکھنے کا کہا: ''اگلے مہینے زین کی پہلی برسی منائی جائے گی۔ اس کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں لکھا گیا؛ یہ بڑی زیادتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس زیادتی کا ازالہ کریں اور زین کی تفصیلی پروفائل لکھیں۔ چلیں کام شروع کریں!'' یہ مدیر کے الفاظ تھے۔ میں نے فوراً اپنا کام شروع کر دیا۔ پروفائل لکھنے کے لیے زین کے واقف کاروں سے ملنا تھا اور ان سے بات چیت کر کے زین کے حالات زندگی حیطۂ تحریر میں لانا تھے۔

یہ کام آسان لگتا تھا؛ مگر آسان قطعاً نہیں تھا۔ اس شہر میں زین کے بہت سے جاننے والے موجود تھے؛ مگر کوئی اس کے بارے میں بات کرنے کو تیار نہیں تھا۔ سبھی اس کے مخالف تھے۔ وہ اسے ایک خبطی، مطلبی، بدتمیز اور کمرشیل آدمی گردانتے تھے، جسے ایک سیدھی لکیر کھینچنا بھی نہیں آتی تھی اور نہ ہی اسے رنگوں کی سوجھ بوجھ تھی۔ میں نے آصف رحمان سے فون پر رابطہ کیا۔ وہ وزیرِ ثقافت رہ چکے تھے اور زین کے ابتدائی پرستاروں میں شامل تھے؛ مگر جب میں نے ان سے زین کا ذکر کیا تو انھوں نے اسے گالیوں سے نوازنا شروع کر دیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ زین کے سخت مخالف تھے۔ میں نے کم از کم بیس افراد سے گفتگو کی؛ مگر زین کے بارے میں نہ تو کوئی معلومات مل سکیں اور نہ ہی کوئی ایسی بات ہاتھ آئی جسے پروفائل میں لکھا جا سکتا۔

میں ہمت ہارنے لگا تھا جب ایک دوست نے مجھے ایک شخص کا نمبر دیا۔ اس شخص کا اصل نام لینا مناسب نہیں ہے؛ میں 'فقیر' کے نام سے اس کا ذکر کروں گا، کیونکہ وہ اپنے آپ کو اکثر 'فقیر' ہی کہتا تھا۔ فقیر بہت عرصہ پہلے کالج آف آرٹ میں وائس پرنسپل رہ چکا تھا۔ وہ ایک سرکاری مصور تھا اور زین کا پرانا ساتھی تھا۔ میں نے اسے فون کیا، اپنا مقصد بتایا تو اس نے مجھ سے کہا: ''سبحان اللہ، آپ نیک کام کر رہے ہیں، میں آپ کے ساتھ پورا تعاون کروں گا۔ بس آپ کل میرے اسٹوڈیو میں آ جائیں...دو پہر تین بجے...میں آپ کو ڈھیر ساری معلومات دوں گا۔''

میں اگلے دن اس کے اسٹوڈیو پہنچ گیا اور اس سے ایک لمبی نشست ہوئی۔ اس کے بعد اس کے ساتھ دو نشستیں اور ہوئیں۔ ان نشستوں کے دوران فقیر نے مجھے بہت سی باتیں بتائیں، جنھیں میں نے ریکارڈ کر لیا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں جس کام کے لیے فقیر کے پاس گیا تھا، وہ پورا نہ ہو سکا۔ میں نے زین کی پروفائل کبھی نہیں لکھی۔ فقیر سے تین بار مل چکا تھا کہ میرے مدیر نے مجھے بغیر وجہ بتائے ملازمت سے برطرف کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ باتیں زین سے ہمدردی رکھنے والوں کے لیے بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ باتیں اب آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ میں نے انھیں اپنی ریکارڈنگ کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے، چنانچہ ان کی شکل انٹرویو کی ہے۔

ایک آخری بات بتانا چاہتا ہوں کہ چند ہفتے پہلے فقیر پر فالج کا حملہ ہوا تھا؛ اب وہ بول سکتا ہے نہ ہل سکتا ہے۔ سارا دن وھیل چیئر پر بیٹھا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آخر اسے اس کے گناہوں کی سزا دے دی ہے اور وہ یقیناً اپنی وھیل چیئر میں تڑپتا رہتا ہے کیونکہ وہ اپنے منھ میں افیون نہیں رکھ سکتا، جب کہ افیون کے بغیر اس کا ایک پل بھی نہیں گزر سکتا۔

۲

میں نے ٹھیک تین بجے فقیر کے اسٹوڈیو کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اس نے ایک ایپرن پہنا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک برش تھا۔ ایپرن پچکاریوں سے سجا ہوا تھا اور برش سے رنگین قطرے ٹپک رہے تھے۔ میں رعب دار، زلف دار اور اچھی شکل والے فنکاروں سے ملنے کا عادی ہوں، اس لیے فقیر کو دیکھ کر مجھے دھچکا لگا۔ وہ لنگڑا، کبڑا اور گنجا تھا، اور اس کی آنکھوں سے کمینگی ٹپک رہی تھی۔ اسے دیکھ کر خیال آتا کہ وہ عمرو عیار کا بھائی ہے۔ اس نے مجھے کہا: ''آ جائیں، اندر آ جائیں اور یہاں بیٹھیں!'' اس نے جھٹ سے ایک کرسی کو اپنے ایپرن کے کنارے سے صاف کیا اور مجھے اس پر بٹھایا۔ ''مجھے دو منٹ دے دیں۔ میں ایپرن اتار کر، ہاتھ دھو کر آتا ہوں!'' پھر وہ غائب ہو گیا۔ ایک نل کے کھلنے اور پانی کے بہنے کی آوازیں سنائی دیں۔

میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی؛ اسٹوڈیو میں کچھ مکمل اور نامکمل تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں۔ علامۂ مشرق، قائد اعظم اور مادر ملت کی تصویریں۔ میں ان کا انداز کیسے بیان کروں؟ فقیر نے Velazquez کا انداز اپنایا تھا؛ وہی جنونی اسٹروکس، وہی شوخ رنگ، مگر ظاہر ہے کہ فقیر Velazquez کے سامنے ایک بونا تھا۔ ایک تصویر کچھ مختلف تھی۔ وہ قائد اعظم کی تصویر تھی۔ اس کا انداز بنیادی طور پر Velazquezi تھا مگر قائد اعظم کی آنکھوں کو بڑے expressionistic طریقے سے پینٹ کیا گیا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں۔

''یہ قائد اعظم آپ کو پسند آیا؟'' فقیر کی آواز سن کر میں کانپ گیا۔ فقیر لوٹ آیا تھا۔ وہ میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ تصویر بھی دوسری تصویروں کی طرح ہلکی تھی مگر مجھے اس وقت

فقیر سے کام تھا اور میں اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا؛ اس لیے میں نے جھوٹ بولا: ''ہاں جی! بہت پسند آیا۔''

''کیوں؟''

میں مزید جھوٹ بولنے پر مجبور ہو گیا، سو میں نے کہا: ''اس کی آنکھیں بڑی انوکھی ہیں، بالکل انگاروں کی طرح، ایسی سُرخ آنکھیں میں نے ابھی تک صرف پکاسو کے آخری سیلف پورٹریٹ میں دیکھی تھیں۔''

فقیر کے چہرے پر ایک مسکان ابھری۔ میری بات اسے اچھی لگی تھی۔ اس نے کہا: ''چلیں، آپ کو اس تصویر میں پکاسو کی آنکھیں نظر آئیں۔ آپ نے اس فقیر کی بہت عزت افزائی کی ہے مگر سچ یہ ہے کہ یہ آنکھیں میرے دوست زین کی ہیں۔ میں جب اسے آخری بار ملا تھا، اس کی آنکھیں ایسی ہی تھیں۔ اس وقت اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ میں اس قائد اعظم سے بہت خوش ہوں۔ یہ میرا سب سے اچھا قائد اعظم ہے۔ سرخ آنکھوں کی وجہ سے اِس میں بڑی جان آ گئی ہے۔ مگر لوگ جاہل ہیں۔ یہ تصویر ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ تصویر ایک سال سے میرے پاس پڑی ہے۔ ابھی تک اسے کسی نے نہیں خریدا۔ آنکھیں دیکھ کر خریدار بھاگ جاتے ہیں۔ اوفوہ! میں نے تو فوراً باتیں شروع کر دیں، چائے پانی کا بھی نہیں پوچھا... آپ کیا لیں گے؟''

''آپ کی مہربانی۔ کچھ بھی نہیں۔''

''چلیں۔ آپ کی مرضی، میں مجبور نہیں کروں گا۔ میں بہت خوش ہوں کہ آپ نے زین کا پروفائل لکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ثواب کا کام ہے! آپ کو ایک بات بتاؤں؟ آپ صحیح آدمی کے پاس پہنچے ہیں۔ یہ فقیر زین کا دوست تھا۔ اس پر زین اعتبار کرتا تھا اور اس سے کچھ بھی نہیں چھپاتا تھا۔ سو میرا دعویٰ یہ ہے کہ زین کے بارے میں جو معلومات میرے پاس ہیں، وہ کسی اور کے پاس نہیں ہیں۔ میں آپ کو اپنی ساری معلومات بتاؤں گا، زین کے تمام راز آپ کے سامنے کھل جائیں گے مگر مجھے ایک بات بتائیں!''

''کون سی بات؟''

''آپ زین کی مصوری کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ میرا مطلب ہے، کیا آپ زین کو ایک عظیم فنکار گردانتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا نام مصوری کی تاریخ میں ہمیشہ روشن رہے گا؟''

میں جھوٹ بولتے بولتے اکتا گیا تھا۔ میں نے سچ بولا ''نہیں، بالکل نہیں!''

''تو پھر آپ زین کے بارے میں پورا آرٹیکل کیوں لکھنا چاہتے ہیں؟'' فقیر کے چہرے پر ایک شرارتی سی مسکراہٹ تھی۔

میں نے اپنے مدیر کی باتیں دہرائیں: ''اگلے مہینے زین کی پہلی برسی منائی جائے گی مگر اس کے بارے میں ابھی تک کوئی تفصیلی مضمون نہیں لکھا گیا۔ یہ بڑی زیادتی ہے! زین اس قسم کے مضمون کا حق دار ہے۔ زین کی مصوری معمولی تھی، مگر وہ ایک نسل کی آواز تھی؛ وہ ایک نسل کی نمائندگی کرتا تھا۔''

فقیر نے فوراً حامی بھر لی؛ ''بالکل، ایسے ہی تھا! وہ ہماری نسل تھی، جو اپنے آپ کو ہڑپا اور موہنجو ڈارو کی تہذیب کا وارث سمجھتی تھی اور یہ نسل بالکل فنا ہو گئی... مگر مجھے یہ بتائیں، آپ نے زین کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے میرے علاوہ اور لوگوں سے رابطہ کیا؟''

میں کچھ تنگ آ گیا تھا۔ فقیر سوال پوچھے جا رہا تھا، اور مجھے انٹرویو شروع کرنے کا موقع نہیں دے رہا تھا، مگر میں نے حوصلہ کیا اور دو تین جملوں میں زین کے واقف کاروں کے ساتھ اپنا تجربہ بیان کر دیا۔ فقیر زور سے ہنس پڑا۔

''ہاہاہا! زین کا نام سننے کو کوئی تیار نہیں ہے۔ ابھی تک سب اس سے جلتے ہیں! اور حضرت آصف رحمان جو زین کو گالیاں دیتے ہیں، کسی زمانے میں اس کے بہت گرویدہ تھے... ہاہاہا! سچی بات تو یہ ہے کہ یہ سب کے سب حرام زادے، زین کی موت کی خوشی منا رہے ہیں!''

پھر فقیر اچانک سنجیدہ ہو گیا اور کہنے لگا: ''اچھا، مگر سب سے پہلے ایک بات عرض کرنا چاہوں گا، میں بھی آپ کی طرح یہی سوچتا تھا کہ زین ایک فضول مصور ہے، مگر اس فقیر کو اس شاہکار کی جھلک دیکھنے کا موقع ملا جسے زین اپنی عمر کے آخری دنوں میں پینٹ کرنے میں مصروف تھا، میری رائے سراسر بدل گئی۔ زین نے نہ جانے کیوں اپنے اس حیرت انگیز شاہکار کو دنیا کی نظروں سے چھپا رکھا تھا۔ دنیاداروں میں سے صرف اس فقیر نے اس کا دیدار کیا۔ آپ اس شاہکار کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں؟ اس کے ذکر سے آپ کے مضمون میں جان پڑ جائے گی۔''

''جی، کیوں نہیں؟''

فقیر کے چہرے پر بیزاری کی رمق آنے لگی اور اس نے کہا؛ ''مگر مجھے افسوس ہے، میں آپ کے ساتھ اس وقت اس شاہکار کے بارے میں بات نہیں کر سکتا۔ آپ مجھے پہلی بار ملے ہیں۔ میں آپ کو جانتا نہیں ہوں۔ بس تھوڑی سی دوستی، تھوڑی سی قربت پیدا ہونے دیں، پھر باتیں کریں گے۔ آج آپ مجھے معاف فرمائیں! چلیں، اپنے سوال پوچھ لیں!''

فقیر کی آخری بات نے مجھے مایوس کیا، مگر کیا کیا جا سکتا تھا؟ میں نے اپنے بیگ میں سے ٹیپ ریکارڈر نکالا اور اسے آن کیا۔ پھر میں نے اپنا پہلا سوال کیا۔

''میں زین کی شخصیت کے بارے میں تھوڑی سی بات کرنا چاہتا ہوں۔ زین کیسا آدمی تھا؟''

''ہونہہ۔ بتاتا ہوں۔'' یہ کہنے کے بعد فقیر نے اپنی جیب میں سے ایک کالے رنگ کی شے نکالی، اور اپنے منہ میں ڈال لی۔ میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا، یہ کون سی شے تھی؟ گٹکا، نسوار؟ فقیر نے دھیرے سے کہا؛ ''آپ نے یہ کبھی نہیں دیکھی؟ یہ افیون ہے۔'' پھر اس نے اپنے جواب میں کہا؛ ''زین ایک انوکھا آدمی تھا؛ سب سے الگ، سب سے منفرد۔ وہ بنیادی طور پر ایک ملنگ تھا۔ وہ مادی دولت اور شان و شوکت سے بے تعلق تھا۔ وہ دنیاوی اسباب سے بے نیاز تھا۔ اس کی خطاطی کے نمونے نیویارک کی گیلریوں میں فروخت ہوتے تھے، بینک اکاؤنٹ میں لاکھوں ڈالر پڑے تھے، وہ ایک محل میں رہتا تھا، مگر اس کے طرز

زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اپنے کپڑے لنڈا بازار سے خریدتا، رکشے میں سفر کرتا اور خود ہی اپنے کپڑے دھوتا اور روٹی پکاتا تھا... اور سستا ناشتہ کرتا تھا۔ کوکین اور ایکسٹیسی کو وہ ہاتھ نہیں لگاتا تھا اور ان چیزوں پر سستی چرس کو ترجیح دیتا تھا۔ چرس کے بغیر رہنا اس کے لیے ناممکن تھا، جیسے میں افیون کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ پورا ملنگ تھا۔ اس نے بڑی ٹھوکریں کھائی تھیں۔ وہ جان گیا تھا کہ کہ دولت اور شہرت جعلی اور فانی چیزیں ہیں۔''

میرا دوسرا سوال تھا؛ ''زین کا رجحان کس سیاسی پارٹی کی طرف تھا؟''

یہ سوال سن کر فقیر پریشان ہو گیا؛ ''آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا وہ جماعت اسلامی کا حامی تھا؟ نہیں، بالکل نہیں۔ وہ لیفٹ کا بندہ بھی نہیں تھا۔ وہ لیفٹ کے لیفٹ کا بندہ تھا۔ نراجی تھا۔ انارکسٹ! دوسرے نراجیوں کی طرح وہ ایک چیتا تھا اور چیتا علیحدہ اور اکیلا رہتا ہے۔ اسی چیتے پن نے اسے بچایا۔''

''وہ کیسے؟''

''چیتا ہونے کے ناتے اس نے سماج کے ساتھ سمجھوتہ کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ ہم لوگوں نے سمجھوتہ کیا اور سماج کی مشین کے پرزے بن گئے۔ ہم افسر بن گئے، دکان دار بن گئے، نوکر بن گئے، مولوی بن گئے، مگر زین میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ موت تک اس کے اندر جوانی کا جنون اور بغاوت رہی، مگر زین کا چیتا پن لوگوں سے برداشت نہ ہوا۔ اس کے دشمن بہت تھے، جواب اس کی موت کی خوشی منا رہے ہیں۔ اس کا ایک ہی یار تھا۔''

''کون تھا وہ؟''

''یہ فقیر۔ کیونکہ یہ فقیر بھی ایک چیتا ہے، اور چیتا ہی چیتے کو سمجھتا ہے۔''

میرے لبوں پر ہنسی ابھر آئی۔ فقیر یہ ہنسی دیکھ کر ناراض ہو گیا۔ اس نے ایک کرخت لہجے میں کہا؛ ''ہنسیں جی، ہنسیں! مگر جب آپ کو پتہ چلے گا کہ میں کس طرح کا چیتا ہوں، آپ کی ہنسی خود بخود ختم ہو جائے گی۔''

پھر فقیر نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور سرخ آنکھوں والے قائداعظم کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ مجھ سے ناراض ہو گیا تھا، مگر میں نے اُسے ناراض نہیں رہنے دیا۔ میں نے فوراً ایک نیا سوال داغ دیا؛ ''زین سے آپ کی پہلی ملاقات کہاں اور کیسے ہوئی؟''

فقیر میری طرف دیکھنے لگا اور بولا؛ ''پہلی ملاقات کالج آف آرٹ کے ہاسٹل میں ہوئی۔ اصل میں ہمارا انٹرویو اکٹھے ہوا تھا۔ آج کل 'انٹرویو' کو 'ریگنگ' کہا جاتا ہے۔ آپ نے مجھے فون پر کہا تھا کہ آپ بھی کالج آف آرٹ کے گریجویٹ ہیں۔ آپ کی بھی ریگنگ ہوئی ہوگی۔''

''جی ہاں! ہو گئی۔'' میں نے آنکھیں نیچی کرتے ہوئے کہا۔

''سینئرز نے آپ کے ساتھ کیا کیا؟''

''بس، مہربانی کر کے یہ نہ پوچھیں... میں نے ریگنگ کے بعد خودکشی کرنے کا سوچا تھا۔''

فقیر کو میری باتیں اچنبھا لگیں۔ اس نے فوراً کہا؛ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے اور میرے زمانے میں خاصا فرق ہے؛ سینئرز اتنے بے رحم نہیں تھے۔ سوایسا ہوا کہ مجھے ہاسٹل میں کمرہ ملا تھا۔ میں اس کی چابی پکڑ کر ہاسٹل کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ سینئرز نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا اور اپنے ساتھ انٹرویو کے لیے ہاسٹل کے ہال میں لے گئے۔ ہال خالی تھا، مگر اس کے درمیان میں کچھ کرسیاں پڑی تھیں جن پر کچھ سینئرز بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے ایک دیہاتی سا لڑکا الف ننگا کھڑا تھا۔ وہ کمزور سا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے زندگی میں کبھی پیٹ بھر کر کھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کا انٹرویو ہو رہا تھا۔ ایک لمبے بالوں والا سینئر سوال پوچھ رہا تھا؛ ''ناجائز اور ناخلف اولاد! تمھارا اسم گرامی؟''

''زین۔''

''لڑکے! جب تم مجھ سے بات کرو گے تو مجھے ابو کہہ دینا، ٹھیک ہے؟''

''ٹھیک ہے، ابو!''

''لڑکے! تمھارے گاؤں کا نام کیا ہے؟''

''کھوتیاں والا، ابو!''

کھوتیاں والا سنتے ہی سینئرز ہنس پڑے، اور لمبے بالوں والے سینئر نے مذاق کیا: ''تم تو پھر خرنفس ہو!'' سینئرز کی پھر ہنسی نکل گئی۔

زین کا انٹرویو جلد ہی ختم ہو گیا۔ میرا نمبر آیا۔ مجھے اپنے کپڑے اتارنا پڑے اور ہر طرح کے بے تکے سوالوں کا جواب دینا پڑ گیا۔ پھر میرے بعد تین مزید نئے لڑکوں کا انٹرویو ہوا۔ ہم سب ننگے اور بے عزت ہو گئے۔''

''پھر کیا ہوا؟'' کہانی لمبی ہو رہی تھی۔

''پھر جب انٹرویو ختم ہو گئے، لمبے بالوں والے سینئر نے ہمیں ایک رُولر دکھایا اور کہا؛ ''کالج کا سالانہ عضویاتی مقابلہ شروع ہوا چاہتا ہے۔ یہ آلہ پیمائش جیتنے والے کا فیصلہ کرے گا۔''

''عضویاتی مقابلے کا مطلب آپ کی سمجھ میں آیا؟''

''جی ہاں! ریگنگ کے دوران میں مجھے ایک عضویاتی مقابلے میں شریک ہونا پڑا تھا۔''

''سو ہمیں ایک صف میں کھڑا ہونے کا کہا گیا، اور لمبے بالوں والے نے رُولر کے ساتھ ہمارے عضوؤں کی پیمائش کی۔ زین کا سب سے لمبا تھا۔ سو لمبے بالوں والے نے اپنی جیب میں سے ایک گولی نکالی اور یہ کہتے ہوئے زین کے منھ میں ڈالی؛ ''او، خرنفسیے! یہ تمھارا انعام ہے۔ تمھیں اَب سبز گھاس پر سفید خرگوش کھیلتے ہوئے نظر آئیں گے!'' زین نے گولی نگلی۔ پھر سینئر ہنستے ہنستے چلے گئے اور نئے لڑکے بھی کپڑے پہن کر چل دیے۔ میں نے بھی کپڑے پہنے مگر زین کپڑے نہ پہن سکا، گولی کھانے کے بعد اُس کی حالت خراب ہو گئی تھی۔''

''گولی LSD کی ہو گی!''

''خدا جانے، کون سی گولی تھی! اس کے ہاتھ اور ٹانگیں بالکل سُن ہو گئی تھیں۔ میں نے کپڑے پہنانے میں اس کی مدد کی۔ پھر میں نے اسے اپنے کاندھوں پر لادا اور اپنے کمرے تک لے گیا۔ وہاں پہنچ کر اسے اپنی چارپائی پر لٹا دیا۔ وہ میری چارپائی پر بارہ گھنٹے لیٹا رہا، اور اس دوران میں چھت کو گھورتا رہا۔ خدا جانے اسے کون سی جنتیں اور سونا گریاں چھت میں دکھائی دے رہی تھیں۔ پھر وہ اچانک ہوش میں آیا اور ہوش میں آنے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا اور کہا؛ ''یار، میں نے بہت لمبا سفر کیا!'' اور وہ اپنے سفر کی کہانی سنانے لگ پڑا۔''

''زین نے کہاں کا سفر کیا تھا؟''

''زین نے چار ہزار سال پہلے کے ہڑپا کا سفر کیا تھا۔ وہ شہر کی گلیوں میں گھوما تھا۔ ماں دیوی اور راجا پجاری سے ملا تھا۔ پھر وہ ندی کے کنارے گیا تھا، اور وہاں ایک بیڑی میں بیٹھ گیا تھا، جو موہنجوڈارو جا رہی تھی۔ موہنجوڈارو کا سفر خاصا خطرناک تھا۔ بڑے بڑے مگرمچھ اور دریائی گھوڑے بیڑی پر ہلہ بول رہے تھے، اور وحشی بندے کناروں سے تیر چلا رہے تھے۔ مگر وہ موہنجوڈارو کے سفر کو اپنا فرض سمجھ رہا تھا کیونکہ وہاں کی کوئی ہستی اسے بار بار بلا رہی تھی؛ کون سی ہستی، کیسی ہستی؟ وہاں پہنچنے کے بعد ہی پتہ چلنا تھا۔ پھر موہنجوڈارو کے گھاٹ نظر آئے۔ بیڑی رک گئی اور زین اچانک ہوش میں آ گیا۔ ہستی کا درشن نہیں ہوا۔ ہستی کا بھید کھلا ہی نہیں۔ زین اسے ملنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ وہ لمبے بالوں والے کے کمرے تک گیا اور اس نے اس سے ایک اور گولی مانگی؛ مگر لمبے بالوں والے نے معذرت کی۔ گولیاں ختم ہو گئی تھیں، اس نے زین کو آخری گولی دی تھی۔''

''مجھے یہ بتائیں کہ زین کالج آف آرٹ میں آنے سے پہلے کہاں تھا اور کیا کرتا تھا؟ آپ اس کے خاندان اور بچپن کے بارے میں مجھے کچھ بتا سکتے ہیں؟''

''جی ضرور،'' فقیر نے لمبی سانس لی اور کہا؛ ''زین اکثر کہتا تھا کہ وہ سپت سندھو کا باسی ہے، اور وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ اس کا جنم ہڑپے کے علاقے میں ہوا تھا؛ پنڈ کھوتیاں والا، ضلع منٹگمری۔ ۱۹۴۷ میں زین کے والدین مشرقی پنجاب سے یہاں آئے تھے۔ 'اللہ رکھا' اس کا پیدائشی نام تھا جسے اس نے بعد میں ترک کر دیا۔ زین کا باپ پیشے کے اعتبار سے زمیندار تھا اور مزاجاً مولوی تھا؛ پانچ وقت کا نمازی اَور تہجد گزار۔ اس کے ماتھے پر محرابیں ابھری ہوئی تھیں۔''

''اور زین کی والدہ؟''

''ان کے بارے میں میرے پاس کوئی معلومات نہیں ہیں۔ میری معلومات صفر ہیں۔ زین نے کبھی ان کا ذکر نہیں کیا، مگر میرا ذہن کہتا ہے کہ وہ جلدی فوت ہو گئیں... جوانی میں۔ ان کے ساتھ زین کا بہت کم وقت گزرا۔''

''زین کے بہن بھائی تھے؟''

''ان کے بارے میں بھی میری معلومات صفر ہیں، زین نے ان کا ذکر کبھی نہیں کیا۔ میرا اندازہ

ہے کہ وہ چھوٹی عمر میں فوت ہو گئے۔''

''وہ کیسے فوت ہوئے؟''

''جیسے دیہاتی بچے مرتے ہیں۔ کوئی نہر میں ڈوب گیا، کسی نے زہریلے سانپ کا ڈنک کھایا، کسی کو جن چمٹ گئے۔''

''زین کا بچپن کیسے گزرا؟''

''زین کا بچپن ویسے ہی گزرا جیسے عام طور پر دیہاتی بچوں کا گزرتا ہے۔ وہ نہر میں بھینسوں کے ساتھ تیرتا، غلیل سے کوؤں کو مارتا، درختوں پر چڑھتا اور اسکول سے بھاگ جاتا۔ ہڑپا شہر کے کھنڈر قریب تھے۔ اسکول سے بھاگ کر وہ سارا دن کھنڈروں میں گھومتا۔ کھنڈروں کے آس پاس کمہار اور دستکار بیٹھتے۔ وہ پرانے انداز میں برتن، مہریں اور مورتیاں بناتے اور سیاحوں کے ہاتھ فروخت کرتے۔ ان کی بنائی ہوئی چیزیں دیکھ کر یہ تاثر پیدا ہوتا کہ وہ پانچ دن نہیں، پانچ ہزار سال پرانی ہیں۔ سپت سندھو کے کاریگروں کے گر پشت در پشت ان میں منتقل ہوتے تھے۔ زین انھیں کام کرتے ہوئے گھنٹوں دیکھتا رہتا اور اس طریق سے وہ آہستہ آہستہ ہڑپے کے قدیم انداز سے آشنا ہو رہا تھا۔ بعد میں یہ جانکاری اس کے بہت کام آئی۔''

''کسی انسان کا پہلا عشق ہمیشہ اہم ہوتا ہے۔ شخصیت کی تشکیل میں اس کا کردار بھی اہم ہے۔ زین نے آپ کو اپنے پہلے عشق کے بارے میں کچھ بتایا؟'' میں اپنے اس سوال سے خاصا خوش تھا۔

''جی، اس نے کئی بار میرے سامنے اپنے پہلے عشق کا ذکر کیا۔ اس کی پہلی معشوقہ خانہ بدوشوں کی ایک لڑکی تھی۔ وہ زین کے گاؤں کے قریب کسی خیمے میں رہتی تھی۔ زین کا پہلا جنسی تجربہ اسی کے ساتھ ہوا۔ زین کا کہنا تھا کہ وہ جنسی لحاظ سے بالکل وحشی تھی۔ پھر معشوقہ اپنے خاندان کے ساتھ شمال کی طرف چلی گئی اور واپس نہیں آئی۔ زین کا دل ٹوٹ گیا۔ خانہ بدوشوں کی لڑکی اسے زندگی بھر یاد آتی رہی۔''

''تصویریں بنانے کا سلسلہ اس کے بچپن میں شروع ہوا؟''

''بالکل! گاؤں کے منظر اسے متاثر کر رہے تھے۔ زین کہتا تھا کہ جب وہ چھ سال کا تھا تو اپنے اسکول کی کاپی میں ساکن مناظر کی تصویریں بنانے لگ گیا تھا۔ سو اس نے ذخیروں، کنوؤں، مکانوں اور ٹیلوں کی تصویریں بنانا شروع کیں۔ پھر وہ تھوڑا سا بڑا ہوا تو اسے حرکی مناظر میں دلچسپی ہو گئی اور وہ اپنی کاپی کو ہل چلاتے کسانوں، دوڑتے گھوڑوں اَور بہتی نہروں کی تصویروں سے سجانے لگ پڑا۔ پھر جب اسے شعور آیا، اسے لحاتی مناظر کو مصور کرنے کا چسکا پڑ گیا اَور وہ اپنی کاپی کو اڑتے پرندوں، چمکتی بجلیوں، ٹوٹتے ستاروں اور گرتے آموں کی تصویروں سے بھرنے لگا۔ لحاتی مناظر کی تصویریں دیکھ کر لوگ حیران ہو جاتے۔ ایک تو انھیں آدھے سیکنڈ کے مناظر کو مصور کرنا ناممکن لگتا، دوسرے زین کی تکنیک اتنی پختہ تھی کہ یقین نہیں آتا تھا آیا وہ ایک چھوٹے سے لڑکے کی تخلیقات ہیں۔''

''اس نے تصویریں بنانے کا فن کہاں سے سیکھا؟ اس کا استاد کون تھا؟''

''کوئی استاد وستاد نہیں تھا۔ بس، ایک بار اس کا ٹاکرا ایک برگزیدہ مسافر سے ہوا تھا جس نے جاتے

جاتے اسے تصویریں بنانے کی مہارت عنایت کی۔ زین کا بیان یہی تھا۔''

''یہ ٹاکرا کیسے ہوا؟''

''ٹاکرا یوں ہوا کہ ایک دوپہر زین ایک برگد کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اپنی کاپی میں ایک دوڑتے ہوئے گھوڑے کی تصویر بنا رہا تھا کہ اس نے ساتھ والی سڑک پر ایک مسافر کو دیکھا جس کے سر کے بال بڑھے ہوئے تھے اور کان چھدے ہوئے تھے جن میں مُندریاں چمک رہی تھیں اور اس نے گلے میں مُرلی لٹکائی ہوئی تھی۔ وہ تخت ہزارے کا کوئی باسی محسوس ہوتا تھا۔ مسافر نے زین کو دیکھا اور وہ سڑک چھوڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کے پاس آ گیا اور پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اس کے ہاتھ سے کاپی پنسل چھین لی۔ اس نے زین کے بنائے ہوئے گھوڑے پر نظر ڈالی، ورق پلٹا اور نئے ورق پر جلدی سے ایک تصویر بنا ڈالی۔ پھر اس نے زین کو کاپی اور پنسل واپس کر دی، اور ایک لفظ کہے بغیر چلتا بنا۔ زین نے اس کی بنائی ہوئی تصویر کو دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ مسافر نے ایک جیتا جاگتا گھوڑا بنایا تھا جسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اگلے ہی پل کاپی سے باہر چھلانگ لگا دے گا۔ پھر زین نے نگاہیں اٹھائیں اور دیکھا کہ مسافر سڑک کے آخری کنارے تک پہنچ چکا تھا اَور ایک گھوڑا اس کی طرف بھاگ رہا تھا۔ مسافر اس گھوڑے پر سوار ہو گیا اور آنکھ جھپکتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ زین نے اپنی کاپی کی طرف دوبارہ دیکھا، مسافر کا بنایا ہوا گھوڑا ورق سے غائب تھا۔ وہ اپنے کاغذی احاطے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا جس کا راکب وہی مسافر تھا۔ جاتے جاتے اس برگزیدہ مسافر نے زین کو اس جادو سے آشنا کر دیا تھا جس کے ذریعے روپ جان دار اور تصویریں زندہ ہو جاتیں۔ یہ زین کی پسندیدہ کہانی تھی۔'' فقیر مسکرا رہا تھا۔

میں نے اس کہانی کو فوراً نظر انداز کیا کہ یہ بالکل من گھڑت تھی اور زین کے پروفائل میں لکھے جانے کے قابل نہیں تھی۔

میں نے سوالات کا رخ بدلا اور پوچھا؛ ''زین کے والد صاحب مذہبی آدمی تھے۔ وہ اپنے بیٹے کی تصویروں کو کس نظر سے دیکھتے تھے؟''

''ظاہر ہے، حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ زین خطاط بنے، مگر زین باغی تھا اور اپنی تصویریں بنائے جا رہا تھا۔ سو وہ اکثر اپنے والد سے مار کھاتا۔ اس کا والد اس کی کاپیوں کی چھان پھٹک کرتا اور جب اسے کوئی تصویر مل جاتی، وہ ورق پھاڑ دیتا مگر زین ہمت نہ ہارتا۔ وہ ہر روز نئی تصویریں بناتا جو بعد میں اس کے والد کے غیظ و غضب کا شکار ہو جاتیں۔ یہ سلسلہ برسوں چلتا رہا۔ پھر زین اپنے والد کے مسلسل ظلم سے تنگ آ کر گھر سے بھاگ گیا۔''

''اس وقت اس کی کیا عمر تھی؟''

''یہی کوئی پندرہ سولہ سال!''

''زین نے گھر سے بھاگنے کے بعد کیا کیا؟''

''مزدوری کی۔ اس نے چیچہ وطنی کی غلہ منڈی میں بوریاں ڈھوئیں، منٹگمری کے ایک ہوٹل میں

برتن مانجھے، اوکاڑہ کے سٹیشن پر قلی کا کام کیا۔ پھر وہ لاہور کی جانب چل دیا۔ گھر سے بھاگنے کے بعد زین مہینوں بھوکا رہا، مگر اس نے گھر واپس لوٹنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اپنے والد کا منھ دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھا اور اس نے اپنی زندگی میں اپنے والد کا منھ دوبارہ نہ دیکھا؛ وہ گھر کبھی نہ لوٹا۔''

''کبھی نہیں؟''

''کچھ مدت کے بعد اسے اطلاع ملی کہ اس کے والد نے اس جہان سے آنکھیں پھیر لی ہیں؛ مگر وہ اس کے جنازے پر بھی نہیں گیا۔ یوں سمجھیں کہ والد کے ساتھ اس کی ازلی دشمنی تھی۔''

''زین کو بے گھر ہونے کا دکھ نہیں ستاتا تھا؟''

''بالکل نہیں! وہ کہتا تھا کہ وہ خوش نصیب تھا کہ چھوٹی عمر ہی میں گھر کی قید سے رہا ہو گیا۔ وہ اس طرح پوری آزادی سے، کسی روک ٹوک کے بغیر اپنی زندگی کو مصوری کی نذر کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔''

''اچھا، آپ کہہ رہے تھے کہ زین لاہور کی طرف چل پڑا۔''

''جی، وہ لاہور چلا آیا اور لاہور پہنچنے کے بعد اس نے اپنا نام بدل لیا۔ اس کا نیا نام زین تھا۔''

''اس نے اپنا نام کیوں بدل لیا؟''

''یہ اپنے والد کے ساتھ اس کی بغاوت کا نتیجہ تھا اور اپنے ماضی سے واسطہ ختم کرنے کا ایک طریقہ!''

''لاہور میں اس نے کوئی کام وام کیا؟''

''ہاں کیا... مگر اب کی بار اسے اپنی پسند کا کام مل گیا تھا۔ وہ ایک اشتہار ساز بزرگ کے پاس ملازم ہو گیا تھا۔ اس کے لیے وہ صفائی کرتا، چائے بناتا، چرس کے سگریٹ بھرتا اور رنگ تیار کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ برش سے کام کرنے کا طریقہ سیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے خود ہی پینٹ کرنا شروع کر دیا اور بزرگ سمجھ گیا کہ اس میں کافی گن ہیں۔ بزرگ نے پھر اسے فلموں کے کچھ اشتہارات کے پس منظر بنانے کے لیے کہا۔ چنانچہ زین نے پس منظروں میں اتنی خوبصورتی سے سرخ آسمان، ڈراؤنے پہاڑ اور انسان نما بادل بنائے کہ بزرگ نے اپنا بھرا ہوا سگریٹ اس کے حوالے کیا اور کہا؛ 'نوجوان، کش لگا! تیرا مستقبل بڑا روشن ہے۔' زین نے اس دن پہلی بار چرس پی۔''

''کیا زین اس کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی انداز میں بھی تصویریں بناتا تھا؟''

''ہاں۔ اس وقت اس کا ٹاکرا کیوبزم سے ہوا تھا، جب اسے اشتہاروں سے فرصت ملتی، وہ کیوبسٹک انداز میں تصویریں بناتا تھا۔''

میں چونک پڑا اور فوراً پوچھا؛ ''کیا یہ سچ ہے؟ وہ تو ایک دیہاتی لڑکا تھا۔ کوئی تعلیم بھی نہیں تھی، پھر وہ کیوبزم تک کیسے پہنچ گیا؟''

فقیر نے اپنا گلا صاف کیا اور کہا؛ ''کباڑیوں کے ساتھ زین کی دعا سلام تھی۔ ان لوگوں کو جب بھی مصوری کے بارے میں کوئی کتاب مل جاتی، وہ تھوڑے سے پیسے لے کر اسے زین کے حوالے کر

دیتے۔ زین کتاب کی ورق گردانی کرتا اور جب اسے کوئی عمدہ تصویر نظر آتی، وہ ایک کاپی میں پنسل سے اس کی نقل اتارتا۔ اس طریق سے اس نے Rembrandt، Greco، Gaugin اور دیگر مصوروں کی بے شمار تخلیقات نقل کر لیں۔ پھر ایک دن یوں ہوا کہ ایک ردی والے نے زین کو پکاسو کے بارے میں ایک کتاب دی جس میں وہ پکاسو کی کیوبزم دیکھ کر اس کا عاشق ہو گیا۔ میں نہیں جانتا کہ کیوبزم کے فلسفے کو وہ کس حد تک سمجھا تھا؛ لیکن یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کیوبزم کی تکنیک اس کی سمجھ میں پوری طرح آ گئی تھی۔''

''زین نے اشتہار سازی کتنے سال کی؟''

''دو سال۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''اس نے کالج آف آرٹ میں داخلہ لے لیا۔''

''وہ کالج تک کیسے پہنچا؟''

''بس، قسمت نے ساتھ دیا۔ یوں ہوا کہ ایک دن بزرگ کو اچانک گاؤں جانا پڑ گیا۔ شاید جائیداد کا کوئی مسئلہ تھا۔ اس وقت زین ایک نئی مووی 'پنڈ دا سکندر' کا اشتہار بنا رہا تھا۔ اشتہار دو دن میں تیار ہونا تھا، اور بزرگ جانتا تھا کہ وہ اگلے دو دن تک واپس نہیں آ سکے گا۔ چنانچہ اس نے زین کو اشتہار مکمل کرنے کی ذمے داری دے دی اور اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے چرس کے دو تولے بھی دے دیے۔ زین نے دو دنوں میں دونوں تولے پھونک ڈالے اور اپنی طرز کا اشتہار بنا ڈالا۔ جب مووی ہال کے کاریگر اشتہار لینے آئے تو اشتہار کارٹن میں لپٹا ہوا تھا۔ کاریگروں نے اسے کھول کر مووی ہال کے بل بورڈ پر لگا دیا۔ اشتہار کی پورے شہر میں دھوم مچ گئی۔ شہر کی ساری خلقت اسے دیکھنے کے لیے ہال کے باہر اکٹھی ہو گئی۔''

''اس اشتہار میں کون سی منفرد بات تھی؟''

''وہ کیوبسٹک تھا! ہیرو کا چہرہ چوکور اور ہیروئن کا تکونا تھا اور اس کی آنکھیں بالکل بندیا کی طرح چھوٹی تھیں۔ پس منظر میں ایک گاؤں دکھائی دے رہا تھا جسے اس ڈھنگ سے بنایا گیا تھا کہ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے اس کے تمام گھر ایک دوسرے پر کھڑے ہیں۔ ہال کا مالک اشتہار کی رونمائی کے وقت دور کھڑا تھا۔ جب اسے ہال کے باہر خلقت کے اکٹھے ہونے کی خبر ملی، وہ بھاگم بھاگ وہاں پہنچا اور اشتہار کو دیکھتے ہی وہ غصے میں آ گیا۔ اس نے کاریگروں کو فوراً اشتہار اتارنے کا کہا؛ مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ آدھا شہر تو 'پنڈ دا سکندر' کا کیوبسٹک اشتہار دیکھ چکا تھا، اور زین کی خوش نصیبی تھی کہ دیکھنے والوں میں شکور صاحب بھی شامل تھے جو اس وقت کالج آف آرٹ کے پرنسپل تھے۔''

''شکور صاحب کا کیا ردعمل تھا؟''

''وہ بہت متاثر تھے۔ اس دن ان کی گاڑی خراب ہو گئی تھی اور وہ پیدل کالج جا رہے تھے۔ وہ مووی ہال کے سامنے سے گزرے تو اشتہار دیکھ کر انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ بڑے بڑے مصور بھی کیوبزم کے قریب آنے سے ڈرتے ہیں۔ کس بندے نے ایک فلمی اشتہار کو کیوبسٹک انداز سے بنانے کا بیڑا

اٹھایا تھا؟ شکور صاحب اشتہار سازوں کی گلی تک پہنچ گئے اور جب انھوں نے 'پنڈ داسکندر' کے خالق کو دیکھا تو ان کی حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ خالق محض اٹھارہ انیس سال کا ایک دیہاتی لڑکا تھا۔ انھوں نے اسی وقت زین کو کالج میں داخلہ لینے کی دعوت دے دی اور وعدہ کیا کہ اس کی فیسیں معاف ہوں گی اور اس کے لیے وظیفے کا بندوبست بھی کیا جائے گا۔ قسمت کتنی عجیب شے ہے! اس دن اگر شکور صاحب کی گاڑی خراب نہ ہوتی تو زین کا بُرا انجام ہونا تھا۔ اشتہار ساز بزرگ اسے نوکری سے نکال دیتا اور وہ شہر کے آوارہ چرسیوں اور پاؤڈریوں میں شامل ہو جاتا؛ اور وہ کسی سرد رات کو ایک فٹ پاتھ پر بھوک، بیماری یا اَوور ڈوز سے مر جاتا۔''

''سو، زین کالج آ گیا؟ اس کے ابتدائی سال وہاں کیسے گزرے؟''

''اچھے گزرے۔ اسے وظیفہ ملنے لگا۔ چنانچہ اسے زندگی میں پہلی بار اپنی ساری توانائیاں مصوری میں صرف کرنے کا موقع ملا۔ وہ رات دن طلبا کے مشترکہ اسٹوڈیو میں تصویریں بناتا اور مختلف تجربے کرتا۔ شروع شروع میں اس کے تجربات کیوبسٹک تھے۔ وہ سٹل لائف، لینڈ سکیپ اور پورٹریٹ اسی انداز میں بناتا تھا۔ مگر اس انداز سے زین کا جی اکتا گیا اور اس نے اظہاری انداز اپنا لیا۔ اس نے اظہاری مصوروں کے مزاحیہ اور مذمتی انداز میں اپنے گاؤں کھوتیاں والا کے چودھریوں، مولویوں اور دکان داروں کے پورٹریٹ بنانا شروع کیے۔ چودھریوں کے چہرے اناروں کی طرح سرخ تھے؛ مولویوں کی آنکھیں مٹر کے دانوں کی طرح چھوٹی تھیں؛ اور دکان داروں کے گنجے سر یوں چمکتے تھے جیسے وہ سورج کی کرنوں کو اپنی طرف کھینچ رہے ہوں۔ ان کے حلیوں سے ان کی جہالت، تکبر اور منافقت اجاگر ہوتی۔ ان تصویروں کے ذریعے ایک غریب لڑکا اپنے گاؤں کی معزز اور مقتدر ہستیوں پر تنقید کرتا۔ شکور صاحب نے ان تصویروں کی خوب تعریف کی اور زین کو شاباش دی۔ زین ان کا سب سے لاڈلا شاگرد تھا۔ دو سال اسی طرح کیوبزم اور اظہاریات سے کھیلتے ہوئے گزرے۔ پھر تیسرا سال شروع ہوا اور زین نے ایک نیا تجربہ شروع کیا۔''

''زین جوانی میں بڑا وَراسٹائل بندہ تھا۔ اس نے کتنے تجربے کیے؟'' میں نے ایک دانشورانہ تبصرہ کیا۔

''جی... سو'' فقیر نے میری سنی ان سنی کر دی اَور اپنی کہانی کو آگے بڑھایا؛ ''اس بار اس پر تجریدیت کا بھوت سوار ہوا۔ اس وقت مصوری کی دنیا میں امریکیوں کی اظہاری تجریدیت کی بڑی دھوم تھی۔ زین ان کی دیکھا دیکھی اپنے کینوس سے برا سلوک کرتا۔ وہ اس غریب پر اپنا غصہ نکالتا؛ اسے ٹیڑھی میڑھی اور بے معنی لکیروں سے سجاتا؛ آنکھوں کو چبھنے والے رنگوں سے بھرتا؛ اور اس پر ریت، مٹی اور خاک پھینکتا۔ جب اسے زیادہ غصہ آتا، وہ اس میں کیلیں ٹھونکتا، یا اس کی سطح پر پرانے کپڑے یا پوچے ٹانک دیتا۔ پھر جب وہ آپے سے بالکل باہر ہو جاتا، تو کینوس کو اپنے پیشاب یا لہو سے سجاتا۔ گویا وہ کینوس کی خاصی بےعزتی کرتا۔ زندگی کی ٹھوکریں کھاتے کھاتے، اس کے دل میں جو غصہ پیدا ہوا تھا، اسے نکالنے کا اسے یہ اچھا طریقہ ملا تھا اور اس کی تصویریں دیکھ کر مجھے بڑی شرم محسوس ہوتی تھی۔''

''کیوں جی؟''

''کیونکہ میں Cezanne سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ بیسویں صدی کے رجحانات میرے پلے نہیں پڑتے تھے۔ میں خود کو بابا Cezanne کا مرید گردانتا تھا اور انھیں کے انداز میں شیخوپورے، اوکاڑے یا قصور کے لینڈ سکیپ بناتا تھا، یا وہاں کے کسانوں کے پورٹریٹ۔ میری مصوری کا تعلق انیسویں صدی سے تھا جن کے ساتھ میں خوش نہیں تھا۔ ویسے زین بھی اپنی تصویروں سے خوش نہیں تھا۔''

''اس کی کیا وجہ تھی؟''

''وہ نئے نئے مغربی انداز اپنائے جا رہا تھا جبکہ وہ خالص مشرقی روح کا مالک تھا۔ وہ بنیادی طور پر سپت سندھو کا باسی تھا۔ سو، وہ اسی اندرونی تضاد کا شکار تھا جو کالج آف آرٹ کے تمام طلبا کو تڑپاتا تھا۔ ذات دیسی تھی مگر فن بدیسی۔ اور زین باقی طلبا کی طرح اپنی دیسی ذات کو خاموش کرا کے اپنے اندر کے تضاد کو ختم کر دیتا تھا۔''

''زین نے اپنی دیسی ذات کا اظہار کب کرنا شروع کیا؟''

''موہنجوڈارو جانے کے بعد۔''

''اچھا! آپ پھر مجھے موہنجوڈارو کے اس سفر کے بارے میں بتائیں!''

فقیر تھکا ہارا دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے سے لگاتار بول رہا تھا۔ اس نے کہا؛ ''میں آپ کو موہنجوڈارو والا قصہ سناتا ہوں، پھر میں آپ سے اجازت لوں گا۔ مجھے پانچ بجے کنیئرڈ کالج سے اپنی بیٹی کو پک کر کے گھر پر ڈراپ کرنا ہے۔''

میں نے جواب میں کہا؛ ''کوئی بات نہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں، اس قصے کے بعد آپ کو تنگ نہیں کروں گا۔''

فقیر نے افیون کا ایک نیا ٹکڑا اپنی جیب میں سے نکالا اور منہ میں رکھا۔ اسے فوراً طاقت مل گئی اور اس نے ایک نئی کہانی شروع کر دی۔

''اچھا، زین اظہاری تجریدیت سے بھی تنگ آ گیا تھا اور اظہاری تجریدیت چھوڑنے کے بعد وہ ایک مشکل دور سے گزرا۔ اس کا ذہن بالکل خالی تھا۔ اس سے پینٹ نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے کیا پینٹ کرنا چاہیے اور کس انداز میں! شکور صاحب نے اس کی بُری حالت دیکھ کر اسے سفر کرنے کا مشورہ دیا۔ زین نے ان کی بات مان لی۔ کہیں نہ کہیں تو جانا تھا، پر کہاں جائیں؟ پھر اسے موہنجوڈارو کا وہ سفر یاد آیا جسے اس نے انٹرویو والے دن گولی کھانے کے بعد شروع کیا تھا، مگر ختم نہیں کر سکا تھا۔ چنانچہ اس نے موہنجوڈارو جانے کا فیصلہ کیا۔''

''زین موہنجوڈارو اکیلا گیا تھا؟''

''نہیں، میں اس کے ہمراہ تھا۔ دو بندے اور بھی تھے، کالج کے دو ساتھی؛ مجسمہ ساز خلیق اور مصور تخیل۔ دونوں زین کی طرح نشہ کرتے تھے۔ موہنجوڈارو جاتے جاتے وہ ٹرین میں چرس پیتے رہے۔ جب ہم موہنجوڈارو پہنچے، زین کو چرس کے باعث 'حال' چڑھا ہوا تھا۔ ہم میوزیم میں داخل ہوئے تو اسے دراوڑی

رقاصہ کی وہ چھوٹی سی مورت دِکھائی دی جو میوزیم میں آنے والے لوگوں کی آؤ بھگت کرتی تھی۔ وہ اسے ایک گھنٹے تک تکتا رہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔''

''وہ ایسے کیوں رو رہا تھا؟''

''کیونکہ اس کی سمجھ میں اچانک یہ بات آئی تھی کہ یہ مورتی اسی ہستی کا مادی روپ تھا جو اسے موہنجو ڈارو بلا رہی تھی۔ اسے احساس ہوا تھا کہ وہ کوئی معمولی رقاصہ نہیں تھی؛ وہ ایک دراوڑی دیوی تھی۔ پھر جب وہ اپنے 'حال' میں سے باہر نکلا تو اس نے ہمیں دیوی کے پاس بلایا اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا؛ ''یارو، اس سے ملو! یہ ہمارے سپت سندھو کی دراوڑی دیوی ہے۔ سپت سندھو کی عورتیں اس کے مانند دلیر، نڈر اور بے ساختہ تھیں مگر غیر لوگوں نے انھیں اپنے قابو میں رکھنے کے لیے بہت جتن کیے۔ آریائی لوگوں نے انھیں دیوداسی بنا کر اپنے مندروں میں بند کیا؛ مغلوں نے انھیں اپنے حرموں میں چھپایا اور انگریزوں نے انھیں نوکرانیوں کا درجہ دے کر اپنے گھروں میں قید کیا۔ مگر ان عورتوں نے کسی دور میں سر نہیں جھکایا۔ ان کی نسل ابھی موجود ہے۔ ان کی اولاد ابھی تک خانہ بدوشوں کی بستیوں یا نگینہ بازار کے چکلوں میں موجود ہیں۔ وہ اپنی پردادی دیوی کی طرح بے لباس ہونے کے بعد چوڑیاں اور کینٹھے پہنے رکھتی ہیں اور رانوں پر ہاتھ مار کر مردوں کو للکارتی ہیں۔'' میں اس کے منھ سے نگینہ بازار کا ذکر سن کر پریشان ہو گیا۔ وہ غلط قسم کی عورتوں کی اداؤں سے بخوبی واقف لگتا تھا۔ میں اسے صرف چرس کا شوقین سمجھتا تھا، اب پتہ چلا کہ اسے رنڈی بازی کا شوق بھی تھا۔''

''زین کے اس بیان کا آپ پر کچھ اثر ہوا؟''

''ہاں، خاصا اثر ہوا۔ اس کی باتیں ہمارے دل میں اتر گئیں اور ہم نے رقاصہ کے سامنے قسم کھائی کہ ہم آج سے اس کی لاج اور حرمت قائم رکھیں گے اور اس کی میراث کو سنبھال لیں گے۔ پھر ہم موہنجو ڈارو سے چل پڑے اور واپسی کے سفر کے دوران، ٹرین میں بیٹھتے بیٹھتے ہم نے ایک نمائش کا پروگرام بنایا۔ یہ نمائش موہنجوڈارو کی رقاصہ کے آگے ایک خراجِ تحسین تھا۔ ہم چاروں کو اس نمائش میں اپنے اپنے ڈھنگ سے خراجِ تحسین پیش کرنا تھا۔''

میں فقیر سے اس نمائش کے متعلق پوچھنا چاہ رہا تھا مگر مجھے اپنا وعدہ یاد آ گیا، میں نے کہا ''لیں جی! یہ میرا آخری سوال تھا۔ آپ کی مہربانی، آپ نے میرے لیے وقت نکالا اور میرے سوالوں کا جواب دِیا۔ مگر میں آپ سے مزید سوال پوچھنا چاہتا ہوں، آپ سے دوبارہ ملاقات ہو سکتی ہے؟''

فقیر کا جواب تھا؛ ''ضرور جی! آپ اتوار کو میرے غریب خانے پر تشریف لائیں؛ صبح دس بجے۔ میں آپ کو اپنا ایڈریس میسیج کرتا ہوں۔''

اِس کے ساتھ ہی فقیر سے میری پہلی ملاقات اختتام کو پہنچی۔

۳

اِتوار کے روز میں دس بجے فقیر کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ کوٹھی جوہر ٹاؤن میں تھی اور بالکل نئی تعمیر ہوئی تھی۔ فقیر نے دروازہ کھولا اور مجھے اپنی بیٹھک میں بٹھایا جس کی سجاوٹ دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ بارہ چودہ گملے سجے ہوئے تھے اور ہر گملے میں پلاسٹک کے رنگ برنگ پھول تھے۔ فقیر نے میری پریشانی بھانپ لی اور کہا:

''اصلی گملوں میں جعلی پھول دیکھ کر آپ بیزار ہو گئے! آپ کو یہ امید نہیں تھی کہ ایک آرٹسٹ کے گھر میں ایسی سستی اور گندی سجاوٹ ہو گی! لیکن میں اپنی صفائی یوں پیش کروں گا کہ میں نے نہیں، میری بیوی نے یہ بیٹھک سجائی ہے، اور یقین مانیں کہ میں بھی آپ کی طرح پلاسٹک کے پھولوں سے نفرت کرتا ہوں۔ مگر میں مجبور ہوں، میری بیوی کو جعلی پھول پسند ہیں۔ ان میں اسے سہولت محسوس ہوتی ہے، کیونکہ اِنھیں نہ پانی چاہیے نہ دھوپ۔ انھیں چار دِن بعد پھینکنا نہیں پڑتا۔ یہ لافانی ہیں۔ خیر ان پھولوں کو ماریں گولی، اور اس طرف دیکھیں!'' فقیر نے ایک دیوار کی طرف اشارہ کیا جس پر دس بارہ فوٹو لگے ہوئے تھے۔ ان میں ایک کھچڑی ڈاڑھی والا وردی پوش درشن دے رہا تھا، جس کے ساتھ مولانا مودودی، حفیظ جالندھری، مجید نظامی یا جنرل ضیاء الحق جیسے بڑے لوگ کھڑے تھے۔ میں نے فقیر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا اور اس نے فوراً تفصیل بیان کر دی؛ ''اس دیوار کو میں نے 'دیوارِ گریہ' کا نام دے رکھا ہے۔ یہ میرے سسر مرحوم کی یادگار تصویروں کے لیے مخصوص ہے۔ وہ فوج میں بریگیڈیئر تھے۔ ان سب پہنچے ہوئے اور روشن خیال لوگوں کے ساتھ ان کے مراسم تھے۔ یہ تصویریں ان مراسم کے دلائل ہیں۔'' اس کے ہونٹوں پر ایک طنز بھری، شرارتی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

اچانک ایک دوشیزہ بیٹھک میں حاضر ہوئی۔ وہ مشرقی شرم وحیا کا سراپا تھی؛ سر پہ چادر، آنکھیں ہر دم جھکی ہوئی اور ہونٹوں پر ایک مبہم تبسم، اس نے ایک ٹرے اٹھائی ہوئی تھی جسے اس نے بیٹھک کی چھوٹی میز پر رکھ دیا۔ ٹرے میں چائے سے بھری دو پیالیاں، چینی اور زیرے والے بسکٹ درشن دے رہے تھے۔ ٹرے رکھتے ہوئے دوشیزہ نے فقیر سے پوچھا؛ ''ابو جی، آپ کی میڈیسن لاؤں؟''

''ابھی نہیں بیٹا، بس تم جاؤ، اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر دو۔ تھینک یو بیٹا!'' فقیر نے جواب دِیا۔

دوشیزہ باہر چلی گئی۔ دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔

''یہ میری چھوٹی صاحب زادی ہے، ماشااللہ اپنی ماں پر گئی ہے، نمازی، پرہیزگار۔ آج کل قرآن شریف حفظ کر رہی ہے۔ مصوری میں اِسے کوئی دِلچسپی نہیں۔'' فقیر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ قائم تھی مگر اس مسکراہٹ میں سے اُداسی جھلک رہی تھی۔

''آپ بیمار ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، دو سال پہلے اسٹروک ہوا تھا، اس وقت سے میں دوائیں لے رہا ہوں، لیکن میری اصلی دوا یہ ہے۔'' فقیر نے اپنی جیب میں سے افیون کا ایک ٹکڑا نکالا اور مجھے دکھایا؛ ''یہ میرا سہارا ہے، میری بیساکھی ہے، اِس کے بغیر میں کب کا خودکشی کر چکا ہوتا۔'' پھر اس نے وہ ٹکڑا اپنی زبان تلے رکھ لیا۔

''اس کی لت آپ کو کب پڑی؟''

''بہت سال ہوگئے۔ دراصل، بھارت سے لوٹنے کے بعد میں نے افیون کھانی شروع کی۔''

''آپ بھی بھارت گئے تھے، زین کی طرح؟''

''زین کی طرح نہیں، زین کے ساتھ، مگر یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ میرے ساتھ گیا تھا کیونکہ بھارت جانے کا پلان میرا تھا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ وہ اکیلا گیا تھا، مگر یہ سراسر غلط ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ کیسے ہوا؟ پوری داستان ہے۔ کاش میں مصنف ہوتا تو یہ داستان ضرور لکھتا۔ خیر، پچھلی ملاقات میں ہم کہاں پہنچے تھے؟''

''آپ موہنجوڈارو کی رقاصہ کا ذکر کر رہے تھے اَور بتا رہے تھے کہ اسے دیکھنے کے بعد آپ نے نمائش کا پلان بنایا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا ٹیپ ریکارڈر آن کر لیا۔

''جی ہاں، ہم نے اس بارے میں شکور صاحب سے بات کی؛ انھوں نے ہم پر بڑی کرم فرمائی کی، اس نمائش کے لیے کالج آف آرٹ کا ہال استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ ہم چاروں نے ہال میں رقاصہ کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے اپنی تخلیقات سجائی تھیں۔ خلیق آؤٹ سائیڈر آرٹ کا عاشق تھا، اس نے سڑک سے لوہے کی مختلف اشیا اٹھائیں؛ کیل، پیچ، راڈ، انھیں جوڑ کر ایک مجسمہ بنایا جس کا عنوان تھا: Dancing Girl from the Street۔ تخیل Dali کا مداح تھا۔ اس کی تصویر میں رقاصہ کی مورتی ایک مارو تھل کی ریت میں دھنسی ہوئی تھی مگر اس کا اوپری حصہ ریت سے باہر تھا۔ اس کی تصویر کا عنوان تھا: The Persistence of Dancing Girl۔ میں تو حضرت Cezanne کو اپنا امام مانتا تھا۔ میں نے اس کے انداز میں ایک سٹل لائف بنایا تھا، جس میں کچھ سیب، ایک کٹا ہوا تربوز اور رقاصہ کی مورت نظر آتی تھی۔ زین نے تین تصویریں پیش کیں، جن میں رقاصہ کو پھولوں کی ایک سیج پر آرام کرتے ہوئے، دو ہنسوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے اور کنول کے ایک پھول میں سے نکلتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ ان تصویروں کے سامنے ہمارے فن پارے ہیچ معلوم ہو رہے تھے۔''

''کیوں، ان میں کیا خرابی تھی؟''

''خرابی یہ تھی کہ ہماری بنائی ہوئی رقاصہ فرنگیوں کے انداز میں تھی، مگر زین کی رقاصہ کا انداز مقامی تھا۔ بچپن میں اس نے ہڑپا کے کمہاروں اور دستکاروں سے جتنے گُر سیکھے تھے، آخر وہ اس کے کام آئے تھے۔ اس کی تصویریں دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ وہ پینٹ کرتے وقت اپنی جُون بدل لیتا تھا۔ وہ سپت سندھو کے ایک قدیم فنکار میں بدل جاتا تھا۔ یہ فنکار حجم اَور تناظر کے اصولوں سے واقف نہیں تھا اَور لکیروں اور نقطوں کے معاملے میں اِنتہائی کنجوس تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایک تصویر میں زیادہ سے زیادہ چار نقطے اور آٹھ لکیریں موجود ہونی چاہئیں، اور دستخط کی جگہ کپاس کا ایک پھول دکھا دیتا تھا، جب کہ تصویروں کے پس منظر میں ایک شیوا پشو پتی یا ایک راجا پجاری نظر آتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان طاقتور ہستیوں کے اشیر باد کے بغیر کوئی تصویر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کی تصویریں واقعی کامیاب تھیں۔ زین ہمارے لیے ایک مثال تھا۔''

''کیسی مثال؟''

''آزادی کی مثال۔ زین نے مغربی کلاسیکی مصوروں سے جو کچھ سیکھا تھا، رقاصہ بناتے وقت اس نے وہ فراموش کر دیا تھا اور ہم سے بہتر فن پارے تخلیق کیے تھے۔ زین اپنی تصویروں کی زبانی ہمیں بتا رہا تھا کہ مغرب سے مستعار انداز یہاں کے موضوعات کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے۔ وہ ہماری نسل کا پہلا فنکار تھا جس نے مغرب کے اثر سے آزاد ہونے اور سپت سندھو کی روایت کی طرف مراجعت کرنے کا جتن کیا تھا۔''

''آپ کے گروپ کی کتنی نمائشیں منعقد ہوئیں؟''

''ایک ہی نمائش ہوئی، کیونکہ ہمارا گروپ کالج والی اس نمائش کے فوراً بعد ٹوٹ گیا تھا۔ زین رقاصہ کی تصویریں بناتا چلا گیا مگر ہم جلد ہی رقاصہ کو بھول گئے۔ میں جب بھی اس گروپ کے بارے میں سوچتا ہوں، میرا دل اداس ہو جاتا ہے۔ ہم ایک گلی سڑی اور بگڑی ہوئی نسل کے لوگ ہیں۔ دیکھیں، ہمارا کیا بنا۔ زین جل مرا، خلیق کا اوورڈوز ہو گیا، وہ زین کی طرح کا نشے باز تھا مگر وہ چرس سے زیادہ ہیروئن کا شوقین تھا۔ تخیل مولوی بن گیا، سننے میں آیا ہے کہ آج کل وہ کسی مسجد میں خطیب ہے۔ اور یہ فقیر ایک معمولی سا سرکاری مصور ہے جو رات دن قائداعظم، مادرِ ملت اور مشرقی دانش وروں کی تصویریں بناتا ہے جنھیں وہ اپنی جوانی میں گالیاں دیتا تھا۔ جس آدرش کو ہم اپنی آنکھوں میں سجا کر چلے تھے، سماج کے جلادوں نے ان کا خون کر دیا۔'' یہ کہتے ہوئے فقیر کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

سوالات کا رخ بدلتے ہوئے میں نے فقیر سے ایک نیا سوال پوچھا:

''یہ بتائیں، کیا زین کے نئے انداز کو Primitivism کہا جا سکتا ہے؟''

''جی ہاں، کہا جا سکتا ہے۔'' فقیر نے اپنی جیب میں سے رومال نکالا اور وہ اپنی آنکھیں صاف کرنے لگا۔

''سو یہ Primitivism اس کی مصوری تک محدود تھا، یا اس کا لباس اور رویہ بھی Primitivism ہو گئے تھے؟'' میں نے زین کی لنگی اور اس کے گانجا پینے کے بارے میں بہت سی کہانیاں سن رکھی تھیں اور ان کی تصدیق چاہتا تھا۔

''جی اس کی زندگی بڑی Primitivism ہو گئی تھی۔ وہ primitive قسم کی تصویریں بناتا تھا اور ان تصویروں کو بنانے کے لیے خانہ بدوشوں اور طوائفوں کو پوز کرواتا۔ وہ ایک primitive فرد کی طرح لمبے لمبے بال رکھتا، کانوں میں مندریاں پہنتا، لنگی باندھتا اور ننگے پاؤں چلتا۔ وہ صرف گانجا پیتا اور اسے ایک چلم میں ڈال کر پھونکتا۔ گانجا پی کر رات کو دریا کی طرف چل پڑتا اور اس کے کنارے پر بیٹھ کر یوگا کرتا۔ ہاسٹل میں میرا کمرہ زین کے کمرے کے قریب تھا۔ میں ہر روز شام کو زین کے پاس پہنچ جاتا اور اس کے ساتھ چلم کے کش لگاتا اور صبح تک ہمارا ساتھ رہتا۔ میں چلم کے کش لگاتا رہتا اور زین بولتا رہتا۔''

''زین کیا بولتا تھا؟''

''زین اس وقت سپت سندھو کی تہذیب کے بارے میں ہر طرح کی کتابیں اَور تحریریں پڑھتا۔ وہ مجھے سپت سندھو کی تہذیب کے بارے میں بتاتا رہتا۔ وہ کبھی سپت سندھو کی لپی کے بارے میں باتیں کرتا، کبھی شُو لِشو کی کہانیاں سناتا۔''

''یہ شُو لِشو کون ہے؟''

''حیرت کی بات ہے، آپ نے یہ نام کبھی نہیں سنا؟''

''نہیں، کبھی نہیں!''

''شُو لِشو سپت سندھو کی ایک مشہور ہستی تھا۔ وہ سمیریا گیا تھا اور وہاں شاہی دربار میں مترجم کا کام کرنے لگ گیا تھا۔ اس کا ذکر سمیریا کی لوحوں پر ملتا ہے۔ زین اسے اپنا پردادا گردانتا تھا اور اس کا اندازہ یہ تھا کہ شُو لِشو ایک فنکار تھا اور وہ سپت سندھو کا فن سمیریا لے کر گیا تھا۔ زین یہ بھی کہتا تھا کہ شُو لِشو' سمیریا چھوڑ کر یونان، پھر اِٹلی گیا تھا، اس لیے ان دونوں ملکوں کے قدیم فن پر سپت سندھو کے فن کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ زین گھنٹوں اس طرح کی کہانیاں سناتا۔ پھر رات کے دو یا تین بجے ہم زین کے کمرے کو 'خدا حافظ' کہتے اور دریا کی طرف چل پڑتے۔ وہاں ہم کنارے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے اور یوگا کرتے اور ہمیں لگتا کہ دریا بھی ہمارے دیکھا دیکھی یوگا کرنے لگا تھا؛ وہ ٹھہر گیا تھا، چپ ہو گیا تھا، اور اس کی سطح پر ایک سلوٹ بھی نہیں پڑتی تھی، ایک لہر بھی نہیں آتی تھی، ایک بلبلا بھی نہیں پھوٹتا تھا۔ دریا کے پرلے کنارے پر کچھ ملاح ایک الاؤ کے گرداگرد بیٹھے ہوتے اور الاؤ دیکھ کر ہماری مخمور آنکھوں کو یہ دھوکا ہوتا کہ وہاں کسی مردہ شخص کی چتا جل رہی ہے، اور ہمیں گمان ہوتا کہ ہمارے سامنے لاہور کے دریائے راوی کا پرلا کنارہ موجود ہی نہیں، وہاں ہڑپا یا موہنجوڈارو کے گھاٹ ہیں۔''

''اور آپ دونوں اس زمانے میں ہندوستان چلے گئے؟''

''ہاں!''

''کیسے؟''

''لمبی کہانی ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ سنائیں جی!''

فقیر نے ہمت پکڑنے کے لیے افیون کا ایک اور ٹکڑا منھ میں ڈالا اور پھر کہانی سنانے لگا۔

''ایک شام جب میں گانجا پینے کے لیے زین کے پاس پہنچا، اس نے مجھے کچھ چھوٹے چھوٹے دانے دکھائے اور کہا کہ یہ دانے میکسیکو سے آئے ہیں، بہت جان دار ہیں۔ میکسیکو کے پہاڑوں کے باسیوں کو جب اپنے پردادوں کی روحوں سے بات چیت کرنی ہوتی ہے، کوئی صلاح یا ہدایت لینی ہوتی ہے، تو وہ یہی دانے اپنی چلموں میں پھونکتے ہیں۔ کیا میں انھیں پھونکنے کے لیے تیار تھا؟ میں پھنّے خاں بن گیا۔ میں نے فوراً دانے چھین لیے اور چلم میں ڈالے، چلم جلائی، تین گاڑھے کش لیے، اور چلم کو زین کی طرف بڑھا دیا۔ زین نے بھی تین گاڑھے کش لیے اور چلم بجھ گئی۔ تھوڑی دیر کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ پھر زین نے

ایک کہانی شروع کی؛ ''یار، میں نے آج اخبار میں پڑھا کہ بھارت میں کسی راکھی گڑھی گاؤں کے پاس ایک شہر کے کھنڈر ملے ہیں، اور بھارت کے کھوج کاروں کا کہنا ہے کہ یہ شہر ہمارے ہڑپا اور موہنجوڈارو سے بھی بڑا ہے۔ ہمیں وہاں جانا چاہیے، مگر ہم کیسے جائیں؟ راکھی گڑھی اور ہمارے درمیان انگریزوں کی خونی لکیر ہے اور...'' زین اچانک چپ ہو گیا۔ دانے اس کے ذہن پر اثر کرنے لگے تھے۔ وہ بول نہیں سکتا تھا۔ دانے میرے دماغ پر بھی اثر کرنے لگ گئے تھے۔ میرا دماغ ایک گنبد بن گیا تھا، جس کے اندر الگ الگ آوازیں گونج رہی تھیں اور ان کی گونج ختم ہونے کو نہیں آ رہی تھی۔ سڑک پر سے ایک رکشا گزرا اور اس کا انجن میرے دماغ میں کافی دیر تک کھانستا رہا۔ کمرے میں ایک مچھر گھسا اور اس کا شور میرے دماغ کو پھاڑنے لگا۔ میں نے زین سے کہا ''یار، ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے، یہاں شور بہت ہو رہا ہے۔'' زین نے پوچھا؛ ''یار، کہاں چلیں؟'' مجھے زین کی نئی کہانی یاد آئی اور میں نے کہا: ''راکھی گڑھی۔'' زین کو یہ پلان اچھا لگا اور ہم نے ایک منٹ میں منصوبہ بنایا کہ ہم بارڈر تک جائیں گے، بارڈر کو پار کر لیں گے اور راکھی گڑھی کی گاڑی میں بیٹھ جائیں گے۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے، کمرے سے باہر نکلے۔ زین نے نکلنے سے پہلے ایک کتاب اٹھائی۔ وہ سارتر کی 'وجود اَور عدم وجود' تھی، جو کچھ مہینوں سے اس کے سرہانے پڑی تھی۔ زین کہہ رہا تھا کہ جب ہم سے پاسپورٹ یا شناختی کارڈ مانگا جائے گا، وہ یہ کتاب دکھا دے گا اور اعلان کرے گا کہ یہ ہمارا مشترکہ آئی ڈی ہے۔''

''پھر آپ بارڈر پہنچے؟''

''جی، مگر بڑی مشکل سے پہنچے۔ ہم بالکل ٹُن تھے اور ہمیں ہر طرح کے جھوٹے منظر دکھائی دے رہے تھے۔ جونہی ہم ہاسٹل سے باہر آئے، ہم نے سامنے ایک بڑا سا آئس برگ دیکھا۔ یہ برفانی دیو یہاں کیسے آن کھڑا ہوا تھا، خدا جانے! مگر ہم آگے بڑھے تو آئس برگ ایک دم آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ پھر ہم نے دیکھا کہ سڑک پانی سے بھری ہوئی تھی۔ کیا ہوا تھا، دریا میں سیلاب آیا تھا، خدا جانے! ہم آگے بڑھے تو سارا پانی ایک دم زمین میں جذب ہو گیا۔ ہمارے ساتھ کچھ دیر اسی طرح ہوتا رہا۔ پھر اچانک ایک وین ہمارے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ وین کے ڈرائیور نے نقاب اوڑھا ہوا تھا۔ اس نے کھڑکی میں سے سر باہر نکالا اور آواز لگائی؛ 'بیٹھ جائیں جی، میں بارڈر جا رہا ہوں۔' وہ کہاں سے آیا تھا، اسے ہماری منزل کی خبر کیسے ہوئی، خدا جانے! ڈرائیور کا نقاب دیکھ کر زین گھبرا گیا اور اس نے میرے کان میں کہا؛ 'یار یم دُوت وین چلا رہا ہے۔'' میں نے اسے تسلّی دی؛ 'نہیں یار، یم دُوت وم دُوت یہاں کوئی نہیں، بیٹھ جا، میں بھی بیٹھتا ہوں۔'' ہم وین میں بیٹھ گئے۔ وین بالکل خالی تھی۔''

''پھر آپ بارڈر پہنچے؟'' فقیر کی کہانی واقعی لمبی تھی۔ میں بے تاب ہو رہا تھا۔

''صبر کریں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وین میں کیا ہوا؟ سو وین بارڈر کی طرف چلنے لگی۔ ہم نہر کے کنارے کنارے جا رہے تھے اور نہر کے درخت دیکھ کر ہمیں لگ رہا تھا کہ وہ زندہ مخلوق ہیں۔ اچانک زین بول پڑا؛ 'یار، کتاب گم ہو گئی ہے!' 'وجود اور عدم وجود' اس کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ اس آئی ڈی کے بغیر

ہمارا کیا بن سکتا تھا؟ ہم نے وین میں اسے ڈھونڈا پر وہ نہ ملی۔ پھر زین نے کہا؛ 'وہ دیکھو، اس بندے کے پاس ہے!' وین کی آخری سیٹ پر ایک سُوٹڈ بُوٹد صاحب بیٹھے تھے اور ہمیں اپنی چوکور شیشوں والی عینک سے دیکھ رہے تھے۔ یہ مسافر کب بیٹھا تھا، خدا جانے! 'وجود اَور عدم وجود' اس کی گود میں پڑی تھی۔ عینک میں سے جھانکتی اس کی آنکھیں بہت انوکھی تھیں، ایسے لگتا جیسے ان کا آپس میں کوئی جھگڑا تھا۔ داہنی آنکھ مشرق کی طرف دیکھتی تھی اور باہنی مغرب کی طرف۔ پھر ہم نے اُس مسافر کو پہچان لیا۔ ہم نے اس کی تصویر اخباروں، رسالوں اور کتابوں میں دیکھی تھی۔''

''وہ کون تھا؟''

''ژاں پال سارتر صاحب؛ 'وجود اور عدم وجود کے مصنف!''

میں فقیر کو بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ اس نے کہا؛ ''آپ مجھے پاگل سمجھتے ہیں؛ مگر میں قسم کھا سکتا ہوں، وہ مسافر سارتر صاحب ہی تھے۔ وہ اپنی کتاب سنبھالنے کے لیے ہماری وین میں تشریف لائے تھے۔''

''آپ نے ان سے بات کی؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، ہمیں موقع نہیں ملا۔ وہ فوراً اپنی سیٹ پر سے اٹھے اور زین کو 'وجود اور عدم وجود' پکڑا کر ایک جن کی طرح غائب ہو گئے۔ ان کے غائب ہونے کے بعد وین رک گئی اور نقاب پوش ڈرائیور نے آواز دی 'لیں جی، بارڈر آ گیا!' ہم وین سے نیچے اتر گئے۔ وین فوراً چل پڑی۔ پھر ہم نے اپنے آگے پیچھے نظر دوڑائی، اور ایک سوال ہمارے ذہن میں آیا؛ یہ بارڈر ہے یا چاند کا کوئی علاقہ؟ یہ علاقہ بالکل ویران تھا۔ نہ گاؤں تھا نہ فصلیں تھیں، نہ جنگل تھا، نہ پیڑ تھے۔ چاروں طرف مٹی ہی مٹی تھی؛ خشک اور سلیٹی۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہم ایک وین سے نہیں، کسی خلائی جہاز سے اترے ہیں اور ایک انجان سیارے پر پاؤں دھر رہے ہیں۔ بھارت کس طرف تھا؟ کوئی پتہ نہیں۔ اچانک مجھے کچھ روشنی نظر آئی۔ کچھ دوری پر ایک دیا جل رہا تھا۔ اس وقت صرف ایک گردوارے کا دیا جل سکتا تھا۔ کوئی گرنتھی رات کی ڈیوٹی نبھار ہا تھا اور اس دیے کی روشنی میں جپ جی صاحب پڑھ رہا تھا۔ میں نے زین کا دھیان روشنی کی طرف دلایا اور کہا: 'دیکھو، وہاں گردوارہ ہوگا!' اور ہم گردوارے کی طرف چل پڑے، روشنی قریب سے قریب تر ہوتی گئی اور جب ہم اس کے قریب پہنچے تو پتہ چلا کہ روشنی کسی دیے سے نہیں، ایک سرچ لائٹ سے آ رہی تھی۔ سرچ لائٹ کے ہالے میں ہمیں خاکی پوش سکھوں کا ایک پورا جتھا نظر آیا۔ میں رک گیا اور زین سے کہا؛ 'زین، یہاں سکھ فوجی کھڑے ہیں!' اسی وقت ہم پر گولیوں کی برسات ہونے لگی۔ میں منھ کے بل زمین پر گر پڑا مگر اس قاتلانہ برسات میں زین کھڑا رہا اور سکھوں کو 'وجود اور عدم وجود' دکھاتا رہا۔ اس کتاب میں بڑی برکت تھی، گولیاں زین کے قریب سے گزریں مگر اسے ایک بھی نہ لگی۔''

''پھر آپ دونوں گرفتار ہوئے؟''

''جی، ہمیں تین مہینے کی سزا ہوئی۔ سزا کاٹنے کے لیے ہمیں جودھ پور جیل بھیجا گیا۔ وہاں ہم دونوں ایک کوٹھڑی میں بند تھے۔ زین کوٹھڑی کی چھوٹی سلاخوں والی کھڑکی کے پاس سارا دن کھڑا رہتا اور

باہر کا منظر دیکھتا رہتا۔ بڑا بور منظر تھا؛ ایک تھل تھا، کچھ ہجیر کے درخت، اور پانی کی ایک چھوٹی سی جھیل تھی۔ وہاں سے کوئی نہیں گزرتا تھا۔ مگر زین باہر دیکھتا رہتا' جیسے اسے یقین تھا کہ کسی نہ کسی دِن کوئی وہاں سے گزرے گا جس کی وہ راہ تکتا تھا۔ ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا۔ پھر ایک دن وہاں سے بنجارنوں کا ایک قافلہ گزرا اور جھیل کے پاس آ کے کھڑا ہو گیا۔ ایک بنجارن اپنی ڈاچی سے اتری اور خالی مشکیں لے کر جھیل کی طرف چلنے لگی۔ اسے دیکھتے ہی زین نے مجھے آواز دی؛ 'یار، رقاصہ آ گئی... رقاصہ!' میں نے کھڑکی میں سے باہر جھانکا اور زین سے متفق ہو گیا۔ بنجارن کے خدوخال سچ مچ موہنجوڈارو کی رقاصہ سے ملتے تھے، ایسے لگتا تھا جیسے رقاصہ نے بنجارن کا روپ دھار لیا ہو۔ اس نے جدید سماج سے ایک حد تک سمجھوتہ کیا تھا اور اپنے خوبصورت آبنوسی بدن کو گھاگرے اور بلاؤز میں چھپایا ہوا تھا مگر ساتھ ہی اس نے اپنی پہچان برقرار رکھی تھی۔ اس کے گلے میں ایک بھاری کینٹھا تھا اور بانہوں میں بہت سی چوڑیاں، اس کی چال اس کی دلیری اور بے باکی کی غماز تھی۔ وہ جھیل کے پانی سے اپنی مشکیں بھر کر کیسے مٹک مٹک کر قافلے کی طرف لوٹ رہی تھی اور اپنی ڈاچی پر کتنے اعتماد کے ساتھ سوار ہو رہی تھی۔ قافلہ چلا گیا اور ہم چپ چاپ اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ بعد میں وہاں سے کوئی نہ گزرا، مگر زین خوش تھا۔ اس پر منکشف ہوا تھا کہ رقاصہ ابھی زِندہ ہے۔ وہ موہنجوڈارو کے اجڑنے کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ اس تھل کی طرف بھاگ نکلی تھی، اور اس وقت سے اس تھل میں ایک ڈاچی پر سوار ہو کر ماری ماری پھر رہی ہے۔''

''اس انکشاف کا زین پر کیا اثر ہوا؟''

''اسے اس بنجارن کی ننگی تصویریں بنانے کا شوق چرایا، چنانچہ اس نے ایک لال ٹوپی والے سے کوئلے مانگے، اور وہ ان کوئلوں سے رات دن کوٹھڑی کی دیواروں کو بنجارن کی تجرباتی تصویروں سے سجاتا رہا۔''

''تجرباتی؟ اس نے کس طرح کا تجربہ کیا؟''

''اس نے وہاں کے تھل میں پکاسو کو لانے کا تجربہ کیا۔ وہ پکاسو کے آخری انداز میں بنجارنوں کے جسموں کی تصویر کشی کرتا اور ان کے سروں کو مونگ پھلی کی طرح چھوٹا کرتا، ان کی بانہوں اور ٹانگوں کو ٹہنیوں کی طرح لمبی کرتا، ان کی کمر کو ٹنڈوں کی طرح باریک دکھاتا، ان کے کولھوں اور چھاتیوں کو غباروں کی طرح پھلا دیتا، ان کے ہاتھوں کو بہت سی انگلیوں سے نوازتا۔ ان مخلوقات کو دیکھ کر کوئی سمجھ نہیں سکتا تھا کہ وہ کس قبیلے اور کس نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ زمینی اور سماوی، انسانی اور خدائی اور حیوانی اور نباتاتی لگتی تھیں۔''

''زین تو اپنے کام میں مشغول رہا، مگر آپ وقت کیسے گزارتے تھے؟''

''میں تو 'وجود اور عدم وجود' پڑھنے کا جتن کر رہا تھا مگر یہ مشکل کام تھا۔ ایک تو کتاب بڑی مشکل تھی، دوسرے زین ہر وقت شور مچاتا رہتا۔ وہ کام کرتے وقت اونچی آواز میں اپنی تصویروں اور اوزاروں کو گالیاں دیتا، 'او کوئلے، تم یک ہو!' 'او تصویرے، تم گشتی ہو!' زین ناراض رہتا تھا کیونکہ کوئلہ بنجارنوں کے

جسموں کی چمکتی رنگت سے انصاف نہیں کرسکتا۔ نتیجہ یہ تھا کہ تصویریں ادھوری لگتیں اور زین کو دیکھ دیکھ کر میں خود پر شرمندہ ہونے لگا۔''

''کیوں جی؟''

''کیونکہ میں کوٹھڑی میں صرف رہائی کا انتظار کر رہا تھا مگر زین اس دوران نئی تصویریں تخلیق کرتا تھا۔ اس کی تخلیقیت کو قید بھی روک نہیں سکی تھی۔ میں تو اس طرح کے تخلیقی مزاج سے بالکل محروم تھا۔ میں اپنے آپ کو فنکار یا مصور کیونکر کہلوا سکتا تھا۔ میں شرمندہ تھا اور زین سے جلتا تھا!''

''پھر آپ دونوں کی سزا ختم ہوگئی؟''

''ہاں، ہم رہا ہو کر ملک واپس پہنچے اور ہماری راہیں الگ ہوگئیں۔''

''الگ ہوگئیں، کیوں؟ یاری ختم ہوگئی؟''

''نہیں، مگر ہم نے علیحدہ علیحدہ کام کیا۔ زین نے کالج چھوڑ کر ایک اسٹوڈیو لے لیا اور وہاں اس نے اس تجرباتی سلسلے کو آگے بڑھایا جسے اس نے جیل کی کوٹھڑی میں شروع کیا تھا۔ شکور صاحب کو اس کے کالج چھوڑنے کا بہت افسوس ہوا، مگر وہ سمجھ گئے کہ زین ایک آزاد شخص تھا، اور کسی بھی ادارے میں فٹ نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے مصوری چھوڑ دی۔ مجھے جیل میں احساس ہوا تھا کہ میں ایک سچا فنکار نہیں ہوں۔ میں نے جلد از جلد کالج کی ڈگری لی اور ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ملازمت شروع کر دی۔''

''اور اسی وقت آپ نے افیون کھانا شروع کی؟'' میں نے اندازہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! آپ کا اندازہ صحیح ہے، آپ بہت سیانے ہیں۔ مصوری چھوڑنے اور کالج سے جانے کے بعد میری زِندگی بالکل بے مقصد ہوگئی تھی۔ میں دن بھر نوکری کرتا۔ رات کو سو جاتا۔ بس! سو اس بے مقصد زندگی کو سہارا دینے کے لیے میں نے افیون کھانا شروع کر دیا اور اب میرا حال آپ کے سامنے ہے۔ افیون کے بغیر میرا دماغ کام نہیں کرتا، مجھے چین نہیں آتا۔ ویسے آپ نے افیون کے بارے میں کیوں پوچھا؟''

میں شرمندہ تھا۔ دراصل فقیر کی شخصیت اور زندگی میں میری دِلچسپی بڑھ گئی تھی۔ میں اس کے بارے میں جاننے کے لیے بے تاب تھا۔ میں زین کی طرف پلٹ آیا اور پوچھا؛ ''کالج چھوڑنے کے بعد زین کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ وہ کیسا دور تھا؟''

''وہ اس کا ہپی دور تھا۔ پہلے 'ہپی ٹریل' اس شہر سے گزرتا تھا۔ گرمیوں میں لمبی زلفوں والے ہپی بڑی تعداد میں آتے تھے۔ زین ان کے فلسفے اور رویے سے بہت متاثر تھا۔ میں اس زمانے میں اکثر شام کو اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے نکلنے کے بعد زین کے اسٹوڈیو کا چکر لگاتا۔ وہاں ہر وقت دس بارہ ہپی موجود ہوتے جو گانجا پیتے اور گانے گاتے۔ وہ بہت شور مچاتے تھے مگر زین ان سے بیگانہ اپنے کام میں مصروف رہتا۔ جو تخلیقی جنون جیل میں زین پر سوار ہوا تھا، وہ شدت اِختیار کر گیا تھا۔ زین ایک ہی وقت میں چار الگ الگ تصویروں پر کام کرتا تھا۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ دیوار پر چار خالی کینوس لٹکا دیتا، اور ایک ہی ٹیوب سے پہلے کینوس پر ایک چھاتی، دوسرے پر ایک گھاگرا، تیسرے پر ایک چہرہ اور چوتھے پر ایک ناف بنا دیتا۔''

''ٹیوب سے، اس کے برش کا کیا بنا؟''

''اس نے اپنے برش پھینک دیے تھے۔ اس کے مطابق برش ایک نقصان دہ اوزار ہے جو رنگوں کی طاقت کو کم کر دیتا ہے۔ زین کو ٹیوب کے خالص اور وحشی رنگ پسند تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جیل میں زین کے پاس رنگ نہیں تھے اور رنگوں کی کمی نے اسے اتنا ستایا کہ اس نے قسم کھائی کہ جب اس کی رسائی رنگوں تک ہوگی تو وہ جی بھر کے انھیں استعمال میں لائے گا۔ آپ نے زین کی اس دور کی تصویریں دیکھی ہیں؟''

''جی ہاں، دیکھی ہیں!''

''تو پھر اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

''وحشیانہ Pysychedelism کے بدترین نمونے ہیں۔''

فقیر نے ہاں میں سر ہلایا؛ ''وحشیانہ Psychedelism کے بدترین نمونے ہیں۔ واہ جی واہ، آپ نے خوبصورت بات کی ہے۔ آپ نے ان تصویروں کے نقطوں کی طرف کبھی دھیان دیا؟ Psychedelism ان کے ایک ایک انچ سے ٹپکتا تھا۔

''تصویروں کے پس منظر میں جو چھوٹے چھوٹے نقطے چمکتے تھے؟''

''ہاں، اس زمانے میں اس کی سب تصویروں میں نقطے چمکتے تھے۔ یہ نقطے ہپی لوگوں کی دین تھے۔ زین نے مجھے ایک دفعہ بتایا کہ ایک دن جب اس کے ہپی مہمانوں نے اسے LSD کھلا دی تھی، اس کی آنکھوں میں اتنی بیداری آئی تھی کہ اسے نوریے یعنی نور کے ذرات نظر آنے لگے تھے۔ اور وہ نوریے ہندو عورتوں کی بندیوں کے مانند چمک رہے تھے۔ سو، زین اپنی تصویروں میں روشنی کی عکاسی سنہری نقطوں سے کرنے لگا۔ اوفوہ، میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ اس زمانے میں زین طوائفوں اور بنجارنوں کے پاس نہیں جاتا تھا۔''

''کیوں جی؟''

''کیونکہ اس کے اسٹوڈیو میں ہر رات ہپی ایک 'تانترک پارٹی' رکھتے جس میں وہ ضرور شامل ہوتا۔ سو بتائیں، جب بندے کا شوق مفت میں پورا ہوتا ہو، اسے طوائفوں اور بنجارنوں پر پیسے خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' اس کے ساتھ ہی فقیر کے چہرے پر ایک میلی سی مسکان ظاہر ہوئی۔ میں نے موضوع بدلنا مناسب سمجھا اور پوچھا:

''کیا زین کی Psychedelic تصویروں کی نمائش ہوئی تھی؟''

''جی ہاں، نِروانا آرٹ گیلری میں، جو شہر کی سب سے پہلی آرٹ گیلری تھی۔''

''کیسی پذیرائی ہوئی تھی؟''

''نقادوں نے بڑے اعتراض کیے۔ ایک نقاد نے بنجارنوں کے ننگے پن پر اعتراض کیا اور زین

کی تصویروں کو فحش لکھا۔ دوسرے نے اس کے رنگوں پر اعتراض کیا، زین کی تصویروں میں لال، نیلی، سبز، پیلی اور سفید پچکاریاں دیکھ کر وہ بیزار ہو گیا تھا؛ اس نے زین کی تصویروں کو 'اکھاڑے' کا نام دیا، ایسے اکھاڑے جن میں رنگ ایک دوسرے سے کشتی لڑتے رہتے اور جب وہ رنگ اکھاڑے میں لڑتے لڑتے تھک جاتے تو تصویر سے باہر چھلانگ لگا دیتے اور ناظرین کی آنکھوں پر حملہ آور ہو جاتے۔ پھر ایک تیسرا نقاد تھا، جس نے زین کو بزدل کہا، اس نے لکھا کہ زین میں تجریدی تصویریں بنانے کا حوصلہ نہیں ہے، اس کی تصویریں تجرید کی حدوں کو چھو لیتی تھیں، مگر چھوتے ساتھ ہی پیچھے ہٹ جاتی تھیں۔''

''یہ بالکل سچی بات ہے۔ مگر یہ بتائیں، کیا زین کی تصویریں بک گئی تھیں؟''

''ہاں، تقریباً سب کی سب بک گئیں۔ شہر کے نودولتیوں کو زین کی بنجارنوں کے ننگے بدن بہت اچھے لگے۔ لہٰذا انھوں نے وہ تصویریں خرید لیں مگر زین ان سے بہت نالاں تھا۔''

''وہ کیوں؟''

''کیونکہ خریداروں نے اس کا مقصد نہیں سمجھا تھا۔ اس کا مقصد امیروں کو شہوانی لالچ دینا نہیں تھا، اس خوبصورت اور دلیر ہستی سے ان کا تعارف کروانا مقصود تھا جو آریاؤں، مغلوں اور انگریزوں کے استحصال سے مسلسل بچتی رہی تھی۔ بہرحال، ان لوگوں کے پیسوں نے زین کو فکرِ معاش سے آزاد کر دیا اور ہجرت کرتے وقت زین کافی پیسے ساتھ لے گیا۔

میں نے پہلی بار سنا کہ زین نے ہجرت بھی کی تھی، میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی ساری عمر اسی ملک میں گزری تھی، چنانچہ میں نے فوراً پوچھا؛ ''کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ زین نے ہجرت کب اور کیوں کی تھی؟''

''ضرور جی! اس زمانے میں مولویوں کا زور روز بروز بڑھ رہا تھا اور ماحول میں آہستہ آہستہ مذہب رچ بس رہا تھا۔ مولوی نفاذ شریعت کا مطالبہ کر رہے تھے، اور انھوں نے ملک کے صدر کو شراب خانے، افیون کے ٹھیکے اور رقص گاہیں بند کرنے پر مجبور کر دیا۔ لوگوں کو اندیشہ تھا کہ بہت جلد مزید پابندیاں عائد ہو جائیں گی۔ فنونِ لطیفہ بھی اس ماحول سے متاثر ہوئے۔ آپ کو پتہ ہوگا کہ اس زمانے میں شکور صاحب کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔''

''نہیں۔ میں نہیں جانتا۔''

''واقعی؟ شکور صاحب کو مٹیاروں کی فحش تصویریں بنانے کا شوق تھا، اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کسی محسن کے گھر میں ان تصویروں کی نمائش ہوتی تھی۔ ایک روز، کسی آرکیٹکٹ کے گھر میں اسی طرح کی ایک نمائش کا افتتاح ہو رہا تھا۔ مہمان اکٹھے ہو گئے تھے اور شکور صاحب ان سے گفتگو کر رہے تھے۔ اچانک چالیس پچاس مولوی نظر آئے جو لاٹھیوں، بیلچوں اور نیزوں سے لیس تھے، انھوں نے اپنے ہتھیاروں سے شکور صاحب کے فن پاروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پھر انھوں نے شکور صاحب کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور شکور صاحب مارے خوف کے ان کے سامنے قسم اٹھانے پر مجبور ہو گئے کہ وہ آئندہ فحش تصویریں

نہیں بنائیں گے اور وہ اسلامی آرٹ تخلیق کریں گے۔ شکور صاحب بااصول اور اخلاق والے آدمی تھے۔ انھوں نے اپنی قسم پوری کی اور مصوری چھوڑ کر خطاطی شروع کر دی۔ اپنے استاد کا یہ انجام دیکھ کر زین سہم گیا۔ اس کا اسٹوڈیو ظلمت میں نور کا ایک جزیرہ تھا۔ وہ ڈر گیا کہ کسی دن مولوی اس پر ہلہ بول دیں گے، چنانچہ وہ اپنے کچھ ہی مہمانوں کے ساتھ ملک سے چلا گیا۔''

''کیا زین نے آپ کو اپنے اِرادے کے بارے میں کچھ بتایا تھا؟''

''نہیں، اس نے کسی شخص کو بھی اپنے پلان کی خبر نہ ہونے دی تھی۔ مجھے اس کی ہجرت کا یوں پتہ چلا کہ ایک شام میں تفریح کی غرض سے زین کے اسٹوڈیو پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اسٹوڈیو کا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے اندر جھانکا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اسٹوڈیو خالی تھا۔ چھوٹے سے باورچی خانے سے ایک عجیب قسم کی بو آ رہی تھی۔ میں وہاں گیا تو دیکھا کہ بہت سی جلی ہوئی تصویریں چولھے کے قریب پڑی تھیں۔ زین کو جلدی تھی۔ وہ اپنی تصویریں ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ جلد ہی مولوی ملک پر راج کریں گے، اور یہ سب تصویریں سرِعام نذرِ آتش کر دی جائیں گی۔ وہ مولویوں کو یہ موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے خود ہی بے دردی سے اپنے فن پارے جلا دیے۔ زین صحیح وقت پر چلا گیا۔ ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد مولویوں نے جو قانون بنایا، اس کے تحت زین جیسے آزاد بندوں کو قید کیا جاتا یا عوام کے سامنے کوڑے مارے جاتے۔''

''ظاہر بات تھی، مولویوں کی حکومت زین جیسے آزاد شخص کو کیسے برداشت کرتی؟ خیر، مجھے یہ بتائیں کہ زین کہاں چلا گیا؟''

''یورپ!''

''وہاں اس نے کتنے سال گزارے؟''

''آٹھ سال۔''

''کیا یورپ کا قیام خوش گوار رہا؟''

''ہاں، مگر صرف شروع میں۔ زین اپنے ساتھ ڈھیر سارے پیسے لے گیا تھا۔ سو وہ شہر شہر، ملکوں ملکوں گھومتا رہا اور مزے کرتا رہا۔ وہ ہپی لوگوں کی بستیوں میں ڈیرا لگاتا اور وہاں ہر طرح کی لڑکیوں سے جنسی تعلقات قائم کر لیتا اور ہر طرح کی منشیات آزماتا۔''

''آپ کو زین کا حال احوال کیسے معلوم ہوتا؟''

''زین وہاں سے خطوط بھیجتا رہتا۔ ہر مہینے اس کا کوئی نہ کوئی خط آ جاتا جو کسی مختلف ملک سے پوسٹ کیا گیا ہوتا؛ کبھی فرانس، کبھی ناروے، کبھی جرمنی، کبھی اٹلی سے۔ دو سال تک اس کے خطوط آتے رہے۔''

''وہ کیا لکھتا تھا؟''

''وہ عام طور پر لکھتا تھا کہ منشیات لینے کے بعد کس طرح کے کرتوت کرتا تھا۔''

''وہ کس طرح کے کرتوت کرتا تھا؟''

''پیرس میں اس نے LSD لینے کے بعد ہمارے قومی سفارت خانے کے سامنے اپنا پاسپورٹ جلا دیا تھا۔ اوسلو میں اس نے مشروم کھائے تھے اور برف بھری سڑکوں پر ساری رات ننگا پھرتا رہا تھا۔ برلن میں اس نے ایسڈ لے کر اس دیوار پر پیشاب کیا تھا جس کے باعث جرمنی دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ اس کے خطوط مزے دار ہوتے تھے مگر حقیقت مزے دار نہیں تھی۔ زین نے پانچ ملکوں میں سیاسی پناہ کے لیے درخواست دی تھی اور سب درخواستیں خارج ہو گئی تھیں۔ اس کے پیسے ختم ہو رہے تھے۔''

''پھر زین نے کیا کیا؟''

''اس نے یورپ میں غیر قانونی طریقے سے رہنے کا فیصلہ کیا۔''

'اس نے کہیں کام کیا؟''

''شاید کیا۔''

''آپ کو نہیں پتہ؟''

''نہیں پتہ''

''کیوں؟''

''کیونکہ اس کے خطوط آنا اچانک بند ہو گئے تھے اور وہ گم ہو گیا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اس کے خطوط کا جواب نہیں لکھتا تھا۔''

''اچھا، پر جب خطوط آنا بند ہو گئے، آپ نے دوبارہ زین کے ساتھ رابطہ کرنے کی کوشش کی؟''

''نہیں!''

''کیوں؟'' یہ جواب سن کے مجھے دھچکا لگا تھا۔

''بس، میں مصروف تھا۔ میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میری شادی ہو گئی تھی اور میری بیٹیاں پیدا ہو گئی تھیں۔''

مجھے یقین تھا کہ فقیر جھوٹ بول رہا تھا۔ ایک خط لکھنے یا کال کرنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟ مگر میں نے مزید تفصیل میں جانا مناسب نہ سمجھا کیونکہ فقیر ناراض لگ رہا تھا۔ میرے ضدی سوالوں نے اسے تنگ کر دیا تھا۔ وہ بار بار اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ میں چپ تھا اور سوچ بچار کر رہا تھا۔ میں اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا کہ اس زمانے میں فقیر کو زین سے ہمدردی کیوں نہیں تھی، اور میرا اندازہ یہ تھا کہ فقیر زین سے اِتنا حسد کرتا تھا کہ وہ اس کے گم ہونے پر خوش تھا۔

فقیر نے میری سوچ کے دھاگے کو کاٹا اور کہا ''چلیں جی، دو بج گئے ہیں۔ میں نے اپنی بیگم سے وعدہ کیا تھا کہ اسے دوپہر کو شاپنگ کراؤں گا۔ اس نے جعلی پھول خریدنا ہیں؛ پلاسٹک کے پھول۔ کیا آپ مجھے کل مل سکتے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''پھر آپ کل شام پانچ بجے مجھے لارنس گارڈن کے کیفے ٹیریا میں ملیں۔''

میں شکریہ ادا کر کے اٹھا اور چل پڑا۔ فقیر کے ساتھ میری دوسری ملاقات اختتام کو پہنچ گئی تھی۔

۴

اگلے دن میں جلدی جلدی لارنس گارڈن کی طرف جا رہا تھا اور راستے میں یہ سوچ رہا تھا کہ فقیر سے میری یہ تیسری ملاقات نہایت اہم تھی، کیونکہ چوتھی ملاقات کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ پروفائل تیار کر کے اگلے تین دن میں مدیر کو پہنچانا تھی۔ فقیر سے بہت ساری باتیں کرنا تھیں۔ اس کے ساتھ میں زین کی ہجرت اور مراجعت اور اس کی زندگی کے آخری دور اور اس خفیہ شاہکار کے بارے میں باتیں کرنا چاہتا تھا جس کا ذکر اس نے پہلی ملاقات کے شروع میں کیا تھا۔ اور پھر زین کی پراسرار موت کے بارے میں بھی پوچھنا تھا۔ زین کی کوٹھی میں آگ کیسے لگی تھی، اس کا کیا خیال تھا؟ اتنی زیادہ باتیں ایک ہی ملاقات میں کیونکر کی جاسکتی تھیں، مگر یہ سب باتیں ہر صورت میں کرنا تھیں۔ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

فقیر کی شخصیت کے سب پرت آہستہ آہستہ میرے سامنے کھلنے لگے تھے اور اس کے اندر کا تضاد اجاگر ہونے لگا تھا۔ فقیر ایک نارمل شخص تھا، ایک بورژوا تھا جو شہر کے ایک اچھے علاقے میں رہائش پذیر تھا، مگر ساتھ ہی ایک افیونچی بھی تھا، اور اس کے دل میں غیر معمولی مقدار میں تلخی جاگزیں تھی؛ ایسی تلخی جس کی امید ایک خوش حال اور بورژوا شخص سے نہیں کی جاسکتی۔ زین کے ساتھ اس کے تعلقات اس تضاد کے آئینہ دار تھے۔ فقیر اسے بیک وقت پسند اور ناپسند کرتا تھا اور اسے ایک دوست اور ایک دشمن گردانتا تھا۔ فقیر ایک انوکھی شخصیت کا مالک تھا اور اس انوکھے پن کی وجہ سے اس میں میری دِلچسپی بڑھ گئی تھی۔ زین کے بارے میں یہ سارا انٹرویو فقیر کی زندگی کی معلومات حاصل کرنے کے بارے میں ایک بہانہ بن گیا تھا۔ میں خوش تھا کہ مجھے اس سے ملنے کا ایک اور موقع مل رہا تھا۔

یہ سوچتے سوچتے میں لارنس گارڈن کے کیفے ٹیریا پر جا پہنچا۔ فقیر ایک میز پر بیٹھا چائے سے بھری پیالی میں ہرے رنگ کے پاپڑ کا ایک ٹکڑا ڈبو رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا؛ ''آؤ جی بیٹھو! آپ پاپڑ کھائیں گے؟ مگر یہ کوئی عام پاپڑ نہیں ہے۔''

میں نے کالج آف آرٹ کے دنوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ اس طرح کے بہت پاپڑ کھائے تھے۔ ان کا نشہ بہت تیز تھا۔ میں نے معذرت کی اور ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

فقیر نے کہا، ''آج ہمارے پاس وقت بہت کم ہے، میں سات بجے تک ہی آپ کے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں۔ مجھے رات کو اپنی فیملی کے ساتھ ایک ولیمے پر جانا ہے۔ ہاں پوچھیں، جو بھی پوچھنا ہے!''

میں نے وقت ضائع کیے بغیر فوراً ٹیپ ریکارڈر آن کر کے پوچھا؛ ''پچھلی ملاقات میں آپ نے اس بات کا ذکر کیا تھا کہ زین یورپ چلا گیا تھا اور دو سال بعد اس کے خطوط آنا بند ہو گئے تھے۔ وہ گم ہو گیا تھا۔ پھر وہ کب اور کیسے مل گیا؟''

"وہ چھے سال بعد مل گیا۔"
"ٹھیک ہے، مگر وہ کیسے مل گیا؟"
"لمبی کہانی ہے، آپ کو سناؤں؟"
"بسم اللہ!"

"شادی کے بعد میں نے ایڈورٹائزنگ ایجنسی چھوڑ دی، وہ تنخواہ کم دیتے تھے، اس میں میری فیملی کا گزارہ نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی بیگم کے کہنے پر سرکاری مصوری شروع کر دی اور عدالتوں، یونیورسٹیوں اور دفتروں کے لیے علمائے مشرق، قائداعظم اور مادرِملت کی بڑے سائز کی تصویریں بنانا شروع کیں۔ میں نے خاصے پیسے اور اتنی شہرت کمائی کہ نئی شہری حکومت کے وزیرِثقافت، جناب آصف رحمان نے مجھے طلب کیا اور اپنے دفتر میں قراردادِ پاکستان کے موضوع پر ایک دیواری تصویر بنانے کی فرمائش کی۔ یقین مانیں، میں نے مائیکل اینجلو سے زیادہ مشقت کی اور ایک مہینے میں تصویر مکمل کر ڈالی۔ یہ کام Sixtine Chapel سے کم مشکل نہیں تھا۔ آپ سوچیں، بیس شخصیات کے قدِ آدم پورٹریٹ بنانا تھے۔ آصف رحمان میری تصویر سے خاصے متاثر ہوئے، اور انھوں نے میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے مجھے کالج آف آرٹ کے وائس پرنسپل کی نوکری دلوا دی۔"

"مگر زین؟"

"صبر کریں جی! میں آہستہ آہستہ زین کی طرف آ رہا ہوں۔ سو، وائس پرنسپل ہونے کے ناتے مجھے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ میں بین الاقوامی سیمیناروں اور اجلاسوں میں کالج کی نمائندگی کرنے لگا۔ فلورنس میں ایک عالمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، جس میں، میں نے کالج کی طرف سے شرکت کی۔ ایک روز میں سیشن سے فارغ ہو کر کانفرنس ہال سے نکل رہا تھا کہ مجھے ایک سانولا سا بندہ نظر آیا، جو ایک پبلک ڈسٹ بن میں ہاتھ ڈال رہا تھا۔ وہ اس میں سے روٹیاں تلاش کر رہا تھا اور میں نے اسے فوراً پہچان لیا... وہ زین تھا۔"

"واقعی؟"

"جی ہاں! مگر اس کی حالت بہت خراب تھی۔ اس کے کپڑے مَیلے اور پھٹے ہوئے تھے، بال بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اسے آواز دی؛ 'زین... زین!' مگر وہ اپنا نام سنتے ہی بھاگ نکلا اور بھاگتے بھاگتے میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔"

خدا جانے کیوں، مگر فقیر کا قصہ مجھے من گھڑت معلوم ہو رہا تھا لیکن فقیر کو یہ تاثر دینے کے لیے کہ مجھے اس کے قصے پر یقین تھا میں نے پوچھا؛ "پھر آپ نے کیا کیا؟"

"میں نے پورے شہر میں اسے تلاش کیا۔ احساسِ گناہ مجھے ستا رہا تھا۔ میں نے کئی سالوں سے اپنے یار سے غفلت برتی تھی اور اب مجھے اپنی غفلت کا نتیجہ نظر آیا تھا۔ میرا یار ایک آوارہ کتا بن گیا تھا۔ میں زین کو ڈھونڈتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ مجھے مل گیا تو میں اسے اپنے ساتھ وطن لے جاؤں گا اور اس کی

خدمت کروں گا، اس طرح میں اپنی غفلت کا کفارہ ادا کروں گا، مگر زین کہیں نہ ملا اور میں بیزاری کے عالم میں وطن لوٹ آیا۔"

"پھر کیا ہوا؟"
"ایک معجزہ ہوا۔"
"کیسا معجزہ؟"

"دفتر میں زین کی کال آئی۔ خدا جانے میرا نمبر اسے کہاں سے ملا تھا۔ خیر، اس کی آواز سنتے ہی میں نے پوچھا؛ 'زین! میں نے تمھیں پچھلے ماہ فلورنس میں دیکھا تھا مگر تم بھاگ کیوں گئے تھے؟' زین کے لہجے میں تھوڑا سا غصہ تھا۔ اس نے جواب دیا؛ 'نہیں یار، میں تو پانچ سال سے فلورنس نہیں گیا۔ میں ان دنوں سسلی میں رہتا ہوں۔ تم نے ضرور کسی اور بندے کو دیکھا ہوگا۔' زین جھوٹ بول رہا تھا، مگر میں اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس بات پر شرم محسوس کر رہا تھا کہ میں نے اس کی غربت دیکھ لی تھی، اس لیے وہ حقیقت کی نفی کر رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ وہ واپس آنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا؛ 'خوش آمدید، جب مرضی ہو، آ جاؤ! مولوی یہاں سے چلے گئے ہیں، شہری حکومت ہے، آزادی ہے۔' زین نے کہا؛ 'مگر ایک مسئلہ ہے۔' 'کیا مسئلہ ہے؟' 'میں ملک میں کیسے رہوں گا، میرے پاس کوئی نوکری ووکری نہیں!' میں نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا: 'میں تمھیں نوکری دوں گا کالج میں، استاد کی نوکری!' میں نے اتنا بڑا وعدہ کیوں کیا۔ بس، اس وعدے میں میرے احساسِ گناہ کا زیادہ ہاتھ تھا۔ میں اپنی غفلت اور بے حسی پر پچھتا رہا تھا۔ زین نے کہا؛ 'میں آ رہا ہوں یار!' اور فون بند کرنے سے پہلے اس نے درخواست کی؛ 'یار، میرے پاس جہاز کے ٹکٹ کے لیے پیسے نہیں ہیں۔' میں پھر جذباتی ہو گیا۔ میں نے ٹکٹ کا بندوبست کرنے کا وعدہ کیا۔ زین نے مجھے اپنا ایڈریس لکھوایا اور اگلے روز میں نے اس ایڈریس پر ٹکٹ بھجوا دیا۔"

"تو زین واپس آ گیا؟"

"جی ہاں۔ میں نے اسے پک کرنے کے لیے اپنا ڈرائیور ایئرپورٹ بھیجا اور ڈرائیور اسے پک کر کے کالج کے گیسٹ ہاؤس میں لے آیا، جہاں اس کے لیے ایک کمرہ بک تھا۔ ڈرائیور نے بعد میں میرے سامنے اِس بات پر حیرانی کا اظہار کیا کہ زین کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ وہ پردیس میں آٹھ سال گزار کے خالی ہاتھ ملک واپس آیا تھا۔ پھر میں زین سے ملنے گیسٹ ہاؤس گیا، اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ ملاقات حالانکہ آٹھ سال کے بعد ہو رہی تھی لیکن میرے پاس اسے بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا اور اس کے پاس بھی مجھے بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ہم نے اس ساری ملاقات میں خاموشی اپنائے رکھی۔ سچ یہ ہے کہ شرم نے ہماری زبانوں پر تالے ڈال دیے تھے۔ زین اس وجہ سے شرمسار تھا کہ میں نے اس کی ذلالت دیکھی تھی اور میں اس لیے شرم محسوس کر رہا تھا کہ میں نے اس کے ساتھ جان بوجھ کر غفلت برتی تھی۔"

"یہاں آنے کے بعد زین کی کیا مصروفیت تھی؟"
"جی، وہ پڑھاتا تھا اور مصوری کرتا تھا۔"

''اس نے کوئی اسٹوڈیو بنایا تھا؟''

''ہاں، جب اسے کالج کی طرف سے پہلی تنخواہ ملی، اس نے گیسٹ ہاؤس چھوڑ دیا اور اقبال روڈ پر ایک اسٹوڈیو کرایے پر لے لیا اور پھر رات دن تصویریں بنانے لگا۔ عجیب بات یہ ہے کہ یورپ میں اس نے ایک بھی تصویر نہیں بنائی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ اس نے اوسلو میں Munch کی 'چیخ' دیکھی تھی اور اتنا متاثر ہوا تھا کہ اس نے مصوری چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر غالباً وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اسے تو غربت نے مصوری نہ کرنے دی تھی۔ اس کے پاس روٹی کے لیے پیسے نہیں تھے۔ وہ برش، رنگ اور کینوس کیونکر خریدتا۔ اب زندگی آسان ہوگئی تھی۔ تنخواہ باقاعدگی سے ملتی تھی، مصوری کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ لہٰذا وہ مصوری میں مصروف ہو گیا۔ وہ ان تصویروں کی تخلیق کاری میں مصروف تھا جو غربت نے اسے تخلیق نہیں کرنے دی تھیں۔ غیر تخلیق شدہ تصویریں بے شمار تھیں۔ پھر ایک روز مجھے نروانا آرٹ گیلری کی طرف سے دعوت نامہ ملا۔ زین کی نئی تصویروں کی نمائش کے افتتاح کے لیے مجھے دعوت دی گئی تھی۔''

''آپ افتتاح کے لیے گئے؟''

''جی ہاں! میں وہاں گیا تھا۔ نروانا میں اتنی بھیڑ تھی کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ نمائش دیکھنے کے لیے سینکڑوں لوگ آئے تھے۔ شہر کی تمام اہم ہستیاں موجود تھیں۔ کاروباری اَور سیاسی ہستیاں، جن کے منھ میں سگریٹ سلگ رہے تھے؛ خواتین ہستیاں، جن کے کھنڈر چہروں پر میک اپ کی موٹی موٹی تہہ تھی؛ فنکار ہستیاں، جن کی زلفیں کندھوں تک دراز تھیں؛ اور نقاد ہستیاں جو گنجی تھیں اور تصویروں کے سامنے کھڑی ہو کر اپنی ماہر اور مشاق آنکھوں سے ان کے ٹیکنیک اور کمپوزیشن کو جانچتی تھیں؛ مگر زین اس امیر اور نفیس بھیڑ سے غائب تھا۔''

''کیا اس نے اپنی نمائش کا بائیکاٹ کیا تھا؟''

''جب میرے ذہن میں بائیکاٹ والا خیال آیا تو میں غصے میں آ گیا، کتنی بڑی بدتمیزی تھی۔ نو سال بعد اس کی پہلی نمائش ہو رہی تھی، بے شمار پرستار دیکھنے آئے تھے مگر حضرتِ زین اپنی نمائش اور اپنے قدر دانوں کا بائیکاٹ فرما رہے تھے۔ یہ ایک حماقت تھی۔ یہ سوچتے ہوئے میں گیلری سے باہر نکلا تو دیکھا کہ زین گیلری کی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ وہ کب آیا تھا، میں نے اسے آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، وہ بڑے سکون سے چرس بھرے سگریٹ کے کش لے رہا تھا اور اپنے بال پین سے سنگ مرمر کی نچلی سیڑھی پر ایک تصویر بنا رہا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر کہا؛ 'زین، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ لوگ گیلری میں تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔'' مگر اسے جواب دینے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ تصویر بنانے میں مگن تھا۔ کچھ ہستیاں گیلری سے باہر آئیں، اور انھوں نے زین کی بہت تعریف کی۔

Maestro, your work is superb!

Sir, you are awesome!

Your paintings are so refreshing!

مگر زین چپ، اور اپنے کام میں مگن رہا۔ ہستیاں زین کی بے پرواہی دیکھ کر چلی گئیں تو اس نے اچانک منھ کھولا اور مجھ سے کہا؛ 'تصویر تیار ہوگئی!' میں نے سیڑھی پر بنی تصویر کی طرف نگاہ کی تو حیران رہ گیا۔ ایک بنجارن کی انتہائی باریک اَور خوبصورت تصویر نظر آئی۔ میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک کوئی شخص اس پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس گستاخ کی منحوس شکل دیکھنے کے لیے نظریں اٹھائیں تو دیکھا کہ وہ گستاخ جناب آصف رحمان تھے، وہی وزیرِ ثقافت جنھوں نے مجھے کالج کا وائس پرنسپل لگایا تھا۔ زین کی نمائش انھیں پسند آئی تھی اور وہ اس کی تعریف کرنے سیڑھیوں تک تشریف لائے تھے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور ایک جعلی لہجے میں انھیں مخاطب کرنے لگا؛ 'حضور، بہت شکریہ آپ کا، یہ ہمارے لیے بہت فخر کی بات ہے کہ...' ابھی میں اپنا جملہ مکمل نہیں کر پایا تھا کہ زین کے لہو میں ابال آ گیا اور وہ دقیانوسی لہجے میں اس سکندرِ اعظم سے کہنے لگا؛ 'اوئے! میری تصویر سے پَرے ہٹ۔''

''اچھا......اسی حرکت کی وجہ سے آصف رحمان، زین سے نفرت کرتے تھے!''

''یقیناً! اور یہ حرکت ہمیں مہنگی پڑ سکتی تھی۔ ہم دونوں سرکاری ملازم تھے۔ آصف رحمان ہماری ملازمت ختم کر سکتے تھے۔ مگر اللہ نے بڑا کرم کیا۔ اِفتتاح کے دو دن بعد حکومت ختم ہوگئی اور آصف رحمان اپنے عہدے سے برطرف ہو گئے۔ ان کا روزگار ختم ہو گیا اور ہمارا قائم رہا۔''

''زین کی نئی تصویریں کیسی تھیں؟''

''واہیات!''

''کیوں؟''

''کیونکہ اس کی نئی تصویروں اور نو سال پہلے والی تصویروں میں کوئی زیادہ فرق دکھائی نہیں دیتا تھا۔ زین کی مصوری ابھی تک بنجارنوں اور پچکاریوں کے ارد گرد گھومتی تھی۔ نو سال بیت گئے تھے مگر زین کی مصوری نے کوئی ترقی نہیں کی تھی۔ اس نے مصوری کا سلسلہ وہیں سے شروع کیا تھا جہاں سے اس نے چھوڑا تھا۔''

''نئی اور پرانی تصویروں میں کوئی فرق نہیں تھا؟''

''بس ایک چھوٹا سا فرق تھا۔ وہ یوں کہ پرانی تصویروں کے پس منظر میں عام طور پر ببیر کے درخت یا ریت کے ٹیلے دکھائی دیتے تھے، جب کہ نئی تصویروں میں ان کی جگہ نیلے گنبد اور اونچے مینار نظر آتے تھے۔ یہ عمارتیں مولویوں نے تعمیر کی تھیں اور اِن میں پناہ لی تھی۔''

''اور لوگوں کا ردِعمل کیسا رہا؟''

''نقادوں نے کڑی تنقید کی۔ انھوں نے لکھا کہ پچھلے نو سال میں زین نے کچھ نہیں سیکھا۔ اس کی مصوری ابھی تک محدود تھی۔ اسے نئے تجربے کرنے سے ڈر لگتا تھا وغیرہ۔ مگر اتنے منفی تبصروں کے باوجود خریداروں پر کوئی اثر نہ پڑا۔ نروانا گیلری میں جتنی تصویریں سجی تھیں، سب کی سب بک گئیں، اور شہر کے بینک کاروں اور بیوپاریوں کے محلوں کی دیواروں پر آویزاں ہوگئیں۔ زین نے اس نمائش سے اتنے پیسے کمائے

کہ اسے کالج کی نوکری کی ضرورت ہی نہ رہی۔''

''تو زین نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا؟''

''نہیں۔اس نے ایک شرارت کی۔''

''کیسی شرارت؟''

''میں بتاتا ہوں مگر پہلے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ زین کالج سے بہت تنگ تھا۔''

''کیوں؟''

''کالج کے طلبا کے ساتھ اس کی بنتی نہیں تھی۔ زین کو شکایت تھی کہ وہ مصوری سیکھنا نہیں چاہتے۔''

''اس کی کیا وجہ تھی؟''

''سب طلبا انسٹالیشن یا Conceptual آرٹ جیسی نئی چیزوں سے جڑے ہوئے تھے۔ وہ برش، ٹیوب اور کینوس کا اِستعمال نہیں کرتے تھے۔ وہ بوتلوں، چھتریوں، سُوئیوں، الگنیوں، کترنوں، گھڑیوں اور بوٹوں جیسی عام اشیا کو جوڑ کر انسٹالیشن بناتے، اور یہ عام اشیا ان کی انسٹالیشن میں شامل ہونے کے بعد ایک نئی حیثیت اور معنویت اختیار کر جاتیں۔ طلبا فن کے دشمن تھے۔ وہ فن کی فنا کے جتن کرتے، اور فن کو لافن سے ملانے کی کوشش کرتے۔ زین کا نظریہ ان سے بالکل مختلف تھا۔ وہ فن کی عزت کرتا تھا، مگر سب سے زیادہ شکایت اسے اِس بات کی تھی کہ طلبا سپت سندھو کی تہذیب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ لہٰذا اس نے سپت سندھو کے بارے میں تقریریں کرنا شروع کر دیں۔''

''طلبا کو وہ تقریریں کیسی لگتیں؟''

''بورنگ لگتیں۔ وہ زین کی باتوں پر بالکل دھیان نہیں دیتے تھے۔ وہ جمائیاں لیتے یا آپس میں کانا پھوسی کرتے۔ زین ان سے تنگ تھا اور ان سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ بدلے کے بارے میں سوچتے سوچتے اسے ایک شرارت سوجھی۔''

''بتائیں بھی نا کہ اس نے کیا شرارت کی!'' میں بے تاب ہو رہا تھا۔ فقیر کی کہانیاں اتنی طویل کیوں تھیں؟

''چلیں، پھر سنیں! ایک دن زین اپنی کلاس میں ہڑپا کے کوزوں کے ڈیزائن کے بارے میں بات کر رہا تھا کہ اس نے ایک طالب علم کو بار بار جمائی لیتے دیکھا۔ زین نے اسے پوچھا؛ 'آپ بار بار جمائیاں کیوں لے رہے ہیں؟' وہ تھوڑا سا شرمایا اور پھر کہنے لگا؛ 'آپ پرانی پرانی چیزوں کی باتیں کیے جا رہے ہیں، مجھے ان میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔' اس بات پر کلاس میں موجود سب طلبا مسکرا دیے۔ جمائیاں لینے والے طالب علم نے جیسے سب کے جذبات کی ترجمانی کی تھی۔ زین نے ایک جھوٹی سی شفقت کے ساتھ اس سے پوچھا؛ 'بیٹا، یہ بتائیں، آپ کو کن چیزوں میں دلچسپی ہے؟' اس نے فوراً جواب دیا؛ 'Conceptual Performances'۔ زین نے پوچھا؛ 'میں آپ کو کوئی Conceptual Performance دکھاؤں؟' اس

نے مسکراتے ہوئے کہا؛ 'جی ضرور!' تو زین نے جھٹ سے اپنی پتلون کی زِپ کھولی اور سب کے سامنے پیشاب کرنے کا مظاہرہ کیا۔''

یہ وجہ سن کر میں نے برا سا منھ بنایا۔ فقیر نے کہا: ''دیکھیں جی، یہ قصہ سن کر آپ کا رنگ بدلنے لگا ہے تو سوچیں طلبا کا کیا حال ہوا ہو گا؟ جس وقت زین نے یہ شرارت شروع کی، وہ سب کلاس سے بھاگ کر میرے پاس پہنچے۔ میں نے زین کو طلب کیا؛ مگر مجھے خبر ملی کہ وہ کچھ دیر پہلے کالج سے چلا گیا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے اس کی غیر حاضری میں معطل کر دیا۔ یہ میلی اور بدبودار کلاس زین کی آخری کلاس تھی۔''

''اس واقعے کے بعد زین سے آپ کے تعلقات کشیدہ ہو گئے؟''

''جی بالکل! میں اس سے سخت ناراض تھا۔ میں نے اسے غربت سے چھٹکارا دلایا تھا، اس کی واپسی کا بندوبست کیا تھا، اسے روزگار اور سر چھپانے کے لیے ٹھکانا دیا تھا اور اس نے میرا شکریہ کس طرح ادا کیا، میرے طلبا کے سامنے پیشاب کر کے؟ فٹے منھ اس حرامزادے پر۔''

پھر فقیر چپ ہو گیا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ میں نے ایک نیا سوال پوچھ کر اسے اس سوچ سمندر سے باہر نکالا؛ ''اس واقعے کے بعد زین سے آپ کی ملاقات ہوئی؟''

''دو سال تک نہیں ہوئی۔ اس واقعے کے بعد وہ شہر سے غائب ہو گیا تھا۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں تھا۔ پھر اس کا پتہ لگ گیا۔''

''کیسے پتہ لگا اس کا؟''

''مجھے کولمبو کے سفارت خانے کے قونصل کی کال آئی، زین اس کے پاس تھا۔ اسے پولیس نے گرفتار کیا تھا۔ گرفتاری کے وقت وہ الف ننگا جنگلوں میں گھوم رہا تھا۔''

مجھے اچنبھا لگا؛ ''زین وہاں کیسے پہنچا تھا؟''

''بعد میں زین نے بتایا تھا کہ وہ کالج سے فارغ ہونے کے بعد سری لنکا چلا گیا تھا جہاں اس نے ویدلوگوں کے ایک گاؤں میں ڈیرا جمایا تھا جنھیں وہ بہت پسند کرتا تھا۔ وہ سپت سندھو کی دراوڑی قوم سے بھی پرانے لوگ تھے۔ ہر شام وید بزرگ اپنی کوئی خاص جڑی بوٹی چلم میں پیتے تھے۔ چلم پینا پردیسیوں کے لیے ممنوع تھا، کیونکہ صرف وید لوگ ہی اس کا نشہ برداشت کر سکتے تھے۔ مگر زین نے بہت ضد کی تو آخر اسے ایک کش لگانے کی اجازت ملی۔ کش لگاتے ہی اس میں وحشی بننے کی خواہش جاگی۔ اس نے اپنا پاسپورٹ پھاڑ دیا، اپنا بستہ پھینک دیا، اپنے کپڑے اتارے اور الف ننگا جنگل میں جا گھسا۔ پھر اس نے کچھ دن تک ایک وحشی جانور کی زندگی گزاری مگر وہ سخت بیمار پڑ گیا اور اسے ایک گپھا میں پناہ لینا پڑی، کیونکہ بخار اسے نہ چلنے دیتا، نہ کھڑا ہونے دیتا تھا۔ بارش کی وجہ سے ایک شکاری نے اس گپھا میں پناہ لی تو اس نے اسے دیکھا اور پولیس کو اطلاع دے دی۔ پولیس نے اسے اٹھایا اور کولمبو کے قومی سفارت خانے کے حوالے کر دِیا۔ جب قونصل نے اس سے کسی رِشتے دار کا پتہ یا فون نمبر مانگا تو اس نے میرا نمبر دے دیا۔''

''قونصل نے آپ سے رقم طلب کی تھی؟''

''ظاہر بات ہے، زین مفت میں واپس نہیں آ سکتا تھا، سو قونصل نے جب ٹکٹ کے پیسے طلب کیے تو میں نے ہاں کر دی اور اسے پیسے بھجوا دیے۔ پھر میں زین کو لینے ایئرپورٹ گیا اور اسے ایک نجی گیسٹ ہاؤس میں لے آیا، کیونکہ وہ اپنی شرارت کے بعد کالج کے گیسٹ ہاؤس میں نہیں رہ سکتا تھا، پہلے جہاں اس کے لیے ایک کمرہ بک ہوا تھا۔''

''آپ بڑے نیک ہیں، زین نے آپ کے ساتھ کتنی زیادتیاں کیں!''

''مگر میں ساری زیادتیاں بھول گیا تھا۔ آخر، وہ میرا پرانا ساتھی تھا اور مجھے اس پر ترس آتا تھا۔''

''اتنی ناشکریوں کے بعد بھی آپ کو اس پر ترس آتا تھا؟''

''بالکل! دیکھیں جی اس کے ساتھ کیا کیا سلوک کیا تھا؟ اس نے جب بھی پردیس میں بسنے کا جتن کیا، وہ خوار ہوا۔ اور سب کچھ گنوا کے محتاج بن کر ملک کو لوٹ آیا تھا۔ وہ ہمارے اس مذہبی اور روایتی ملک میں مقید تھا، جس سے وہ شدید نفرت کرتا تھا۔''

''زین جب ملک میں واپس پہنچا، اس کی ذہنی حالت کیسی تھی؟''

''خراب تھی۔ زین کے پاگل پن کو کنٹرول کرنے کے لیے اسے کچھ ایسی گولیاں کھلا دی گئی تھیں، جن کے باعث وہ شدید ڈپریشن کا شکار ہو گیا تھا اور یہ ڈپریشن ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ہر وقت بستر پر لیٹا رہتا اور اٹھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔ وہ زندگی سے بیزار تھا۔ میں اسے زندگی کی طرف مائل کرنے کے لیے کینوس، ٹیوبیں اور موقلم لا کر دیتا۔ اسے گانجا اور چرس دیتا۔ اس کی پسندیدہ کتابیں یعنی 'وجود اور عدم وجود'، 'کلامِ بلھے شاہ' اور 'جپ جی' کے نسخے اس کے سرہانے رکھے؛ مگر اس نے اِن چیزوں کو ہاتھ تک نہ لگایا؛ اَور اُنھیں اِستعمال کرنے کے بجائے چھت پر لٹکے پنکھے کی طرف دیکھتا رہتا۔ میں نے اُسے طوائفوں کے پاس لے جانے کی پیش کش بھی کی مگر اس نے وہاں جانے سے بھی اِنکار کر دیا۔ میں ہتھیار پھینکنے ہی والا تھا کہ ایک کتاب میرے ہاتھ لگی۔''

''کون سی کتاب؟''

"The Truth about the Indus Valley Script"، آپ نے پڑھی؟''

''نہیں۔''

''میں نے اسے ایک شخص سے خریدا تھا جو کالج سے باہر فٹ پاتھ پر کتابیں بیچتا تھا۔ وہ مجھے بہت دلچسپ لگی تھی۔ اس میں ایک امریکی محقق نے یہ ثابت کیا تھا کہ سپت سندھو کے لوگ اَن پڑھ تھے اور ان کا رسم الخط بے معنی تھا، محض نمائش تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ اس زمانے میں ان کا سمیریوں کے ساتھ سخت مقابلہ تھا۔ سمیری اپنے رسم الخط پر بہت فخر کرتے تھے؛ سو انھیں دکھانے کے لیے کہ ان کے پاس بھی ایک رسم الخط تھا؛ سپت سندھو کے باسیوں نے کچھ حرف نما اشیا اپنی مہروں پر کندہ کی تھیں جو مطلب سے خالی تھیں، میں نے زین کے سرہانے یہ خیال انگیز کتاب بھی رکھ دی اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ زین نے نہ صرف اسے دیکھا بلکہ پڑھنا بھی شروع کر دیا۔ زین نے اس کا پورا مطالعہ کرنے کے بعد میرے دیے ہوئے کینوس پر کچھ

پینٹ کرنا شروع کر دیا۔ پھر اس نے مجھ سے مزید کینوس مانگے اور ان پر بھی کچھ پینٹ کیا۔ یہ سلسلہ کئی ہفتوں تک جاری رہا۔''

''زین کیا پینٹ کر رہا تھا؟''

''مجھے معلوم نہیں تھا۔ وہ مجھے کینوس دیکھنے نہیں دیتا تھا اور جب میں پوچھتا؛ 'زین! تمھیں کینوس کس لیے چاہئیں، تم کیا بنا رہے ہو؟' تو وہ مسکراتا اور جواب دیتا؛ 'بس صبر کرو۔ تمھیں جلد ہی پتہ چل جائے گا۔' زین نے مجھ سے کل سولہ خالی کینوس مانگے، اور پھر ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ اس کی نئی نمائش دو دن بعد شروع ہو رہی ہے۔''

''زین کی یہ نمائش کہاں لگی تھی؟''

''وہیں نروانا گیلری میں۔ اسے دیکھنے کے لیے بھی وہی کاروباری، سیاسی حضرات، خواتین، زلف دار اور نقاد ہستیاں پہنچیں جو پچھلی نمائش دیکھنے آئی تھیں۔ مگر سب ہستیاں زین کی نئی تخلیقات دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ ان کا خیال تھا کہ انھیں ننگی بنجارنوں کی رنگ برنگ تصویریں دیکھنے کو ملیں گی، مگر تصویروں کے بجائے وہاں خطاطی کے نمونے تھے اور تماشائیوں میں یہ تاثر عام ہو گیا کہ زین اپنے استادِ گرامی شکور صاحب کی بتائی ہوئی راہ پر چل نکلا اور مصوری چھوڑ کر خطاط بن گیا ہے۔ مگر زین کی خطاطی کے نمونے شکور صاحب سے مختلف تھے۔ شکور صاحب کی خطاطی کی لپی عربی رسم الخط میں تھی، مگر زین کی خطاطی کا رسم الخط بالکل نامانوس تھا۔ وہ کوئی قدیم رسم الخط معلوم دِکھائی پڑتا تھا، مگر وہ کونسا رسم الخط تھا؟ ہر ناظر کا اپنا علیحدہ اندازہ تھا۔ کسی کا خیال تھا کہ یہ برہمی ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ یہ کلدانی ہے، کوئی اسے سمیری قرار دے رہا تھا، اور کوئی دعویٰ کر رہا تھا کہ یہ قبطی ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ زین سے پوچھا بھی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اس نے گیلری میں آنے سے انکار کر دیا تھا۔ گیلری میں بحث و تمحیص جاری تھی۔ سب پریشان تھے۔ پھر ایک بینک کار کو یاد آیا کہ پروفیسر شانی جو ملک کے جانے پہچانے ماہرِ لسانیات تھے، کسی کانفرنس کے سلسلے میں کراچی سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ پورے ملک میں صرف شانی صاحب بتا سکتے تھے کہ زین کی خطاطی کا رسم الخط کون سا ہے۔ بینک کار اپنی گاڑی میں پروفیسر شانی کو گیلری میں لے آئے۔ پروفیسر شانی نے خطاطی کے سب نمونوں کی چھان پھٹک کی اور اپنا فیصلہ دیا؛ 'خطاطی کے ان نمونوں میں ایک مخلوط ابجد استعمال ہوئی ہے، جو قدیم ابجدوں کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے۔ عبرانی، برہمی اور سمیری کے حروف کہیں کہیں یہاں نظر آتے ہیں۔' اور جب پروفیسر شانی صاحب سے پوچھا گیا کہ زین کا رسم الخط ان سے پڑھا گیا تو انھوں نے مارے شرم کے آنکھیں نیچی کرتے ہوئے فرمایا؛ 'جی، ایک آدھ حصہ کلی طور پر برہمی میں تھا، جو مجھ سے پڑھا گیا۔ خطاط نے برہمی میں پنجابی زبان کی مغلظ گالیاں لکھی ہیں۔''

میں کہانی کا یہ غیر متوقع انجام سن کر ہنس پڑا۔ فقیر بھی ہنسا۔ اس کے دانت بالکل کالے تھے۔ ہمارے درمیان پہلی بار کچھ ذہنی ہم آہنگی ہوئی تھی۔ ہم دونوں پہلی بار ایک ہی لطیفے پر ہنسے تھے۔ پھر میں نے فقیر سے پوچھا؛ ''مگر اس طرح کے خطاطی کے واہیات نمونے بنانے میں زین کا کیا مقصد تھا؟''

"وہ اپنے زمانے کے سمیریوں کو بے وقوف بنانا چاہ رہا تھا اور اپنے جنت مقام والد صاحب کو ایک شرارت بھرا اخراجِ تحسین پیش کر رہا تھا۔ زین کا والد چاہتا تھا کہ وہ خطاط بنے۔ زین آخرکار خطاط بن گیا تھا، مگر اس کی خطاطی کے نمونے محض مذاق تھے جن کا رسم الخط بے معنی تھا، اور بیچ بیچ میں جن لفظوں کا مطلب بنتا تھا، وہ غلیظ گالیاں تھیں، اور حیران کن بات یہ کہ ان مذاقوں کی قیمت اصل خطاطی کے نمونوں سے دس گنا زیادہ تھی۔"

"یہ تو اپنے والد کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ لوگوں نے زین کی اس نمائش کو کیسے لیا؟"

"کیسے لے سکتے تھے؟ لوگ غصے میں تھے۔ نقادوں نے اخبارات میں اپنے غصے کا جی بھر کر اِظہار کیا اور خریداروں نے ان نمونوں کو خریدنے سے انکار کیا۔ نروانا گیلری میں زین کی خطاطی کے سولہ نمونے سجے ہوئے تھے، جن میں سے صرف ایک ہی فروخت ہوا۔"

"گویا زین کی یہ نئی نمائش بالکل ناکام ہوگئی؟"

"نہیں، یہ بڑی کامیاب نمائش تھی۔ اس کے نتیجے میں زین نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔"

"اچھا! وہ کیسے؟"

"میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ سولہ نمونوں میں سے صرف ایک ہی بکا تھا۔ جس بندے نے اسے خریدا، وہ ایک پردیسی تھا۔ ایک امریکی سفارت کار۔ وہ اس خطاطی کو اپنے ساتھ نیویارک لے گیا، جہاں اس نے اپنے تایا جی کو دکھائی۔ آپ کو پتہ ہے، اس کا تایا کون تھا؟"

"کون تھا؟"

"Leo Eminelli"

"وہی Leo Eminelli، جو نیویارک کی سب سے بڑی گیلری کا مالک تھا؟"

"جی۔"

"اچھا، پھر کیا ہوا؟"

"اس خطاطی کو دیکھ کر Leo Eminelli کو احساس ہوا کہ زین نے مصوری کی ایک نئی صنف اِیجاد کی ہے؛ 'تجریدی خطاطی'، اور اسے یہ احساس بھی ہوا کہ یہ صنف بڑی مقبول اور منفعت بخش بھی ہو سکتی ہے۔ بس تھوڑی سی مارکیٹنگ کی ضرورت تھی۔ Leo Eminelli نے نروانا گیلری کے مالک کے ذریعے زین سے رابطہ کیا اور اس سے خطاطی کے مزید نمونے طلب کیے۔ زین نے اسے وہ پندرہ نمونے بھجوا دیے جو نمائش میں نہیں بک سکے تھے۔ Leo Eminelli نے انھیں اپنی گیلری میں سجایا اور ان کے بارے میں 'نیویارک ٹائمز' میں ایک مضمون چھپوایا جس کا عنوان تھا: Between East and West : Zain's Abstract Calligraphy۔ اس مضمون میں Leo Eminelli نے لکھا کہ 'زین نے مشرق کے قدیم فنِ خطاطی کو مغرب کی جدید تجریدیت کے ساتھ بڑے انوکھے ڈھنگ سے ملایا ہے۔' مضمون کے چھپتے ہی اگلے روز زین کے سارے نمونے بک گئے۔ Leo Eminelli نے زین سے نئے نمونے طلب کیے۔ وہ

بھی بک گئے۔ کسی نمونے کی قیمت تیس ہزار سے کم نہیں تھی۔ زین پر ڈالروں کی بارش ہونے لگی۔"

"اس نے اپنے ڈالروں کا کیا کیا؟"

"اس نے پاکستان چوک کے قریب ایک دومنزلہ کوٹھی خریدی، جس کے اردگرد ایک بڑا لان تھا۔"

"یہ وہی کوٹھی تھی جو جل گئی تھی؟"

"جی۔ کوٹھی بہت پرانی تھی۔ ایک پاگل انگریز نے اسے تعمیر کروایا تھا۔ اسے یقین تھا کہ قبائلی پٹھان کسی نہ کسی دن اس شہر پر ہلّہ بول دیں گے۔ سو انگریز نے اپنی کوٹھی کو ایک قلعے کی شکل دی تھی۔ چھت پر 'برج' بنے ہوئے تھے اور کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں تھیں۔ کوٹھی پچاس سال سے بے آباد تھی۔ محلے کے لوگ کہتے تھے کہ اس میں جن بستے ہیں۔ زین جیسے جن بندے کے لیے کتنا اچھا ٹھکانا تھا۔ کوٹھی میں ایک ہال تھا، جو کم از کم تیس فٹ اونچا اور چالیس فٹ چوڑا تھا۔ اس میں زین نے اپنا اسٹوڈیو بنایا تھا۔ خدا جانے اسے اتنے بڑے اسٹوڈیو کی ضرورت کیوں پیش آ گئی تھی۔ اسٹوڈیو میں لوگوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ زین کے سوا اس میں کوئی داخل نہیں ہوتا تھا۔ مجھے بھی اس کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی اور اس اسٹوڈیو میں زین نے اپنا شاہکار... وہاں چلیں؟ یہاں سے بالکل قریب ہے، دس منٹ کا راستہ۔ چلتے چلتے باتیں کریں گے!"

میں نے حامی بھر لی۔ ہم دونوں اٹھے اور پچھلے گیٹ کی طرف چل دیے۔ فقیر لنگڑا رہا تھا، مگر وہ خوشگوار موڈ میں تھا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر پوچھا؛

"آپ ابھی ابھی زین کے خفیہ شاہکار کا ذکر کر رہے تھے۔ ہماری پہلی ملاقات میں بھی اس کا ذکر ہوا تھا۔ آپ مجھے اس کے بارے میں بتا سکتے ہیں؟"

"صبر کریں جی۔ میں آہستہ آہستہ اس شاہکار کی طرف آ رہا ہوں۔" فقیر لنگڑا رہا تھا مگر تیزی سے چل رہا تھا اور اس کے قدم سے قدم ملانا مشکل تھا۔ چلتے چلتے اس نے ایک نئی کہانی شروع کر دی۔ "ہاں تو اس وقت زین لوگوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ ہر وقت خطاطی کے نمونے بنانے میں مصروف تھا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ ڈراما کرتا تھا۔ میرا دماغ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ زین کا سارا تخلیقی زور وہ سطحی اور کاروباری نمونے بنانے میں صرف ہوتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ خطاطی کے نمونوں کے ساتھ ساتھ اپنے ڈھنگ کی کچھ تصویریں بھی بنا رہا تھا اور مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ ان تصویروں میں برہنہ عورتیں تھیں۔ میں اسے کافی مدت سے جانتا تھا، مجھے پتہ تھا کہ وہ عورت کے جسم کی تصویر بنائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، مگر زین اپنے کام کے معاملے میں اِتنی رازداری کیوں برتتا تھا؟ وہ اپنے ہال میں کس نوعیت کی تصویریں بنا رہا تھا۔ میں نے یہ پتہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے امید تھی کہ یہ سارے بھید مجھ پر کسی نہ کسی روز کھل جائیں گے۔ بس زین کے ساتھ باقاعدہ ملاقاتیں رکھنا تھیں۔ کبھی نہ کبھی کوئی اشارہ، کوئی سراغ مل جانا تھا۔"

"تو آپ کو کوئی اشارہ، کوئی سراغ ملا؟" میں کہانی کا انجام سننے کے لیے بے تاب تھا۔ مجھے یقین تھا کہ فقیر ایک ایسا اِنکشاف کرے گا جس کے ذکر سے میری پروفائل میں برکت پڑ جائے گی۔

"ابھی بتاتا ہوں" فقیر نے مجھے تسلی دی اور ایک گہرا سانس لیا۔ پھر گویا ہوا؛ "دیکھیں جی! زین

فطرتاً ملنسار نہیں تھا، مگر جب سے وہ لنکا سے لوٹا تھا، اس نے لوگوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا تھا۔ وہ صرف مجھے ملتا تھا۔ ویسے بھی مجھ سے ملنا اس کا اخلاقی فرض تھا۔ میں نے اسے کئی مرتبہ پریشانیوں میں سے نکالا تھا۔ سو میں اس کے پاس مہینے میں دو بار جاتا اور زین میری آؤ بھگت کرتا۔ ہم اس کے کمرے میں بیٹھ کر شراب اور چرس پیتے۔ میں گپ شپ کرتا مگر زین چپ چاپ رہتا اور اس کے چہرے سے یوں محسوس ہوتا کہ وہ میری گپ شپ نہیں سن رہا، اور ان خفیہ تصویروں کے بارے میں سوچ رہا ہوتا جو اسٹوڈیو میں اس کے انتظار میں ہوتیں۔ اسے اسٹوڈیو میں جانے کی جلدی ہوتی۔ وہ بے قراری سے میری روانگی کا انتظار کرتا مگر میری گپیں رکنے میں نہ آتیں۔ میں ہر بار اس سے پوچھتا؛ 'زین! تم آج کل کیا بنا رہے ہو؟' اور وہ ہر بار ایک ہی جواب دیتا؛ 'بس، امریکیوں کے لیے خطاطی کے نمونے۔' وہ یقیناً جھوٹ بولتا تھا۔ میں کبھی کبھی اسٹوڈیو کے بند دروازے کی طرف اشارہ کرتا اور پوچھتا؛ 'آج بھی داخلہ ممنوع ہے؟' اور زین ہر بار 'جی ہاں' کہتا۔ جب میں محسوس کرتا کہ وہ بہت بے قرار ہو رہا ہے تو میں بھول پن سے پوچھتا؛ 'زین، میں تمھارا زیادہ وقت تو نہیں لے رہا؟ تم تو کام کرنا چاہ رہے ہو گے؟' زین کہتا؛ 'نہیں یار! کام شام کوئی نہیں ہے۔ بس طوائفوں کے پاس جانا ہے۔ میں تین دن سے ان کے پاس نہیں گیا۔' زین کا اشارہ واضح ہوتا۔ میں جلدی سے اپنا ڈرنک ختم کر کے چل پڑتا۔ ہماری سب نشستیں ایسے ہی اختتام پذیر ہو جاتیں اور ہر ملاقات کے بعد مجھے لگتا کہ وقت ضائع ہو گیا۔ نہ کوئی اشارہ، نہ کوئی سراغ ملتا۔ زین ایک بند کتاب تھا مگر میں ہمت نہ ہارتا، اور اس سے بار بار ملتا رہتا۔ پھر میری ملاقاتیں رنگ لے آئیں۔ زین کا بھید کھل گیا۔ ہماری آخری ملاقات پر۔ لیں جی، زین کی کوٹھی آ گئی ہے۔''

ہمارے سامنے زین کی کوٹھی کے کھنڈر تھے۔ شام ہو رہی تھی۔ اندھیرا چاروں طرف پھیلنے لگا تھا۔ اس وقت رونق کم تھی۔ لان میں دو مشٹنڈے بیٹھے خاموشی سے سگریٹ پی رہے تھے اور ان سے تھوڑی دوری پر بیٹھی تین عورتیں گپیں ہانک رہی تھیں۔ ان کے بچے کھنڈروں میں کھیل رہے تھے۔ پاپڑ والے، آئس کریم والے، مونگ پھلی والے اور غبارے والے اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ تفریح گاہ آہستہ آہستہ ویران ہو رہی تھی۔

ہم لان میں بیٹھ گئے۔ کھنڈر ہمارے سامنے تھے اور فقیر ان کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے مجھے زین کی کوٹھی کا نقشہ سمجھانے لگا؛ ''دیکھیں جی! بائیں جانب جہاں آدھی دیوار کھڑی ہے، زین کا کمرہ تھا، اور داہنی طرف، جہاں لوہے کے بڑے بڑے راڈ دکھائی دے رہے ہیں، اس کا اسٹوڈیو تھا۔''

پھر وہ کچھ دیر چپ رہا، جیسے اس کی آنکھوں میں ماضی کے منظر گھوم رہے تھے۔ لارنس گارڈن سے چلتے وقت میں نے ٹیپ ریکارڈر بند کر دیا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ آن کیا۔ فقیر کو ایک طرح کا حال چڑھا ہوا تھا اور مجھے پتہ تھا کہ اس حال کے دوران وہ کچھ اہم واقعات سنانے والا تھا۔ وہ اچانک بول پڑا۔

''مجھے زین سے آخری ملاقات یاد آ رہی ہے۔ شام ہو رہی تھی۔ میں اس کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ شدید بیمار تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بستر پر دراز تھا اور کانپ رہا تھا۔ میں نے اس کے ماتھے کو ہاتھ لگایا۔

اسے شدید بخار تھا۔ میں نے پوچھا؛ 'زین، تم نے کوئی دوائی شوائی لی ہے؟' مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میری آواز اسے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے سوچا؛ 'میں کیا کروں؟ اسے جگاؤں، کسی ڈاکٹر کو فون کروں؟' مگر مجھے اچانک خیال آیا کہ زین کی حالت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میں کیوں نہ اس کے اسٹوڈیو میں جھانک لوں۔ وہ مجھے کیسے روکے گا؟ اس طرح مجھے پتہ چل جائے گا کہ اس نے اپنے اسٹوڈیو میں کیا چھپا رکھا ہے۔ اس کا بھید کھل جائے گا۔ آپ میری باتیں سن رہے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''آپ مجھے اتنی خاموشی سے سن رہے ہیں، ایک پل کے لیے مجھے یوں لگا کہ آپ سو گئے ہیں۔''

''نہیں جناب۔ میں بہت توجہ سے سن رہا ہوں۔ اسی باعث خاموش ہوں۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ سو میں نے جا کر زین کے اسٹوڈیو کا دروازہ کھولا۔ اس میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیوار کو ٹٹولا مگر سوئچ نہ ملا۔ سو میں نے اپنے موبائل کی لائٹ جلائی اور دیکھا کہ سامنے والی دیوار پر ایک سولہ فٹ اونچا اور بیس فٹ چوڑا کینوس تھا اور اس پر لکیروں کا ایک جنگل پھیلا ہوا تھا۔ میں کینوس کے قریب گیا تو لکیریں ایک دوسرے سے الگ دکھائی دینے لگیں اور ان کے جنگل میں سے بہت سے روپ ابھر آئے؛ خواتین کے روپ۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ زین نے پکاسو اور اِنگرس کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ پکاسو کی 'Avignon کی مٹیاریں'' میں صرف پانچ خواتین موجود تھیں، اور اِنگرس کے 'ترکی حمام' میں محض پچیس، مگر زین کی تصویر میں چار پانچ سو ننگی خواتین موجود تھیں۔''

''تصویر کا موضوع کیا تھا؟''

''وہ دریائے راوی کے کناروں کا کوئی منظر تھا۔ تصویر کے عین بیچ میں دریا بہہ رہا تھا اور اس کے کناروں پر چار پانچ سو عورتیں ناچ رہی تھیں، ٹہل رہی تھیں، لیٹی ہوئی تھیں، کھیل رہی تھیں، انگڑائیاں لے رہی تھیں، یا اپنے بال سکھا رہی تھیں۔ ہر عورت دوسری عورت سے مختلف تھی۔ ہر عورت کا پوز، جسم اور چہرہ جدا جدا تھا؛ مگر سب میں ایک قدر مشترک تھی۔ عورتیں ناظر کو بٹ بٹ دیکھ رہی تھیں اور ان کی گہری خوبصورت آنکھیں ناظر سے ایک سوال پوچھ رہی تھیں؛ 'بتاؤ، ہمیں دیکھنے کے بعد تم کیا کرو گے؟' یہ نوع در نوع بدن اور چہرے دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ اپنی تصویر بنانے کے لیے زین نے بہت سی فاحشہ عورتوں سے پوز کروایا ہو گا۔ سو زین جب ملاقات پر مجھے کہتا تھا کہ اسے طوائفوں کے پاس جانا ہے، تو وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہوتا تھا۔ اِتنی بڑی تعداد میں عورتوں کی تصویر بنانے کے لیے اس نے نگینہ بازار کے کتنے چکر لگائے ہوں گے... چار سو... پانچ سو؟ اس نے لڑکیوں پر کتنے پیسے ضائع کیے ہوں گے؟ پانچ لاکھ... دس لاکھ؟ یہ سوچتے ہوئے میں چکرا گیا تھا۔ زین نے کسی تصویر کے لیے کبھی اتنی محنت نہیں کی تھی۔ یہ تصویر اس کا شاہکار تھا۔ تصویر کے ایک کونے میں زین کا دستخط نظر آ رہا تھا اور دستخط کے نیچے تکمیل کی تاریخ لکھی تھی۔ وہ دو دن پہلے کی تاریخ تھی۔ زین کی بیماری کی وجہ میری سمجھ میں آ گئی۔ تصویر مکمل کرنے میں اس نے اپنی تمام تر توانائیاں خرچ کر دی

تھیں۔ وہ بہت تھک گیا تھا اور بیماری تھکے ہوئے بندے کو ہمیشہ گھیر لیتی ہے۔ خیر، میں نے زین کا شاہکار دیکھ لیا تھا۔ اس کا بھید آخر کھل گیا تھا۔''

بولتے بولتے فقیر چپ ہو گیا، اور اس کی آنکھیں ایسے چمکنے لگیں جیسے زین کا شاہکار اس وقت اس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھا اور انھیں روشن کر رہا تھا۔ جلدی جلدی مجھے کوئی سوال پوچھنا تھا، اس سے پہلے کہ وہ جذباتی ہو جاتا اور اس کی کیفیت اسے بولنے سے روک دیتی؛ سو میں نے پوچھا: ''اچھا آپ یہ بتائیں، زین نے یہ شاہکار خفیہ کیوں رکھا تھا؟''

''مجھے لگتا ہے کہ زین اسے اس وجہ سے خفیہ رکھتا تھا کہ وہ بہت ہی ذاتی تصویر تھی۔ یہ تصویر موہنجو ڈارو کی اس رقاصہ یا اس کی پرپوتیوں کو زین کا خراجِ تحسین تھا، جنھیں لوگ 'کنجریاں' یا 'گشتیاں' کہتے ہیں اور جو مدتوں سے ان کی جنسی ضرورتیں پوری کرتیں اور ان کی اندھیری راتوں کو رنگین بناتی تھیں۔''

''زین کا شاہکار دیکھنے کے بعد آپ نے کیا کیا؟''

''میں نے اپنی جیب میں سے لائٹر نکالا۔''

''کیوں جی؟ آپ اس شاہکار کو جلانا چاہ رہے تھے؟'' میں نے گرج کر پوچھا۔ فقیر کی باتیں مجھے پریشان کرنے لگی تھیں۔

''جی ہاں!'' فقیر مسکرا رہا تھا۔

''مگر کیوں؟''

''آپ بھول گئے ہیں۔ میں نے پہلی ملاقات میں آپ سے نہیں کہا تھا کہ میں بھی ایک چیتا ہوں۔ آپ اس وقت ہنسے تھے۔ اب آپ کو پتہ چلا کہ میں سچ کہہ رہا تھا۔''

''مگر اس شاہکار کو جلانے سے آپ کو کیا فائدہ پہنچنا تھا؟''

''دیکھیں جی! میں ایک معمولی سرکاری مصور ہوں، جس کا نام دس سال بعد دنیا کو بھول چکا ہوگا، اَور میرے سامنے وہ شاہکار تھا جو زین کے نام کو لافانی بنا سکتا تھا اور میں اس شاہکار کو جلا کر زین کا نام تاریخ کے صفحات پر سے مٹا سکتا تھا... مجھے اس طرح نہ گھوریں... آپ کو نہیں پتہ کہ حسد کتنی ظالم چیز ہے، وہ بندے سے کچھ بھی کروا سکتا ہے۔ حسد کے باعث انسان قتل ہوتے ہیں۔ ایک تصویر کو جلانا کون سا مشکل کام تھا؟''

میں فقیر کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا، جیسے اس نے اچانک جُون بدل لی تھی اور ابلیس کا روپ دھار لیا تھا۔ فقیر نے میرا حال دیکھ کر کہا: ''آپ خاصے پریشان ہیں، مگر پُرسکون رہیں! میں نے زین کے شاہکار کو نہیں جلایا۔''

''آپ نے واقعی اسے نہیں جلایا؟''

''جی نہیں۔ کیونکہ دراصل غیب کے باسی میرے خلاف تھے۔ ان کی سازش کے باعث میرا لائٹر جام ہو گیا۔ لائٹر میں سے آگ نہیں نکل رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے کسی فرشتے نے اپنے غیبی منھ سے میرے لائٹر پر پھونک مار دی تھی۔ میں نے سوچا 'چلو، اگلی دفعہ میں ماچس لے کر آؤں گا، اور ساتھ میں پٹرول کا ڈبا

بھی' اور یہ سوچتے ہوئے میں پلٹ کر اسٹوڈیو کے دروازے کی طرف چلنے لگا۔ مگر میں نے دیکھا کہ دروازے پر زین کھڑا تھا اور وہ مجھے ان سرخ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، جو آپ کو قائداعظم میں نظر آئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں غصے کے انگارے دہک رہے تھے۔ میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ زمین پر گرا۔ راستہ خالی تھا۔ میں بھاگتے ہوئے اسٹوڈیو سے نکلا اور سیڑھیاں اتر گیا۔ پھر میں کوٹھی سے باہر آیا۔ میری گاڑی سامنے کھڑی تھی۔ میں اس میں بیٹھ گیا اور گھر کو پلٹ آیا۔ زین سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔''

فقیر نے اپنی گھڑی پر ایک نگاہ ڈالی اور کہا: ''اوفوہ، پونے سات ہو گئے۔ مجھے سات بجے جانا ہے۔ چلیں چلیں! اپنا آخری سوال پوچھ لیں!''

''اچھا، تو یہ بتائیں۔ آپ کو زین کی موت کی خبر کیسے ملی؟''

''میں اپنے اسٹوڈیو میں تھا اور لودھراں کے ڈپٹی کمشنر کے لیے علمائے مشرق کی ایک تصویر بنا رہا تھا کہ میری بڑی بیٹی کی کال آئی؛ 'ابو جی، ٹی وی پر ایک خبر آئی ہے۔ آپ کے دوست زین کے گھر میں آگ لگ گئی۔' میں نے فوراً فون رکھا اور گاڑی بھگا کر زین کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ کوٹھی میں جو آگ لگی تھی، وہ بجھ چکی تھی؛ مگر کوٹھی بالکل تباہ ہو چکی تھی، کھنڈرات میں تبدیل ہو چکی تھی۔ بعد میں پولیس نے کھنڈروں میں سے ایک ڈھانچا برآمد کیا۔ وہ زین کا ڈھانچا تھا۔ وہ وہاں دبا ہوا تھا۔'' فقیر نے کھنڈروں کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا: ''دراصل وہاں سیڑھیاں تھیں، اور میرا اندازہ یہ ہے کہ آگ سے بچنے کے لیے زین نے سیڑھیوں کے نیچے پناہ لی تھی۔ وہ کوٹھی کے دروازے کے پیچھے تھا۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی، مگر دروازہ اس سے کھل نہیں سکا تھا کیونکہ وہ باہر سے بند تھا۔ کسی شیطان کے بچے نے باہر سے دروازے پر تالا ڈال دیا تھا۔''

میں چونک پڑا۔ اس تالے کا ذکر کسی آرٹیکل یا رپورٹ میں نہیں تھا۔ میں نے فقیر سے پوچھا؛ ''اس تالے کے بارے میں آپ کو کیسے پتہ لگا؟''

فقیر کے ہونٹوں پر ایک زردسی مسکراہٹ ابھری اور وہ کہنے لگا: ''جانے دیں جی، کیا فرق پڑتا ہے؟ آپ کے پاس کوئی اور سوال ہے تو ابھی پوچھ لیں۔ مجھے جانا ہے۔''

''شاہکار کا کیا بنا؟''

''وہ اپنے خالق کی طرح جل گیا۔ بعد میں، میں نے اسے کھنڈروں میں تلاش کیا مگر مجھے صرف اس کے کینوس کی زنگ آلود کیلیں ہی ملیں، تصویر خاکستر ہو چکی تھی۔ شاہکار کے مٹ جانے کا یہ ثبوت دیکھ کر میں نے سکھ کا سانس لیا۔ جیسا میں نے چاہا تھا، ویسا ہی ہوا۔ شاہکار فنا ہو چکا تھا۔ اب مجھے اجازت؟''

فقیر اٹھ کھڑا ہوا اور جلدی جلدی لارنس گارڈن کی طرف بڑھنے لگا۔ لارنس کی پارکنگ میں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ عجیب شخص تھا۔ وہ 'خدا حافظ' کہے بغیر ہی چل پڑا تھا۔ میں بھی اٹھا اور چلنے لگا۔ چلتے چلتے میں زین کی پروفائل کے بارے میں سوچنے لگا۔ اب میرے پاس کافی معلومات آ گئی تھیں۔ میں آسانی سے پروفائل لکھ سکتا تھا اور اچانک ایک سوال میرے ذہن میں آیا؛ ایک

اہم سوال جو میں پوچھنا بھول گیا تھا۔ مجھے فقیر سے اس سوال کا جواب چاہیے تھا۔ اس کے جواب کے بغیر زین کی پروفائل مکمل نہیں ہوسکتی تھی۔ سو میں لارنس گارڈن کی طرف بھاگنے لگا۔ فقیر لارنس گارڈن کے گیٹ تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسے آواز دِی۔ اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا تو میں نے پوچھا؛ ''معافی چاہتا ہوں، مگر میں ایک ضروری سوال پوچھنا بھول گیا۔ یہ بتائیں، آپ کا کیا خیال ہے، زین کی کوٹھی کو آگ کس نے لگائی تھی؟''

''آپ کو ابھی تک سمجھ نہیں آئی کہ زین کی کوٹھی کو آگ کس نے لگائی تھی؟''

فقیر کی آنکھوں میں ایک ڈراوَنی سی چمک دیکھی جاسکتی تھی۔

مستشرق کو رومانویت کے عہد نے پیدا کیا

ژولیاں

مجھے ایک دروازہ کھولنا ہے اور میرے لیے اس کی کنجی کا نام ہے، زبان۔ ایسا نہیں ہے کہ اردو سے بے پناہ محبت ہے یا یہ روسی اور فارسی زبان سے زیادہ خوبصورت ہے۔ لیکن اردو کی طرف مستشرقین کے جھکاؤ میں اردو کا اپنا کوئی قصور نہیں ہے، یہ اردو کی رومانویت ہے۔ مستشرق کو رومانویت کے عہد نے پیدا کیا اور پروان چڑھایا تھا۔ یہ ماضی کا رومان ہے، مستشرق کو زبان میں مستقبل نظر نہیں آتا، ماضی ہی نظر آتا ہے۔ یہ اس کا مشرق کے ساتھ رومان تھا، شاید اسی لیے اس نے مشرق کا رخ ہی نہیں کیا۔ ہمارے سنسکرت کے استاد کہتے تھے کہ وہ کبھی ہندوستان نہیں گئے، خاص کر ان علاقوں میں جہاں ہندی اور بنگالی بولی جاتی ہے۔ اس لیے کہ انھیں یہ جان کر افسوس ہوتا کہ سنسکرت کتنی بگڑ گئی ہے۔ گارساں دتاسی کا معاملہ بھی وہی ہے۔ اس کو اردو میں ایک خالص پن نظر آتا ہے۔

کامران علی قوال

ژولیاں

شام کا وقت ہے، تقریباً چھ بجے۔ میں سواگت ہوٹل کے سوٹ نمبر ۲۱۲ میں موجود ہوں۔ ۲۱۲ میں مجھے بہت سکون آتا ہے۔ میں جب بھی فلم پور آتا ہوں، اسی سوٹ میں رکتا ہوں۔ میں سوٹ کی بیٹھک کے ایک نرم صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوں۔ میری بغل میں میرا باجا ہے۔ دن بھر کی تھکاوٹ اتارنے کے لیے میں وہسکی کے تین گلاس پیے، دو پکے سگریٹ سلگائے، اب میں سرور میں ہوں اور اپنے باجے پہ انگلیاں نچاتے نچاتے من کن تو گانے لگا ہوں۔ میں کل ایک بڑے شو میں پرفارم کرنے جا رہا ہوں اور میں اس کی تیاری میں لگا ہوں۔ شو، دو اعتبار سے اہم ہے۔ ایک تو وہ میرے تایا مرحوم؛ عظیم اور مشہور قوال مظفر علی خان، کی دوسری برسی منانے کے لیے رکھا گیا ہے۔ دوسرے یہ میری گم شدہ آواز کی بازیافت کے بعد ہندوستان میں میرا پہلا شو ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں اپنی اس نئی آواز سے ساری جنتا کو چونکا دوں گا۔

اچانک لابی سے فائرنگ کی آواز آ رہی ہے اور ہولناک چیخیں سننے میں آ رہی ہیں۔ میں باجے کو پرے رکھ کر صوفے سے اٹھ رہا ہوں اور دروازے کی طرف بڑھ رہا ہوں، اور میں دروازے پہ کان لگا کے سن رہا ہوں۔

لابی میں قیامت آ گئی۔ گولیاں چل رہی ہیں اور ہوٹل کا عملہ اور مہمان چلاتے چلاتے دوڑ رہے ہیں۔ یہ گولیاں بھاری اسلحوں کی لگ رہی ہیں۔ مشین گن یا AK47۔ آخر کیا ہوا؟ کوئی ڈکیتی؟ کوئی فساد؟ کوئی حملہ؟ اور اگر حملہ ہوا تو حملہ آور کون ہیں؟ اتنے میں لابی خاموش ہوگئی۔ سناٹا چھا گیا۔ اور وہاں سے ایک نعرہ گونج رہا ہے؛ اللہ اکبر! ایک درجن مرد نعرۂ تکبیر لگا رہے ہیں۔ مجھے ایک اہم اشارہ ملا ہے۔ یہ دہشت گردوں کا حملہ ہے۔ سو یہ شیطان کے بچے ادھر بھی موجود ہیں؟ لیکن وہ یہاں کیسے آئے؟ کس کے کہنے پر؟ کس کی مدد سے؟ یہ چند سوال میرے دماغ میں بار بار گردش کر رہے ہیں۔

اب لگ رہا ہے کہ دہشت گرد لابی کو مکمل طور پر فتح کر چکے ہیں۔ اس وقت کیا کیا جاسکتا ہے؟

بھاگنا مشکل ہے۔ مجھے نکلنے کا ایک ہی راستہ معلوم ہے؛ لابی والا راستہ۔ بچنے کے لیے صرف ایک ترکیب اپنائی جاسکتی ہے۔ چھپنا چاہیے۔ پر کہاں چھپوں؟ بیٹھک اور غسل خانے کے درمیان ایک کمرہ ہے، جس میں دو بڑی الماریاں کھڑی ہیں۔ ان الماریوں میں پناہ لی جاسکتی ہے۔ ان میں کچھ کمبل، لحاف اور تکیے رکھے ہوئے ہیں۔ میں بڑی مشکل سے اپنا فربہ جسم ایک الماری میں دو موٹے لحافوں کے بیچ سمو رہا ہوں، پھر الماری کا دروازہ اندر سے بند کر رہا ہوں اور انتظار کرنے لگتا ہوں۔

میں کچھ دیر سے الماری میں روپوش ہوں؛ یہاں اندھیرا بہت ہے اور گرمی بھی، پسینے کے موٹے موٹے قطرے میرے ماتھے سے ٹپک رہے ہیں اور میرے ہمسایہ لحافوں کو گیلا کر رہے ہیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ مجھے اس الماری میں کتنا وقت گذارنا ہوگا اور اس دہشت گردانہ حملے کا انجام کیا ہوگا۔ کیا میں بچ پاؤں گا یا اپنے خالقِ حقیقی کے پاس چلا جاؤں گا؟ بس اتنا پتہ ہے کہ مجھے یہاں انتظار کرنا ہے اور یہ انتظار طول کھینچ سکتا ہے۔

لیکن دہشت گردوں نے میرے انتظار کو زیادہ طول نہیں کھینچنے دیا۔ لابی پر قبضہ جمانے کے بعد وہ اوپر کی منزلوں پر چڑھائی کرنے لگے ہیں۔ آس پاس کی آوازیں مجھے بتلا رہی ہیں کہ دہشت گرد باری باری سب کمروں اور سوئیٹس میں گھس رہے ہیں، اور ان کے مکینوں کو اپنے AK47 کی گولیوں سے اڑا رہے ہیں۔ مکین حیوانی چیخیں مار کر دم توڑ رہے ہیں، میں ان کی چیخیں سن کر بوکھلا رہا ہوں۔ میرا جسم کانپ رہا ہے اور پسینے کے قطرے نہیں بلکہ چشمے میرے مساموں سے بہہ رہے ہیں۔

میں خوف زدہ ہوں لیکن یہ خوف میرے دماغ پر کوئی اثر نہیں کر رہا۔ میرا دماغ میرا پورا ساتھ دے رہا ہے اور صورت حال کا جائزہ لے رہا ہے۔ کچھ عرصے سے میرے ملک میں باقاعدگی سے دہشت گردوں کے حملے ہو رہے ہیں۔ میں اخباروں میں ان حملوں کی تفصیل پڑھ چکا ہوں اور اس طرح میری معلومات میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ اب چونکہ میرے ہوٹل پر اسی نوعیت کا ایک حملہ ہو رہا ہے، میں ان معلومات کی روشنی میں دہشت گردوں کے طریق واردات کا تجزیہ کر رہا ہوں۔

یہ دہشت گرد بظاہر یرغمال بنانے کے خواہشمند نہیں ہیں ورنہ وہ لوگوں کو پکڑ لیتے، انھیں اندھا دھند نہ مارتے۔ یوں لگتا ہے کہ دہشت گردوں نے یہ حملہ ایک بہت ہی سادہ مقصد کے لیے کیا ہے؛ صرف اپنے وجود کی نمائش کے لیے اور لگے ہاتھوں اس ملک کی سرکار اور جنتا کو یہ بتانے کے لیے کہ وہ ان سے تگڑے ہیں۔ وہ بآسانی ایک مشہور شہر کے فائیو اسٹار ہوٹل پر قبضہ کر سکتے ہیں اور اس کو ایک قبرستان میں بدل سکتے ہیں۔ انھیں کوئی روک ہی نہیں سکتا، کوئی کوشش کر کے تو دیکھے! انھیں پتہ ہے کہ پولیس، فوج اور کمانڈو یعنی کہ تمام قسم کے سرکاری محافظ جلد یا بدیر حرکت میں آئیں گے اور ہوٹل کا محاصرہ کریں گے، پھر اس پر ہلہ بولیں گے۔ سو دہشت گرد اس سمے تک ہوٹل کی صفائی کریں گے۔ جو بھی ذی روح مخلوق انھیں نظر آئے گی، خلاص کی جائے گی۔ لیکن جب سرکاری محافظ ہلہ بولیں گے، دہشت گرد کیا کریں گے؟ وہ ان سے کیسے نمٹ لیں

گے؟ وہ بڑے منصوبہ بند طریقے سے کام کر رہے ہیں۔ ان کے پاس کوئی پلان ضرور ہوگا۔ مجھے ایک فوجی ہوائی اڈے پر دہشت گردوں کا ایک حملہ یاد آ رہا ہے۔ دہشت گردوں نے آٹھ گھنٹوں تک فوج کا مقابلہ کیا تھا اور جب ان کا گولہ بارود ختم ہو گیا تھا، انھوں نے اپنی دھماکہ خیز پٹیاں استعمال کی تھیں اور ہوائی اڈے کی پوری عمارت کو اڑا دیا تھا۔ بس، اب صرف دعا کی جاسکتی ہے کہ دہشت گرد اس قسم کی پٹیاں باندھے بغیر اس ہوٹل میں آئیں اور اگر وہ اس قسم کی پٹیاں باندھ کر آئے تو.....

لیکن میں اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتا ہوں۔ میں ایک فراریت پسند آدمی ہوں اور اس حملے کے انجام پر سوچنے پر اپنی زندگی کے سفر کا جائزہ لینے کو ترجیح دے رہا ہوں، اور میں اپنی الماری کے اندھیرے میں اس سفر کی کھٹی میٹھی یادوں سے اپنا دل بہلا رہا ہوں۔

سب سے پہلے مجھے دس سال قبل کی ایک شام یاد آ رہی ہے۔ تایا جان کی بیٹھک میں ریاض ہو رہا تھا۔ تایا جان (مشہور قوال مظفر علی خان) اور میرے ابو (مشہور قوال وقار علی خان) اپنے باجے کے ساتھ قالین پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان دونوں کے بیچ بیٹھا ہوا تھا۔ تایا جان اور ابو جی راگ ملتانی گا رہے تھے۔ ابو کی آواز راگ کی کیفیات قائم رکھ رہی تھی اور تایا جان بر بہت کر رہے تھے اور یوں لگ رہا تھا کہ تایا جان بار بار غصے میں آ رہے تھے اور میرے ابو ان کو منانے کی ناکام کوششیں کر رہے تھے۔ میں بڑے دھیان سے ان کی سریلی گفتگو کو سن رہا تھا، اور اس کی باریکیاں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں تیرہ سال کا تھا اور بچپن سے اپنے والد سے موسیقی کے رموز سیکھ رہا تھا۔ میری کم عمری کی وجہ سے میری آواز نسوانی تھی لیکن چونکہ اس میں مردانگی کا بھاری پن نہیں تھا، وہ سُر کی انتہائی بلندیوں کو آسانی سے چھو لیتی تھی اور اچانک تایا جان نے مجھے گانے کو کہہ دیا۔ میں نے اپنی آواز میں اپنا سارا فن سمیٹ لیا اور ملتانی کو ایسی تانوں، پلٹوں اور سرگموں سے سنوار کر پیش کیا کہ تایا جان شاباشی دینے پر مجبور ہو گئے اور ابو کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگ گیا۔ ان کی دی ہوئی تربیت رنگ لانے لگی تھی۔ ان کو اب یقین کامل تھا کہ میں ان کی عزت رکھوں گا اور ایک نہ ایک دن دنیائے موسیقی میں نام پیدا کروں گا۔

ریاض کرتے کرتے رات ہو گئی تھی۔ بیٹھک اندھیرے کی لپیٹ میں پوری طرح آ گئی تھی۔ ہم سب ریاض میں اتنے مگن تھے کہ ہم بتی جلانا بھول گئے تھے۔ میرے بزرگ اپنے باجے بند کرنے لگے۔ آج کا ریاض ختم ہو رہا تھا۔ اگلا ریاض سات سمندر پار ہونا تھا؛ پردیس میں۔ کیوں کہ ہم تینوں اگلے دن تایا جان کی پارٹی کے ساتھ یورپ کے دورے پر جا رہے تھے۔ تایا جان میری صلاحیتوں کے قائل ہو گئے تھے اور انھوں نے مجھے اس دورے میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں ان کے پارٹی کے ہم نواؤں کے ساتھ گانے اور تالیاں بجانے جا رہا تھا؛ میں بہت ہی خوش تھا۔ میں پہلی مرتبہ پردیس جا رہا تھا۔

ان دنوں تایا جان کی مقبولیت اپنے عروج پر تھی۔ تایا جان چند سال پہلے مشہور ہوئے تھے۔ ہوا یوں تھا کہ ایک امریکی پروڈیوسر کو اپنی نئی مووی کے ساؤنڈ ٹریک کے لیے ایک مشرقی آواز کی تلاش تھی۔ اس کے کسی جاننے والے نے یہاں سے تایا جان کی ایک کیسٹ بھیجی تھی اور پروڈیوسر ان کی کرخت آواز پر لٹو ہو گیا

تھا۔ یہ سوز بھری آواز اس کی مووی کے لیے بالکل سازگار تھی، جس کا موضوع ایک سزائے موت کے قیدی کا پچھتاوا تھا۔ پروڈیوسر نے اپنے جاننے والے کو حکم دیا، اس آدمی کو فوراً یہاں روانہ کر دو اور یہی ہوا۔ دو ہفتے بعد تایا جان لاس اینجلس کے ایک شاندار اسٹوڈیو میں ایک عارفانہ کلام ریکارڈ کرا رہے تھے لیکن جب مووی ریلیز ہوئی تو تایا جان کو یہ دیکھ بے حد رنج ہوا کہ عارفانہ کلام زنا بالجبر کے ایک سین کے پس منظر میں استعمال ہوا تھا۔ اس کلام کی بے حرمتی ہوئی تھی لیکن کیا کیا جا سکتا تھا؟ اس کلام کی تقدیس گوروں کو کہاں سمجھ آنے والی تھی؟ اور ویسے بھی اس بے حرمت کردہ کلام کی وجہ سے تایا جان راتوں رات مشہور ہو گئے تھے اور مغرب کے بڑے کنسرٹ ہال کے مہتمم ان کو اپنی پارٹی سمیت بلانے لگے تھے۔

میرے ابو کی اپنی قوالی پارٹی بھی تھی، پر وہ زیادہ نہیں چلتی تھی۔ سو جب تایا جان عالمی سطح پر شہرت کے مالک ہوئے، انھوں نے میرے ابو کو اپنی پوری پارٹی سمیت مظفر علی خان قوال پارٹی میں شامل ہونے کی پیشکش کی۔ تایا جان کو اضافی ہم نوا چاہئیں تھے اور ایک پختہ آواز کو گویے کی ضرورت تھی جو ان کے ساتھ سنگت کر سکتا تھا۔ میرے ابو یہ پیشکش قبول کرنے پر مجبور ہوئے۔ ان کی پارٹی بری طرح سے ناکام تھی۔

لیکن ابو سے محض سنگت کرانا زیادتی تھا! ابو خود قوال تھے اور ایک پارٹی کی قیادت کر چکے تھے۔ وہ تایا جان سے ہر لحاظ سے بہتر تھے۔ دادا جان مرحوم کو ابو میں کمال نظر آیا تھا اور انھوں نے ان کو اپنا خلیفہ بنا لیا تھا اور کلاسیکی موسیقی کا پورا گیان دیا تھا۔ اس تربیت کے نتیجے میں ابو ایک مکمل گلوکار بن گئے تھے۔ ان کو بیسیوں راگ اور بندشیں اور سینکڑوں کلام؛ فارسی، سرائیکی، پنجابی، اردو، پوربی، عربی اور سندھی کے یاد تھے۔ انھیں نہ صرف قوالی پر بلکہ موسیقی کی ہر صنف پر عبور حاصل تھا۔ دھرپد، خیال، ٹھمری، نوحے، ماہیے اور قصے ان کے گھر کی لونڈیاں تھیں۔ جب وہ غزلیں گاتے تو سننے والے غلام نبی اور مہدی حسن جیسے مقبول غزلیوں کو یکسر بھول جاتے۔ ابو کے مقابلے میں تایا جان کا گیان بہت محدود تھا۔ وہ بچپن سے کاہل اور کند ذہن تھے، اس لیے دادا مرحوم نے ان کو سرسری سی تربیت دی تھی۔ لہٰذا ٹھمری، دھرپد اور خیال گائیکی پر ان کی دسترس معمولی تھی۔ وہ جب نوحے، قصے، غزلیں اور ماہیے گاتے تو جیسے وہ انھیں ذبح کر دیتے تھے۔ اوپر سے ان کی یادداشت کمزور تھی۔ انھیں صرف چار یا پانچ راگ اور دس بارہ کلام یاد تھے۔ وہ کلام کے بول اکثر بھول جاتے (شوز میں ایک ہم نوا پر ان کے کان میں بول بتانے کی ذمہ داری عائد تھی)۔ اس کے علاوہ ان کی جسمانی تکلیفیں تھیں کہ وہ زیادہ دیر تک گا نہیں پاتے تھے۔ وہ موٹاپے، شوگر اور دل کے مریض تھے، ان کے خون کا دباؤ بہت جلدی بڑھ جاتا تھا اور ان کی سانسیں بہت تیزی سے پھول جاتیں لیکن وہ اتنی اچھی اداکاری کرتے کہ ان کی خامیاں تماشائیوں کو محسوس نہیں ہوتیں۔ گاتے گاتے وہ اپنے بھاری وزن کے باوجود ایک بچے کی طرح اپنی گدی پر اچھلتے رہتے اور وہ اتنی تیزی سے سر گھماتے اور بازو ہلاتے کہ تماشائیوں کو دھوکا ہوتا کہ ان کو حال چڑھا ہوا ہے۔ ان کی اداکاری نے مغرب والوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا تھا کہ وہ ایک اللہ والے تھے، ایک درویش تھے جسے صرف خدا کی ذات سے سروکار تھا اور مادی دنیا سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ میرے ابو کو اس قسم کی اداکاری سے سخت نفرت تھی۔ گاتے وقت ان کی تمام تر توجہ سُر کی طرف ہوتی۔ وہ ڈرامے بازی

سے مکمل طور پر پرہیز کرتے اور اسی لیے شاید شروع ہی سے آسمان قوالی پر ان کا ستارہ تایا جان کے ستارے سے کم درخشاں تھا۔

یورپ کے مختلف شہروں میں ہمارے کم از کم بیس شوز ہوئے۔ شوز کے علاوہ لندن اور پیرس میں دو ریکارڈنگ بھی ہوئیں اور ہمیں برمنگھم اور مانچسٹر میں دو مالدار خاندانوں کی شادیوں میں گانے کا اتفاق بھی ہوا۔ اس پورے دورے میں، میں نے تایا جان کو ابو کے ساتھ مسلسل بدسلوکی کرتے دیکھا۔ تایا جان نے ابو کو ماتحت کا درجہ دے رکھا تھا۔ ابو بیک وقت ان کے قلی، نوکر اور نرس تھے۔ وہ تایا جان کا باجا اور سامان اٹھاتے تھے، ان کے لیے غذا اور مشروب کا بندوبست کرتے تھے، ان کے کپڑے استری کرتے تھے اور تہہ کرتے تھے اور ان کو آٹھ دس مرتبہ ان قیمتی دواؤں کی خوراکیں کھلاتے جن کے دم سے ان کی بیماریاں قابو میں رہتی تھیں۔ حد تو یہ تھی کہ وہ ہر شو کی شروعات میں اس بڑی سی گدی کو اسٹیج پر اٹھا لاتے جس پر تایا جان تشریف رکھتے۔ شوز کے دوران بھی تایا جان کا رویہ ابو کے ساتھ خاصا خراب تھا، وہ ان کو نیچا دکھاتے رہتے۔ جب سنگت کرتے وقت اتفاق سے ابو ان سے زیادہ اونچا گاتے یا زیادہ لمبی تانیں مارتے تو تایا جان کا منہ سڑ جاتا اور وہ انھیں جلدی جلدی کہتے؛ ''اوئے بس کری! بس کری!'' تایا جان کی بدتمیزیاں یہیں ختم نہیں ہوتی تھیں۔ تایا جان ابو کو پارٹی کے معمولی ہم نواؤں جتنی تنخواہ دیتے اور اشتہار سے ابو کا ذکر سراسر مفقود ہوتا، جب کہ عام مشاہدہ یہ تھا ہر شو میں ابو اتنا ہی گاتے جتنا کہ تایا جان۔ ابو کے ساتھ یہ مسلسل بدتمیزیاں مجھے زچ کرتی تھیں لیکن میں ابو کا رویہ دیکھ کر اپنا غصہ پی لیتا۔ ابو کبھی شکایت نہیں کرتے تھے۔ کبھی نہیں لڑتے تھے۔ مجال تھی کہ ان کے ماتھے پر ایک بل بھی پڑے۔ تایا جان دنیا کے سامنے صوفی بنتے، جب کہ ان کی طبیعت بالکل صوفیانہ نہیں تھی۔ وہ گھمنڈی اور کنجوس تھے۔ سچے صوفی میرے ابو ہی تھے جو خندہ پیشانی سے ان ساری ذلتوں کو خدا کی طرف سے امتحانات سمجھ کر برداشت کر لیتے تھے... لیکن ذلتیں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں؛ ایسا لگ رہا تھا کہ تایا جان کو میرے ابو کی توہین کرنے میں بے حد لطف آ رہا ہے۔ وہ یقیناً ابو کے ساتھ کوئی پرانا حساب چکا رہے تھے۔ میرا ماننا یہ تھا کہ وہ ابو سے خار کھاتے تھے کیوں کہ وہ دادا مرحوم کے لاڈلے تھے اور دادا جان نے ان کو خلیفہ کے خطاب سے نوازا تھا۔ تایا جان ان باتوں سے بہت چڑتے تھے اور وہ اپنی خار ابو پر نکالتے تھے۔

اس اولین دورے کے بعد میں تایا جان اور ابو کے متعدد بین الاقوامی دوروں میں شریک ہوا اور اسی طرح میں ان کے ساتھ یورپ، کینیڈا، یو ایس اے، برازیل، جاپان اور آسٹریلیا گھوم آیا اور پارٹی میں ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا۔ شروع کے دوروں میں، میں ہم نواؤں میں شامل تھا، اور ان کی طرح بول دہراتا تھا اور تالیاں بجاتا تھا، لیکن بعد کے دوروں میں، میں اسٹیج پر اپنے تایا اور ابو کے پہلو میں بیٹھنے لگا، اور تھوڑی بہت سنگت کرنے لگا۔ میری آواز اب پختہ ہو گئی تھی اور اس میں غضب کی وسعت اور لچک تھی۔ سو تایا جان نے میرے ساتھ ہر شو میں جگل بندی کرنی شروع کر دی۔ جب میں کوئی خوبصورت تان مارتا یا سُر نکالتا تو وہ میرے کاندھے پر تھپکی دیتے اور شاباشیاں دیتے؛ ابو خاموشی سے منہ لٹکائے ہمارے جگل بندی سنتے رہتے

اورسوچتے رہتے کہ تایا جان نے ان کو کبھی شاباشی نہیں دی تھی۔اب میرا خیال یہ ہے کہ اس جگل بندی اور ان شاباشیوں سے ابو کی توہین مقصود تھی۔ وہ مجھ جیسے نوسیکھیے کو اس طرح بار بار بڑھاوا دے کر ابو کو احساس دلا رہے تھے کہ وہ بالکل فارغ تھے۔ان کے گانے کے دن پورے ہو چکے تھے۔

تایا جان کی توہین آمیز حرکتوں سے ابو کو اتنی ٹھیس پہنچی کہ انھوں نے دورے پر جانے سے سراسر انکار کر دیا اور اپنے کمرے کے اندر بستر پکڑ لیا۔وہ پورا دن اور پوری رات اپنے بستر پر پڑے رہتے اور چھت کی طرف دیکھتے رہتے۔خدا جانے ان کے دماغ میں کس طرح کے خیالات گردش کر رہے تھے؛ وہ بہت بڑے ڈپریشن کا شکار تھے۔میں گھنٹوں ان کا ہاتھ تھام کر ان کے سرہانے بیٹھتا لیکن ابو میری طرف دیکھنے سے گریز کرتے۔ان کا نگاہوں کا واحد مرکز چھت تھی۔اب تایا جان کو افریقہ کے دورے پر جانا تھا۔ نیروبی، ممباسا، دارالسلام، جوہانسبرگ، ڈربن اور کیپ ٹاؤن میں شوز ہونے تھے۔انھوں نے مجھ سے بہت اصرار کیا؛''توں میرے نال جائی. تیرا پیو جدوں رب چاہوے گا ٹھیک ہو جاوے گا۔'' میں اپنے اس مہربان بزرگ کو کیسے انکار کرتا؟ میں ان کے ساتھ دورے پر گیا اور شوز بہت کامیاب ہوئے۔تایا جان کے ساتھ میری جگل بندی کو بہت سراہا گیا۔خوب تالیاں بجیں۔خوب واہ واہ ہوئی، پر گھر پہ ابو کی حالت تشویش ناک تھی۔ میں روز گھر پر فون کرتا اور ان کی صحت دریافت کرتا۔ایک دن پتہ چلا کہ وہ کھانے پینے سے انکار کر رہے تھے، اور اگلے دن پتہ چلا کہ ان کو ڈرپس لگی ہیں۔اب ہم ڈربن پہنچے تھے اور میں نے جب شو کے بعد گھر فون کیا تو مجھے خبر ملی کہ ابو کوما میں چلے گئے ہیں۔ میں پہلی پرواز سے گھر لوٹا۔میرے پہنچتے ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ میں نے تایا جان کو فون پر یہ بری خبر سنائی اور سنتے ہی انھوں نے جنازے میں شریک ہونے سے معذرت کر لی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگلا شو کیپ ٹاؤن کے اسٹیڈیم میں ہونا تھا اور سارے ٹکٹ بک چکے تھے۔اس شو کو منسوخ کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے ابو کے جنازے کو ان کی پارٹی کے تین سابقہ ہم نواؤں کے ساتھ کندھا دیا۔ تایا جان وہاں سے میلوں دور اپنے موسیقی کے کاروبار میں مصروف تھے۔

ابو کے بے وقت انتقال کا غم مجھے بہت عرصہ تک ستاتا رہا اور میں اپنے تایا سے بہت ناراض تھا، کیوں کہ تایا نے نہ صرف ابو کا حوصلہ توڑ کر انھیں موت کی راہ دکھائی تھی بلکہ ان کے انتقال کے وقت حیرت انگیز بے حسی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن میں کب تک ناراض رہ سکتا تھا۔ میں تایا جان کا محتاج تھا۔میری روزی روٹی ان کے شوز اور دوروں سے وابستہ تھی۔ میں برسوں سے ان کے احسانات اٹھا رہا تھا۔رسم چہلم کے بعد، جوں ہی تایا جان نے میرے سامنے نئے دوروں کا ذکر کیا، میں نے حامی بھر لی اور ان کے ساتھ دوبارہ سات سمندر پار چلا گیا۔

ایک نئی شام مجھے یاد آ رہی ہے؛ تقریباً چار سال پہلے کی شام۔ میں ریوڈی جینیرو بیچ کی ریت پر تایا جان کی پارٹی کے ہم نواؤں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ہم سب کے ہاتھوں میں ٹھنڈی بیئر کی بوتلیں تھیں۔ ہماری بغل میں خالی بوتلوں کا ایک انبار تھا۔ ہمارے سامنے سے محض چڈیوں میں ملبوس برازیل کی سانولی نمکین حسینائیں گذر رہی تھیں اور ہم ان کے حسن کی داد دینے کے لیے سیٹیاں بجا رہے تھے یا رومانی گیتوں کی کچھ

معنی خیز لائنیں گنگنا رہے تھے۔حسینہ ہم پر نگاہ ڈالے بغیر ایک ٹھنڈی متحرک مورت کی طرح آگے بڑھ جاتی تھی اور ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔سامنے سمندر تھا، اور ڈوبتا سورج اس کی افتاں وخیزاں لہروں میں سرخ اور پیلی پچکاریاں ملا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا:

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

میں پچھلے پانچ سالوں میں تایا جان کے ساتھ پوری دنیا گھوما تھا لیکن پہلی بار دنیا میں ایک ایسی جگہ ملی تھی جسے میں جنت ارضی کہہ سکتا۔افریقہ، ایشیا، یورپ، امریکہ، آسٹریلیا، خدا جانے کون سا خطہ ایسا تھا جس کا میں نے دورہ نہیں کیا تھا اور ان مسلسل سفروں نے میرے حلیے اور شخصیت کو بدل دیا تھا۔میرے بال جھڑنے شروع ہو گئے تھے اور میرا جسم فربہ ہو گیا تھا، پھر مجھے شراب کی عادت بھی پڑ گئی تھی۔اب شراب کے بغیر میرا گزارہ نہیں ہوتا تھا۔ مجھے روز پینا پڑتا تھا ورنہ مجھے چین نہیں آتا تھا۔حقیقت یہ تھی کہ مسلسل سفروں نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔آب و ہوا اور تماشائی ہر دوسرے دن بدلتے۔کڑاکے کی گرمی سہنے کے بعد برف باری جھیلنے کو ملتی اور برفباری کے بعد طوفانی بارشوں کو برداشت کرنا پڑتا۔گورے تماشائیوں کے بعد کالے تماشائی دیکھنے کو ملتے اور ان کے بعد سانولے یا پیلے تماشائی۔زبانوں کا ذکر علیحدہ ہے۔اتنی ساری ناقابل فہم زبانیں سننے کو ملتی تھیں کہ میں ان کی طرف توجہ دینے کی تکلیف بھی نہیں کرتا تھا۔ان سارے ادلتے بدلتے حالات میں دو چیزیں یکساں رہتیں؛ رہائش، جو ہمیشہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوتی تھی اور شراب؛ جس کا ذائقہ قاہرہ، تیونس، ہانگ کانگ، نیویارک، بوئینوس آئرس میں ایک جیسا تھا۔یہ دونوں چیزیں اجنبیت کے تکلیف دہ احساس کو دور کرتی تھیں...شراب خاص طور پر اس عمل میں ایک اہم کردار ادا کرتی۔ جہاں شراب ملتی وہاں اپنا پن لگتا۔میں اپنا پن کے چکر میں ہر روز پیتا تھا، کبھی دن میں یا کبھی رات کو، کبھی شو سے پہلے یا کبھی شو کے بعد۔کبھی ہوٹل میں یا کبھی جہاز میں۔کبھی ٹیکسی میں یا کبھی بس میں۔کبھی اکیلے میں یا کبھی آج کی طرح ہم نواؤں کے ساتھ۔اس عادت کو تایا سے چھپانا آسان نہیں تھا۔بُو چھپانے کے لیے میں چیونگ گم چباتا تھا، امرود کھاتا تھا، بدن پر عطر ملتا تھا۔لیکن وقتاً فوقتاً میری حالت تایا جان پر میری رندی ظاہر کر دیتی تھی۔ میں شو کے دوران اچانک بے سُرا ہو جاتا تھا یا اپنے بول بھول جاتا تھا یا پبلک کو سلام کرتے ہوئے بری طرح لڑکھڑا جاتا تھا۔تایا جان ان لمحوں میں مجھے قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے تھے اور میں دو تین دنوں تک ام الخبائث سے دور رہتا۔لیکن میں جلد ہی پہلے کی طرح روز پینے لگ پڑتا۔

سو میں اس دن ریوڈی جینیرو بیچ پر ہم نواؤں کے ساتھ بیئر پی رہا تھا اور ہم سب نشے میں اس قدر دھت تھے کہ ہم غالباً بھول ہی گئے تھے کہ ہم اس شہر میں کس مقصد کے لیے آئے تھے۔آج شام ہمارا شو تھا۔اچانک ایک ہمنوا نے گھڑی دیکھی اور کہا،''یارو! ساڈے چھے وج گئے نیں، شوست وجے نئیں ہونا سی؟'' اور یہ جملہ سنتے ہی ہم سب رند اٹھ گئے اور قریبی ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف دوڑ گئے۔ہمیں آدھے گھنٹے میں شہر کے کنسرٹ ہال پر پہنچنا تھا جو یہاں سے بارہ کیلومیٹر دور تھا اور رستے میں یقیناً رش ہونا تھا۔وقت پر پہنچنا

جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، صرف ایک ہیلی کاپٹر ہمیں وقت پر پہنچا سکتا تھا۔

میں اور میرے ساتھی پونے آٹھ بجے کنسرٹ ہال پر پہنچے۔ وہاں کہرام مچا ہوا تھا۔ سامعین، جو کم از کم تین ہزار تھے، پونے گھنٹے سے انتظار کر رہے تھے اور اب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ سیٹیاں مارنے لگے تھے، گالیاں بکنے لگے تھے، کرسیاں توڑنے لگے تھے۔ تایا جان پردے کے پیچھے سے سارا تماشا دیکھ رہے تھے اور کڑھ رہے تھے۔ وہ ایک گھنٹے سے ہماری راہ دیکھ رہے تھے اور اب بے صبرے اور بے چین ہو رہے تھے۔ ہم سب حرام خور کدھر گئے تھے؟ سو انھوں نے جب ہمیں دیکھا تو ہم پر ایک مہلک سی نظر ڈالی اور مجھے پاس آنے کو کہا۔ میری بُو سونگھ کر وہ سب کے سامنے چلانے لگے، ''بے غیرتا! تو فر شراب پیتی...توں تاں اپنے پیوتے پوری طراں گیا ایں...توں وی نالائق ایں!'' اور انھوں نے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن اچانک ان کی سانس پھول گئی۔ ان کا چہرہ لال ہو گیا اور ان کا ہاتھ ایک پنچھی کی طرح ہوا میں ٹھہر گیا۔ پھر انھوں نے اپنا ہاتھ نیچے گیا اور لہجہ بدل کر ایک ملتجیانہ انداز میں مجھ سے کہا؛ ''پترا میری دوائی دے دیو۔'' تایا جان کی دوائیاں پہلے میرے ابو کے پاس رہتی تھیں، اب وہ میرے قبضے میں تھیں۔ میں ان کو ہر وقت اپنے بستے میں رکھتا تھا اور تایا جان کو پلاتا رہتا تھا لیکن اب میں تایا جان کو رحم کی نہیں بلکہ نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس خبیث نے پوری پارٹی کے سامنے مجھے اور میرے ابو کو گالیاں دینے کی کیسے جرأت کی تھی؟ میں شش و پنج میں تھا کہ اس خبیث کو دوائیاں دوں یا نہ دوں؟ لیکن تایا جان نے مجھے زیادہ دیر دماغ لڑانے نہیں دیا، وہ گرج کر کہنے لگا، ''اوئے، چھیتی کری!'' اور میں اپنے بستے سے ان کی حیات بخش دوائیاں نکالنے پر مجبور ہو گیا۔

تایا جان نے اپنی دوائیاں کھائیں اور ان کو فوری آرام ملا۔ ہم سب اسٹیج پر چلے گئے۔ شو شروع ہوا۔ ناراض سامعین تایا جان کی آواز سنتے ہی اس کے سحر میں آ گئے اور شانت ہو گئے۔ تایا جان نے میرے ساتھ جگل بندی شروع کی اور میں جگل بندی کرنے لگا لیکن بادل نخواستہ تایا جان نے میری اور میرے والد صاحب کی ہتک میں آخری حد پار کر لی تھی۔ انھوں نے میرا دل بالکل توڑ دیا تھا اور میں اس ٹوٹے دل کی قسم کھا رہا تھا کہ میں جلد یا بدیر اس دہری ہتک کا بدلہ لوں گا۔

اب ایک اور جنت ارضی مجھے یاد آ رہی ہے۔ صبح کا وقت تھا۔ میں تایا جان کی بغل میں ایک ہیلی کاپٹر میں بیٹھا تھا۔ ہمارے ساتھ ایک فلمی عملہ تھا۔ ہیلی کاپٹر نے کچھ لمحے پہلے اڑان بھری تھی اور وہ بہت بلندی سے پرواز کر رہا تھا۔ آسمان شربت کی طرح گلابی تھا اور نیچے ایک خوب صورت اور سرسبز جزیرہ جلوہ دے رہا تھا؛ جزیرۂ ریونیون۔

ہم یہاں کیوں آئے تھے؟ تایا جان کے پروڈیوسر کا پلان تھا، دراصل تایا جان کا نیا البم جو ۹ ری مکسڈ کلام پر مشتمل تھا۔ چند ہفتوں میں یورپ اور امریکہ میں ریلیز ہونے والا تھا اور اس البم کی پبلسٹی کے لیے پروڈیوسر نے ایک کلام کا وڈیو کلپ تیار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ کلپ کو یادگار بنانے کے لیے یہ طے ہوا تھا

کہ وہ جزیرۂ ریونیون کے آتش فشاں کے دہانے کے قریب فلمایا جائے گا۔ پیش منظر میں، تایا جان اور میں، ہم دونوں کالے چغوں میں ملبوس نظر آئیں گے؛ تایا جان گاتے ہوئے اور میں باجا بجاتے ہوئے۔ پس منظر میں آتش فشاں کا دہانہ نظر آئے گا اور دہانے میں ابلتا ہوا لاوا۔ یہ ہیلی کاپٹر اس وقت ہمیں دہانے کی طرف لے جا رہا تھا۔

ہیلی کاپٹر زوردار ہوا کے باوجود آتش فشاں کے دہانے کے بالکل قریب اترنے میں کامیاب ہوا۔ میں، تایا جان اور فلمی عملے کے لوگ اترے اور ہیلی کاپٹر اڑ گیا۔ وہ شام کو کلپ کی شوٹنگ کے بعد ہمیں لینے واپس آنے والا تھا۔ شوٹنگ جلدی شروع ہو گئی تھی۔ تایا جان اور میں اپنے ماتمی چغے پہن چکے تھے اور گانے اور بجانے کی اداکاری کر رہے تھے۔ ہمارے اردگرد کیمرہ گھوم رہا تھا، پر یہاں زیادہ دیر رہا نہیں جا سکتا تھا۔ یہاں سخت سردی تھی (یہ مقام خاصی اونچائی پر تھا) اور آتش فشاں کے دہانے سے گیس نکلتی جا رہی تھی اور چاروں طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ فلمی عملے کے لوگ ان سے بچنے کے لیے نقاب پہن چکے تھے لیکن تایا جان اور میں دونوں بے نقاب تھے۔ تایا جان کی طبیعت جلدی ہی خراب ہونے لگی۔ انھوں نے اچانک عملے والوں کو شوٹنگ روکنے کا اشارہ کیا اور مجھے کہا، ''پترا، مینوں چکر آ رہے نیں، چھیتی دوائی دے۔'' مجھے اس لمحے کا بہت دنوں سے انتظار تھا۔ میں نے اپنا بستہ اٹھایا، ٹٹولا اور پھر ایک پریشان چہرے کے ساتھ کہا، ''تایا جی! میں دوائیاں وچ بھل گیا واں۔'' تایا جان نے مجھے بے یقینی سے دیکھا، میری آنکھوں میں جھانکا اور دھڑام سے زمین پہ ڈھے گئے۔

اب سب کچھ میرے پلان کے تحت چل رہا تھا۔ عملے کے لوگوں نے کسی طرح ہسپتال کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور ہسپتال کا ہیلی کاپٹر تایا جان کو لینے آیا۔ میں ہیلی کاپٹر میں ان کے ساتھ ہسپتال چلا گیا، دنیا کو یہ دکھانے کے لیے کہ میں ایک فرمانبردار بھتیجا تھا۔ میں نے پوری پرواز میں ان کا ہاتھ زور سے تھاما تھا جو بالکل ٹھنڈا تھا۔ جب ہم ہسپتال پہنچے اور تایا جان کا معائنہ کیا گیا تو ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ چند لمحے پہلے خدا کو پیارے ہو گئے ہیں۔ قوالی کا روشن ترین ستارہ ڈوب گیا تھا اور میرا بدلہ پورا ہو چکا تھا۔

میں تایا مرحوم کی میت کے ساتھ جزیرۂ ریونیون سے اختر آباد (یہ ہمارے آبائی شہر کا نام ہے) واپس آیا۔ وہاں تایا مرحوم کا جنازہ نکلا۔ اختر آباد نے کبھی ایسا جنازہ نہیں دیکھا تھا۔ اس میں کم از کم پندرہ ہزار لوگ شریک ہوئے تھے۔ تایا جان کے عاشق ملک کے ہر کونے سے آئے تھے؛ فلمی ستارے، نامور گویے، مشہور سیاست دان، مذہبی لیڈر اور گمنام عاشق افسوس کرنے کے لیے تایا مرحوم کے گھر آئے۔ تایا مرحوم شادی شدہ نہیں تھے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ میں ان کا واحد وارث تھا۔ اس لیے ان سارے لوگوں نے میرے سامنے ہی تعزیتیں پیش کیں۔ ان دنوں مجھے تایا مرحوم کے گھر کی بیٹھک میں ڈیرا ڈالنا پڑا۔ افسوس کرنے والوں کی وہاں ہر وقت آمد تھی۔ میں دن بھر سوگوار لوگوں سے گلے ملتا۔ میرا گریبان ان کے اشکوں سے تر رہتا اور میرے کانوں میں ان کے رسمی الفاظ ہر دم بھنبھناتے رہتے۔ قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے، یہ

سارے دل گیر اور سوگوار لوگ جس شخص کے پاس افسوس کرنے آئے تھے، اس کا مرحوم کی موت میں کتنا بڑا ہاتھ تھا۔

تایا جان کی قبر جلدی ہی پکی ہوگئی۔ اس میں بہترین اور نفیس ترین سنگ مرمر افراط سے استعمال ہوا اور قبر کے اردگرد دیواریں کھڑی کی گئیں۔ ان دیواروں پر ایک گنبد کی ٹوپی رکھی گئی۔ باہر کچھ ملنگ اپنے کشکول، لاٹھیاں اور چلم لے کر بیٹھ گئے۔ کچھ فاصلے پر گل فروشوں، چادر فروشوں اور کیسٹ فروشوں نے خوانچے لگائے۔ تایا مرحوم کے عشاق کا تانتا بندھنے لگا۔ تایا مرحوم کی قبر نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک مزار کی شکل اختیار کرلی اور اسی نوتعمیر مزار کے سامنے ان کی مجلس چہلم کا انعقاد ہوا جس میں عشاق نے ہزاروں کی تعداد میں شرکت کی۔ اس دن بھی مجھے سینکڑوں لوگوں سے بغلگیر ہونا پڑا اور سینکڑوں تعزیاتی الفاظ سننے پڑے۔

محفل چہلم کے اگلے دن تایا مرحوم کا منیجر میرے پاس آیا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ تایا مرحوم کے بیرونی دورے اگلے پانچ سالوں کے لیے مرتب ہو چکے تھے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں ان کا بے صبری سے انتظار تھا اور قوالی کے عاشقوں کو مایوس نہیں کرنا چاہیے، سو اس نے مجھ سے تایا مرحوم کی جگہ شوز کرنے کی گذارش کی۔ تایا مرحوم کی پارٹی میرے ساتھ رہے گی، اس کا نام تبدیل کیا جائے گا، وہ کامران علی خان قوال پارٹی کہلائے گی۔ دنیا میں یہ منادی کی جائے گی کہ میں مظفر علی خان مرحوم کا خلیفہ ہوں اور قوالی کے عاشق مجھے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ میں نے یہ گذارش منظور کرلی اور تایا مرحوم کا تاج پہن لیا۔

پر، تایا مرحوم کا تاج ایسے ہی پہنا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے لیے کچھ تیاری کرنی تھی۔ کچھ محنت کرنی تھی، کیوں کہ پروڈیوسرز اور پبلک کی توقعات بہت بلند تھیں۔ انھیں تایا مرحوم کی پارٹی کا شور پسند تھا۔ میں نے پہلے سے زیادہ شور مچانے کے لیے ہم نواؤں اور طبلہ نوازوں کی تعداد بڑھا دی۔ پھر میں نے سنگت کرنے کے لیے ہم نواؤں میں سے دو سریلے بندوں کا انتخاب کیا اور اپنی آواز کو تایا مرحوم کی آواز کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ میں مشقت کر کر کے اس میں وہ سوز پیدا کیا جو تایا مرحوم کی آواز کی پہچان تھا۔ پھر میں نے ان سے بھی زیادہ تیز اور اونچا گانے کی مشق کی اور اعلان کاروں کی پوری آتش بازی سے کام لینے کی عادت ڈالی۔ پھر جب میری آواز اور میری گائیکی تایا جان کی آواز اور گائیکی سے مشابہ ہوئی تو میں اپنی نئی پارٹی کے ساتھ دورے پر چلا گیا۔ سب سے پہلے مجھے یورپ کا دورہ کرنا تھا۔ سوئٹزرلینڈ، جرمنی، ہالینڈ اور بلجیم میں شوز تھے۔ زیورخ، برلن اور امسٹرڈیم کے شوز یادگار رہے۔ میں نے سامعین کو ایسے موہ لیا کہ سب تایا مرحوم کا نام تک بھول گئے۔

مقامی اخبار میری گائیکی کی تعریفوں سے بھرے تھے۔ صحافی مجھے سلطان قوالی کا خطاب دے رہے تھے۔ میں تیزی سے تایا مرحوم کا نام ذہنوں سے مٹا رہا تھا۔ پھر چوتھا شو ہوا؛ برسلز میں۔ ایک نیا شہر فتح کرنا تھا۔ شو سے پہلے میں کافی تناؤ محسوس کر رہا تھا جس کو کم کرنے کے لیے میں کنسرٹ ہال کے باہر ایک بار میں جا کر پان چھ بیئر پیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب شو کا آغاز ہوا تو میں بڑی مشکل سے اسٹیج پر اپنی گدی تک پہنچا۔ سامعین کو رام کرنے کے لیے مجھے اس شو میں اپنی درویشی اور فن کاری دونوں کی جھلکیاں دکھانی تھیں۔ اپنی

درویشی منوانے کے لیے میں نے من کن تو گایا اور کلام باہو کے کچھ بیت پیش کیے۔ شراب نے مجھ میں ایک کمال کی بے خودی پیدا کی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ میری آواز میرے گلے سے نہیں بلکہ میری روح سے نکل رہی تھی۔ ایک روحانی اثر پورے ہال میں پھیل رہا تھا۔ بے خودی اور محویت سامعین کو اپنے حصار میں لے رہی تھی۔ چلو، میری درویشی ثابت ہوئی، اب فنکاری کی باری تھی۔ میں نے ''حق علی علی'' چھیڑا، اور سامعین پر تانوں کی بارش شروع کی۔ تانیں تیزی سے ایک دوسرے کا تعاقب کر رہی تھیں اور ہر تان پچھلی سے لمبی اور اونچی تھی۔ میری آواز خطروں اور رکاوٹوں سے بے نیاز، سُر کے بلند ترین پہاڑوں کو فتح کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس نے باری باری گاشربروم، نانگا پربت اور دھولا گیری کو فتح کیا۔ بیچ بیچ میں، میں سامعین پر نظر ڈال رہا تھا، ان کی کیفیات بدل گئی تھیں، وہ عالم استغراق سے نکل آئے تھے اور اب جوش میں تھے۔ ایک آدھ دیسی اپنی کرسیوں سے اٹھ گئے تھے اور دھمال ڈال رہے تھے۔ سامعین کا جوش مجھے سُر کے نئے پہاڑوں کو فتح کرنے کا حوصلہ بخش رہا تھا۔ اب سُر کا K2 میرے سامنے تھا، سُر کا سب سے سفاک سب سے خطرناک پہاڑ جسے میرے تایا مرحوم نے پوری زندگی فتح کرنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ میں بے خودی میں مبتلا تھا اور بہت حوصلہ میں تھا۔ میں K2 پر چڑھنے لگا۔ میں نے اس کام علی کے پاک نام کا سہارا لیا اور اونچے سے اونچے سُر میں آپ کے نام کا ورد کرنے لگا.... علی علی علی علی علی علی.... علی ی ی ی ی ی، علی ی ی ی ی۔ میری آواز چڑھتی جا رہی تھی، چڑھتی جا رہی تھی۔ سامعین کا جوش ساتھ ساتھ چڑھتا جا رہا تھا۔ آدھے سے زیادہ لوگ اب کھڑے ہوئے تھے اور ناچ رہے تھے یا جھومتے جھومتے تالیاں مار رہے تھے اور K2 کی چوٹی قریب سے قریب تر آ رہی تھی کہ اچانک ایک سایہ؛ ایک موٹا سا سایہ اسٹیج پر میرے سامنے سے گذرا۔ یہ کہاں سے آیا تھا؟ اور کیا تھا؟ کوئی بھوت تھا؟ کوئی جن تھا؟ لیکن جن کب سے اتنے موٹے ہو گئے؟ وہ اتنے پتلے ہوتے ہیں کہ بڑے آرام سے بوتلوں کی نالیوں سے نکلتے ہیں۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ میری آواز میرا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ وہ اپنی وسعت اور طاقت کھو چکی ہے۔ وہ ایک پھٹے ہوئے غبارے کی طرح زمین پر گر رہی ہے، اس کی ساری ہوا نکل گئی ہے۔

اس اثنا میں سایہ غائب ہو گیا تھا۔

سنگت کرنے والوں نے حالات کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش کی۔ انھوں نے میری جگہ تانیں لگائیں اور پلٹوں، مرکیوں، سرگموں، زمزموں، اندولنوں اور گمکوں کی مدد سے اپنی فنکاری کی طرف سامعین کی توجہ کھینچنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش رائیگاں گئی۔ سامعین کی ساری توجہ میری طرف تھی اور میں خاموش اور لاچار تھا۔ میرے گلے سے اب ایک آواز بھی نہیں نکل سکتی تھی۔ کچھ لوگوں نے میری طرف اشارہ کر کے سیٹیاں مارنی شروع کردیں اور جلدی ہی اتنے لوگوں نے سیٹیاں ماریں کہ ان کا شور سنگت کرنے والوں کی آوازوں پر حاوی ہو گیا۔ ہال کی انتظامیہ کو اسٹیج کی بتیاں گل کرنی پڑیں اور میں اپنے ساتھیوں سمیت اسٹیج سے بھاگ گیا۔ سامعین نے میری کیوں ہوٹنگ کی تھی؟ کیوں کہ انھیں میری احمقانہ خود اعتمادی پر غصہ آیا تھا۔ میں نے K2 فتح کرنے کی کوشش کی تھی، جب کہ یہ میرے بس کا روگ نہیں تھا اور میں نے منھ کی کھائی تھی۔

ایسا بالکل نہیں تھا، میں اپنی اوقات سے باہر نہیں آیا تھا۔ مجھ میں K2 کو فتح کرنے کی صلاحیت تھی لیکن موٹا سا یہ عین وقت پر گزرا تھا اور وہ بدنیت تھا۔ اس نے ایک دم سے میری آواز کو گم کر دیا تھا اور مجھے اس طرح احساس دلایا تھا کہ جزیرۂ ریونیون والا حادثہ اس پر کتنا ناگوار گزرا تھا۔

بروکسیلر والے شو کے دوران میں نے اپنی آواز کھوئی تھی اور اس کے برآمد ہونے کی کوئی امید نہیں جھلک رہی تھی۔ شہر کے بہترین ڈاکٹروں نے میرا معائنہ کیا تھا اور لاچاری جتائی تھی۔ جیبھ، گلا، پھیپھڑے سب صحیح تھے۔ خدا جانے میری آواز کو کیا ہوا تھا، معاملہ ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ سو اس صورت میں میرا منیجر اس دورے کے سارے شوز منسوخ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بہرحال، معاملہ مجھے پوری طرح سمجھ میں آ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب تک میں تایا مرحوم کی روح کو راضی نہیں کروں گا، میری آواز گم رہے گی اور یہ ایک دن میں نہیں ہونے والا تھا۔ یہ مہینوں یا سالوں کی ریاضت سے ہونے والا تھا۔ میں نے اپنے منیجر کو بتایا کہ میری گمشدہ آواز کی بازیافت میں کافی دیر لگے گی، اور ہم دونوں نے دل پر پتھر رکھ کر آگے کا سارا شیڈول منسوخ کر دیا اور کامران علی خان قوال پارٹی کو ختم کیا۔ سنگت کرنے والے ہم نوا اور طبلہ نواز اپنی اپنی تنخواہیں لے کر وطن واپس چلے گئے۔ کامران علی خان قوال پارٹی ایک ماضی کا قصہ بن کر رہ گئی۔

ملک واپس آ کر میں نے حکیموں اور نیم حکیموں سے علاج کرانا شروع کیا۔ میں نے ہر طرح کی جڑی بوٹیاں کھائیں، ہر طرح کی شربتیں پیں، اور ناگنوں کی کھالیں، چھپکلیوں کی دُمیں، گدھوں کو چونچیں اور مارخوروں کے سنگھ جیسی کڑوی اور گھناؤنی اشیا بھی آزمائیں، ان سے تھوڑا سا فرق پڑا یعنی کہ میں بولنے کے قابل ہو گیا لیکن دھیمی آواز میں۔ میری آواز بہت کرخت ہو گئی تھی۔ اس آواز میں گانا ناممکن تھا، اب میں حوصلہ ہارنے لگا تھا۔ تایا مرحوم نے میری گائیکی کو نظر لگائی تھی۔ اب مجھے کوئی دوسرا کام دھندا کرنا تھا۔ کیسا کام؟ مجھے صرف گانا آتا تھا۔ میں ان سوچوں میں گم ہی تھا کہ اچانک ایک فون آیا اور میری تقدیر بدل گئی۔

کال سرحد پار سے فلم پور کے ایک پروڈیوسر کا تھا جس نے بہت عرصہ پہلے تایا مرحوم سے کسی مووی میں دو صوفی گیت گوائے تھے۔ اب اس کو ایک بڑے بجٹ کی مووی کے لیے اس قسم کے دو گیت ریکارڈ کروانے تھے۔ اس کو تایا مرحوم سے ملتی جلتی کوئی آواز چاہیے تھی۔ اس نے مجھے چھ ماہ پہلے ایمسٹرڈیم میں سنا تھا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا تھا کہ میری آواز اور تکنیک دونوں کی تایا مرحوم سے بالکل مشابہت تھی۔ اس لیے اس کی نگاہ انتخاب مجھ پہ پڑی تھی۔ وہ مجھے فلم پور بلا رہا تھا۔ میں اس آدمی کی نادانی پر حیران تھا۔ کیا اس کو خبر نہیں تھی کہ ایمسٹرڈیم والے شو کے دو دنوں بعد برزیلیس میں میری آواز گم ہو گئی تھی؟ اس احمق نے فون پر میری موجودہ آواز سن کر یہ اندازہ نہیں لگایا تھا کہ اس میں کوئی گڑبڑ تھی؟ شاید نہیں۔ کچھ لوگ اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں؛ دنیا سے بیگانہ اور بے خبر۔ بہرحال، میں نے اس دعوت پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے فلم پور جانا چاہیے۔ وہاں زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتا تھا؟ پروڈیوسر کو معلوم پڑنے والا تھا کہ میں گانے کے قابل نہیں ہوں اور وہ مجھے وطن واپس بھیجنے والا تھا۔ اسی بہانے مفت میں فلم پور کا چکر لگنے والا تھا۔ میں نے پروڈیوسر کی دعوت قبول کی، اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ وہ جلدی مجھے ٹکٹ بھیج دے گا اور فون رکھنے سے پہلے اس

نے اچانک پوچھا؛ ''ویسے آپ کی آواز کو کیا ہوا؟'' میں نے جھوٹ بولا ''بس زکام لیکن میں توت سیاہ کا شربت باقاعدہ پی رہا ہوں۔ انشااللہ وہ ریکارڈنگ تک ٹھیک ہو جائے گی۔''

میں فلم پور پہنچا اور ریکارڈنگ اسٹوڈیو چلا گیا۔ میں نے یہ سوچتے ہوئے میوزک ڈائریکٹر کے سامنے پہلے گیت کی پہلی لائن لگائی کہ مجھے مار پڑے گی اور مجھے اگلے جہاز سے واپس بھیج دیا جائے گا لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میری معذور آواز نے میوزک ڈائریکٹر کو اپنا گرویدہ بنالیا اور اس نے اعتراف کیا کہ یہ وہ آواز تھی جس کا وہ سالوں سے متلاشی تھا۔ وہ منفرد تھی۔ اس میں ایک انوکھا ساز تھا، ایک انوکھا درد تھا۔ اگر میں بے سُرا تھا اور میری آواز کرخت تھی تو کیا ہوا؟ پبلک سریلے گلوکاروں کی خوب صورت آوازوں سے تنگ آ چکی ہے۔ بہرحال، میرے دونوں صوفی گیت ریکارڈ ہوئے اور بہت مقبول ہوئے۔ مجھے فوراً ایک دوسری مووی میں صوفی گیت گانے کا آفر آیا۔ پھر ایک تیسری موودی میں۔ پھر ایک چوتھی میں۔ اور میرے سارے گیت یکے بعد دیگرے ہٹ ہوئے۔ میں ترقی کی سیڑھیاں جلدی جلدی طے کر رہا تھا اور میری تیز ترقی کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ سب فلمی گلوکار میری نقل کرنے لگے اور پھٹی سی کرخت سی آواز میں صوفی گیت گانے لگے۔

یہ میرے عروج کا دور تھا۔ میں ترقی کرتے کرتے آخر فلم پور کے ستاروں کے محدود گروہ میں شامل ہوا تھا اور اتنے پیسے کمانے لگا کہ میں نے سواگت ہوٹل جیسے مہنگے ہوٹل کے سوٹ نمبر ۲۱۲ میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ ۲۱۲ میں مجھے بڑا سکون آتا تھا۔ ظاہر ہے میرے خواب وخیال میں یہ بات نہیں تھی کہ اس شاندار ہوٹل پر ایک شام دہشت گردوں کا حملہ ہوگا اور مجھے اس الماری میں روپوش رہنا ہوگا۔ بہرحال، ۲۱۲ میں کم وقت گزارتا تھا، کیوں کہ میں صبح سے لے کر شام تک ریکارڈنگ اسٹوڈیو اور ٹی وی اسٹوڈیوز میں مصروف رہتا تھا۔ رات کو ان پارٹیوں میں عیش کرتا تھا جن میں فلم پور کے خوبرو اور ہردلعزیز ستارے مجھے بلاتے تھے۔ میں ان پارٹیوں میں شکار کرتا۔ میں کسی چھوٹے کپڑوں میں ملبوس ماڈل کو نظروں سے منتخب کرتا، اس کے پاس آتا، اپنا تعارف کراتا (حالاں کہ میں تعارف کا محتاج نہیں تھا)، اور ایک ہاتھ میں جام لے کر اور جام کو لے میں لہراتے لہراتے اس کے کان میں اپنا کوئی مشہور گیت گنگناتا۔ ماڈل گیت کے بول سمجھے بغیر واہ واہ کرتی اور اکثر اس پر میری صوفی آواز اتنا اثر کرتی کہ وہ ۲۱۲ میں رات کا بقیہ حصہ گزارنے پر راضی ہو جاتی۔ میرے لیے حیرت کا مقام تھا کہ میری معذور آواز حسیناؤں کو میرے بستر میں کتنی آسانی سے گھسیڑ دیتی تھی۔

پر، فلم پور کے دوسرے گلوکار میری کامیابی سے بہت نالاں تھے۔ ان سے یہ بات نہیں ہضم ہوتی تھی کہ ایک ایسا آدمی جو دشمن دیس سے آیا تھا اور جس کی آواز اتنی تھکی سی تھی، ان سے زیادہ ترقی کرے۔ سو انھوں نے میری ترقی کو روکنے کے لیے میرے خلاف ایک سازش رچائی۔ انھوں نے شاہواز خان کی سالگرہ پارٹی میں میرے پاس ایک خوبصورت لڑکی بھیجی، جس نے میری آواز کو والہانہ دادیں دیں اور ۲۱۲ جانے پر فوراً آمادہ ہو گئی۔ میں خوش تھا، پہلی بار ایک حسینہ اتنی جلدی میرے شکنجوں میں آئی تھی لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس حسینہ کے بیگ میں ایک چھوٹا سا کیمرہ لگا ہوا تھا جس کے ذریعہ ۲۱۲ میں ہونے والی کارروائی شروع

سے آخر تک فلمائی گئی۔ اگلے دن یہ فحش فلم تھوڑی قطع و برید کے بعد (اس سینوں کو کاٹا گیا جن میں لڑکی کا چہرہ نظر آ رہا تھا)، نیٹ پر اپ لوڈ ہو گئی اور لاکھوں لوگوں نے اس کو دیکھا۔ جنتا اشتعال میں آ گئی۔ مہیلا سنگھٹنوں اور ہندو کٹر پنتھیوں نے شہر میں جلوس نکالے اور چوراہوں پر میرے اشتہار، سی ڈیز، پوسٹر اور میرا پتلا جلا کر میری فحش کارروائی کے خلاف زوردار احتجاج کیا۔ مہیلائیں مجھے ودیشی دلال کے خطاب سے نواز رہی تھیں اور ہندو کٹر پنتھی مجھے دشمن دیس کا ایجنٹ قرار دے رہے تھے، جس کا بنیادی مقصد مقامی لڑکیوں کو بے شرمی کی طرف لے جانا تھا۔ پھر میرے مقامی ایجنٹ اور پروڈیوسرز کو دھمکیاں موصول ہو گئیں۔ انھوں نے راتوں رات میری ساری ریکارڈنگز اور ٹی وی شوز کینسل کر دیے۔ میں بھاگم بھاگ وطن لوٹا۔

فلم پور سے واپس آنے کے بعد میرا حوصلہ بہت ہی پست تھا۔ خدا نے ایک اور بار میرا امتحان لیا تھا۔ بہت سخت امتحان تھا۔ اس نے مجھے کامیابی کا تحفہ دیا تھا اور فوراً ہی اس تحفے کو میرے ہاتھوں سے چھین لیا گیا تھا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ خدا کو آخر میرے ساتھ کیا مسئلہ تھا؟ میں اس کی نظر میں خوشی اور کامیابی کا حقدار کیوں نہیں تھا؟ چلو، میں نے تایا مرحوم کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا، لیکن میں نے بعد میں اپنی آواز کھو کر اس گناہ کا پورا خمیازہ بھگتا تھا، اور ویسے بھی تایا مرحوم کوئی فرشتہ نہیں تھے، ان کی ہتک آمیز حرکتوں نے میرے ابو کو خودکشی پر مجبور کیا تھا۔ سو میں اپنی صفائی میں یہ عرض کر سکتا تھا کہ میں نے تایا سے محض ابو کا بدلہ لیا تھا، پر خدا مجھے اب تک کیوں سزا دے رہا تھا؟ خدا نے مجھے اب تک کیوں معاف نہیں کیا تھا؟ میں نے اس سلسلے میں ایک بزرگ فقیر سے مشورہ کیا، جو اکثر تایا مرحوم کے مزار پر آتا تھا۔ فقیر نے مجھے سمجھایا کہ خدا نے مجھے اس وجہ سے نہیں معاف کیا تھا کہ میرا دل تکبر سے معمور تھا۔ ''تکبر توں نجات کداں ہوسی؟'' میں نے فقیر سے پوچھا اور اس نے مجھے یہ جواب دیا، ''میرے در گے فقیر ہو جاؤ۔'' سو میں فقیر بنا اور ایک مزار سے دوسرے مزار تک پیدل سفر کرنے لگا۔

لیکن ان دنوں مزاروں کا برا حال تھا۔ ان پر تالے لگے ہوئے تھے یا وہ خالی تھے۔ وجہ؟ ملک کچھ عرصے سے دہشت گردوں کا تختۂ مشق بنا ہوا تھا۔ حکومت، فوج اور کافران کی آنکھوں میں کھٹکتے تھے۔ سو وہ حکومت کی عمارتوں کو، فوجیوں کی چھاؤنیوں کو اور کافروں کی عبادت گاہوں کو اڑانے لگے تھے۔ اب انھیں نئے اہداف کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ سو انھوں نے ان مسلمانوں کو نشانہ بنانا شروع کیا جن میں کافرانہ رجحانات موجود تھے اور وہ عموماً مزاروں پر جانے والے لوگ تھے۔ ہر مہینے کئی بار یہ خبر ملتی کہ فلاں مزار پر حملہ ہوا اور فلاں میں دھماکہ۔ کچھ مزار حکومت کے حکم سے مقفل ہو گئے تھے۔ جو بچ گئے تھے، ان پر سناٹا چھا گیا تھا۔ عقیدت مند حاضری دینے سے ڈر رہے تھے۔ قوال، سجادہ نشین اور مجاور بھی ان کی طرح ڈرے ہوئے تھے۔ سو موجودہ صورت حال یہ تھی کہ مزاروں میں نہ عرس اور دوسری تہوار منائے جاتے اور نہ قوالی گائی جاتی۔ مجھے ان سب ڈرپوک لوگوں پر بہت غصہ آتا تھا۔ ان سب کے بڑے بڑے روحانی دعوے تھے لیکن وہ اندر سے انتہائی بزدل تھے، ایمان اور حوصلے سے سراسر عاری تھے۔ سو اپنے ایمان اور حوصلے کا مظاہرہ کرنے کے لیے

میں روز ایک نئے مزار پر گانے لگا اور اسی طرح بیسیوں مزاروں نے میری خستہ اور شکستہ آواز سماعت فرمائی۔

ان سارے مزاروں پر میری حاضری بڑی انوکھی تھیں۔ میں ان کے صحنوں میں بیٹھ کر اپنے باجے پر انگلیاں نچاتے نچاتے پورے جذبے کے ساتھ گاتا تھا۔ میرے سامعین عموماً تین یا چار ہوتے؛ سارے ملنگ۔ وہ ان خطرناک مزاروں میں اس وجہ سے آئے تھے کہ وہ اللہ والے لوگ تھے اور اپنی جان سے بے پروا تھے۔ وہ مجھے سنتے سنتے اپنی چلم کے طویل کش لگاتے تھے اور گانے کے بعد اچانک اٹھتے اور ایک بے پرواسا منہ بنا کر ناچتے۔ ان کی چلموں کا دھواں چاروں طرف پھیلتا اور دھوئیں کی جلیبیاں میری ناک تک آتیں جو مجھے ایک میٹھی سی ہمت بخشتیں۔ کتنا عجیب منظر تھا۔ یہ وہی مزار تھے جن کے صحنوں میں کچھ مہینے پہلے عقیدت مندوں کے بڑے مجمعے لگتے تھے، یہ وہی ملنگ تھے جو ان صحنوں میں عرس کے دن سینکڑوں کی تعداد میں رقصاں پائے جاتے تھے اور یہ وہی قوال تھے جس کے سامنے ایک زمانے میں تماشائیوں کا ہجوم بیکراں ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ اب مزار ویران تھے، ملنگ تین یا چار تھے اور قوال کمزور اور بے سُرا تھا۔

آخر کار میری مسلسل حاضریاں رنگ لائیں۔ خدا میرے ایمان اور حوصلے کا قائل ہوا اور اس نے مجھے اپنا کامل تحفظ عطا کیا۔ لہٰذا میں نے ان دنوں میں بیسیوں مزاروں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور ان حساس مقاموں پر نہ کبھی حملہ ہوا، نہ کبھی بم پھٹا۔

اب مجھے تایا مرحوم کے مزار پر گانا تھا۔ تایا مرحوم کی دوسری برسی قریب تھی۔ میں اس موقع پر ان کے مزار پر جا کر ان کا پسندیدہ کلام یعنی 'کلام باہو' گانا چاہ رہا تھا۔ میں خدا پر اس طریقے سے ظاہر کرنا چاہ رہا تھا کہ میرے دل میں تایا مرحوم سے اب کوئی بیر نہیں تھا۔ میں نے اس برسی کو شاندار بنانے کے لیے ملک بھر کے قوالوں اور گویوں کو آنے کی دعوت دی لیکن سب نے معذرت کر لی۔ سبھی خوف کی گرفت میں تھے۔ میں برسی میں اکیلا گانے جا رہا تھا۔ مجھے عوام کے آنے کی امید بھی نہیں تھی۔ مجھے اصولاً عوام کو برسی کی اطلاع دینی تھی۔ سو میں نے سارے شہر میں رنگین اشتہار لگوائے لیکن مجھے پتہ تھا کہ تایا مرحوم کا ایک عاشق بھی آنے کا خطرہ نہیں مول لے گا۔ حالات حوصلہ افزا نہیں تھے، اور اوپر سے پولیس نے شوشا چھوڑا۔ برسی سے چند دن پہلے ایک اعلیٰ درجے کا پولیس آفیسر میرے پاس آیا جس نے عرض کیا کہ حالات ٹھیک نہیں تھے۔ پچھلے مہینے دہشت گردوں نے دو مزاروں پر حملہ کیا تھا۔ تایا مرحوم کا مزار بہت مشہور تھا اور اس وجہ سے ان کا ہدف بننے کے قابل تھا۔ اوپر سے میں نے شہر میں جا بجا اشتہار لگوا کر تایا مرحوم کی برسی کی طرف دہشت گردوں کی توجہ ضرور کھینچی تھی۔ لہٰذا انھوں نے مجھے برسی منسوخ کرنے کا دوستانہ مشورہ دیا۔ میں نے اس بزدل وردی پوش کے مشورے کو ٹھکرا دیا۔ میں ڈرتا نہیں تھا۔ خدا پر مجھے پورا بھروسا تھا۔ یہ برسی منانا میرا اخلاقی فرض تھا اور میں ہر صورت میں اپنا فرض نبھانے جا رہا تھا، چاہے اگلے سال اسی تاریخ پر میری پہلی برسی کیوں نہ منائی جائے۔ وردی پوش میری باتوں سے زچ گیا۔ اس نے فوراً اجازت لی، لیکن اپنی بکتر بند گاڑی میں غائب ہونے سے پہلے اس نے ایک تہدید آمیز لہجے میں بتایا کہ اس صورت میں پولیس کوئی سکیورٹی مہیا نہیں کرے گی۔ میں نے

اس کو تسلی دی کہ سکیورٹی لینے کا میرا شروع سے کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔

پھر برسی کا دن آیا۔ میں سویرے اٹھا اور اپنا اپنا باجا لے کر تایا مرحوم کے مزار کے صحن میں بیٹھ گیا۔ وہاں دو ملنگ سو رہے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور ایک لمبی دعا کی۔ پھر میں نے آنکھیں کھولیں اور کلام چھیڑا:

''الف اللہ چنبے دی بوٹی، میرے من وچ مرشد لائی ہُو!''

میں نے جوں ہی گانا شروع کیا، ملنگ نیند سے جاگ گئے۔ انھوں نے اپنے چلم جلائے۔ فضا چرس کی خوشبو سے معطر ہو گئی اور میں اس خوشبو سے ولولہ پا کر مسلسل گاتا رہا۔ میں نے اس موقع کے لیے کلام باہو کے سارے بیت یاد کیے تھے؛ دو سو چھ۔

بارہ بج گئے تھے۔ ملنگوں کی آنکھیں بالکل سرخ تھیں اور میری بھی لال ہونے لگی تھیں۔ میں آخری بیت گا رہا تھا:

''یار یگانہ ملسی تینوں، سر دی بازی لائی ہُو!''

میری لال آنکھوں میں اچانک اندھیرا آیا۔ ایک موٹا سایہ صحن سے جلدی جلدی گزر رہا تھا اور تایا مرحوم کی قبر میں گھس رہا تھا۔ میں حیران تھا، پر میں نے اپنی حیرانی کو اپنی آواز پر اثر انداز نہیں ہونے دیا اور ''عشق اللہ وچ ہو مستانہ، ہُو ہُو صدا علائی ہُو'' گاتا رہا۔ اب مجھے دوبارہ حیرت ہوئی۔ سایے کے گزرنے کے فوراً بعد ایک پوری اور پکی آواز میرے گلے سے نکلنے لگی تھی۔ میں اب ''نال تصور اسم اللہ دے، دم نوں قید لگائی ہُو'' گا رہا تھا۔ میری آواز پورے زور کے ساتھ گونج رہی تھی۔ وہ نہ صرف برآمد ہوئی تھی بلکہ پہلے سے زیادہ زوردار تھی۔ میں نے ''ذاتی نال جا ذاتی رلیا، باہُو نام سدائی ہُو'' گایا اور دیکھا کہ میری آواز پہلے سے زیادہ گہریلی اور سریلی تھی۔ وہ اب ایک مکمل آواز تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میں اٹھ کر تایا مرحوم کی قبر سے لپٹ گیا اور میں نے ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اپنی برآمد شدہ آواز میں دوبارہ سارا کلام باہُو سنایا۔

میری آواز کی بازیافت معجزہ تھی لیکن اس معجزے کے ساتھ ایک اور معجزہ پیش آیا تھا۔ حالاں کہ تایا مرحوم کا مزار دہشت گردوں کی نگاہ میں تھا اور مزار میں کسی قسم کی سکیورٹی نہیں تھی، تاہم برسی خیر سے گزری تھی۔ حملہ اور دھماکہ تو دور، برسی کے دوران ایک مکھی بھی نہیں مری تھی، ایک پتا بھی نہیں گرا تھا۔ خدا کو اب میری نیک نیتی پر شک نہیں ہو رہا تھا اور اس نے مجھے دوبارہ اپنا کامل تحفظ عطا کر دیا تھا۔

ان دونوں معجزوں کے بعد ایک تیسرا معجزہ ظہور پذیر ہوا۔ مدت مدید کے بعد فلم پور سے ایک بلاوا آیا۔ اس بار ایک بینکار نے کال کیا جس نے بتایا کہ وہ تایا مرحوم کی آواز پر عاشق ہے اور اس نے ان کی دوسری برسی منانے کے لیے فلم پور میں ایک شو رکھا تھا جس میں فلم پور کے سارے گویے تایا مرحوم کو خراج تحسین پیش کرنے جا رہے تھے۔ وہ مجھے اس شو میں تایا مرحوم کی کوئی قوالی گانے کی دعوت دے رہا تھا۔ یہ بینکار حیرت انگیز حد تک نیک تھا۔ اس نے میری بدنامی کو بالکل نظر انداز کیا تھا اور مجھے اپنے خرچے اور اپنی

ذمہ داری پر اسی شہر میں لانے کی ٹھان لی تھی جس کے چوراہوں پر میرے اشتہار، سی ڈیز، پوسٹر اور پتلے جلائے گئے تھے۔ میں نے اس خیال سے یہ دعوت قبول کی کہ اس طریقے سے میں ایک تیر سے دو شکار کروں گا۔ میں نہ صرف تایا مرحوم کو خراج تحسین پیش کروں گا بلکہ جنتا کو اپنی نئی آواز سے متعارف بھی کراؤں گا اور ان زہریلے حاسدوں سے بدلہ لوں گا جنھوں نے مجھے ایک سازش کے تحت فلم پور سے نکالا تھا، کیوں کہ میں یقیناً شو لوٹنے جا رہا تھا۔

میں بینکار کی دعوت پر فلم پور آیا تھا اور سواگت ہوٹل کے اسی سوٹ نمبر ۲۱۲ میں رک گیا جس کی ایک مہربان الماری نے مجھے دہشت گردوں کی نظروں اور گولیوں سے تا حال محفوظ رکھا۔

میں چونک رہا ہوں۔ مجھے اچانک کئی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ میرے سوٹ کا دروازہ کھولا جا رہا ہے اور دو نوعمر دہشت گرد آپس میں بات کرتے ہوئے اندر آ رہے ہیں: ''تیرے کول کنے کارتوس نیں؟''

''بتھیرے نیں، تینوں کارتوساں دی لوڑ وا؟''

''آہو!''

میں ہکا بکا رہ جاتا ہوں۔ یہ دونوں لڑکے نہ صرف میری بولی بول رہے ہیں بلکہ اختر آباد کے مخصوص لہجے میں بول رہے ہیں۔ دونوں میرے ہم وطن ہونے کے علاوہ میرے گرائیں بھی ہیں۔ مجھے فوراً ہی ایک منصوبہ سوجھ رہا ہے... میں الماری سے نکلوں گا اور ان کے سامنے اپنے لہجے میں دو تین جملے بولوں گا۔ لڑکے یقیناً مجھے اختر آباد کا آدمی مانیں گے اور میری جان بخش دیں گے، لیکن ملنے سے پہلے ہی مجھے ان کے کچھ تبصرے سننے کو مل رہے ہیں۔

''اوئے کسی حرام دے نے اتھے چرس پیتی وا'' پہلا لڑکا کہہ رہا ہے۔

''تے شراب وی پیتی وا۔'' دوسرا لڑکا بتا رہا ہے۔

''تے اتھے کسی کنجر دا واجا وی پیا وا۔'' پہلا لڑکا کلام کا سلسلہ بڑھا رہا ہے۔

''بہن چود بڑی مستی کیتی وا۔'' دوسرا لڑکا پُر جوش انداز میں اپنے ردعمل کا اظہار کر رہا ہے۔

میں اپنا منصوبہ فوراً ترک کر رہا ہوں۔ یہ اختر آبادی لڑکے بڑے کٹر ہیں۔ وہ مجھے کافر قرار دے گئے ہیں۔ میں اگر ان کے ہتھے چڑھا تو وہ مجھے باقی لوگوں کی طرح گولیوں سے اڑا دیں گے۔ اتنے میں ایک تیسرا دہشت گرد سوٹ میں داخل ہوا ہے اور اب وہ لڑکوں کو مخاطب کر رہا ہے: ''یہاں ایک خنزیر رہتا ہے۔ خوبیر، معاویہ! یہ سارا توڑ دو۔''

وہ ان کا امیر معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا لہجہ پٹھانوں والا تھا۔ فوراً بیٹھک سے شور آنے لگتا ہے۔ چیزوں کے گرنے کا شور، ٹوٹنے کا شور، فرش پر بکھرنے کا شور۔ خوبیر اور معاویہ سوٹ کی بیٹھک کو حرام چیزوں سے پاک کرنے لگے ہیں۔ وہ شراب کی بوتلیں، گلاس، برف کا ڈبا اور ایش ٹرے کو زمین پر پٹخ رہے ہیں اور

اب ایک بڑی سی آواز آرہی ہے۔ان خبیثوں نے میرا باجا زمین پر پٹخ دیا، یہ باجا پہلے میرے ابو کے پاس ہوا کرتا تھا۔ یہ ان کی آخری یادگار ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں خوب روؤں اور چیخوں لیکن میرے دل میں زندہ رہنے کا ارمان ہے، سو میں اپنا منھ بند رکھتا ہوں۔ پٹھان کی آواز اونچی ہو رہی ہے؛''شاباش، شاباش خوبیر۔'' خاموش آنسوؤں کے دو دھارے میری آنکھوں سے بہہ رہے ہیں۔ پٹھان کہہ رہا ہے؛''چلو، اب تم دونوں کمرے کی تلاشی لو۔''

اب خوبیر اور معاویہ میری الماری کی طرف آ رہے ہیں۔ان کے بوجھل قدم مجھے سنائی دے رہے ہیں اور خیالات بجلی کی رفتار سے میرے ذہن سے گذر رہے ہیں۔ میں اس وقت اپنی زندگی کے آخری لمحے جی رہا ہوں۔ خدا مجھ سے دوبارہ ناراض ہوگیا ہے۔ وہ ابھی تک مجھے تایا کی موت کے لیے معاف نہیں کرسکا اور اس نے مجھے سزا دینے کے لیے میرے آبائی قصبے سے دو قاتل بھیجے۔لیکن اچانک باہر سے ایک زبردست شور آ رہا ہے، خوبیر اور معایہ جلدی جلدی بیٹھک کی طرف واپس جا رہے ہیں۔ان کے جانے سے میری جان بچ گئی۔ میں راحت کی سانس لے رہا ہوں۔ دراصل ایک ہیلی کاپٹر ہوٹل کے اردگرد چکر کاٹنے لگا ہے اور اس کی آواز چاروں طرف گونج رہی ہے۔ ہیلی کاپٹر کے علاوہ کچھ سائرن اور لاؤڈ اسپیکر سنائی دے رہے ہیں۔ سرکار کے محافظ حرکت میں آگئے اور ہوٹل کا محاصرہ کرنے لگے ہیں، وہ جلد یا بدیر ہلہ بولیں گے۔

خوبیر، معاویہ اور پٹھان نے کھڑکیوں کے شیشے توڑے اور پوزیشن سنبھال لی۔ان کی باتوں سے مجھے پتہ چل رہا ہے کہ نقاب پوش کمانڈو سامنے کی عمارت کی چھت پر کھڑے ہوگئے ہیں۔ دہشت گردان پر گولیوں کی بوچھار کر رہے ہیں۔ کمانڈو باری باری ان کی گولیاں کھا کر چھت سے گر رہے ہیں، دہشت گردان کو گن رہے ہیں۔ اب تک بارہ کمانڈوز مر چکے ہیں (یا ان کی زبان میں جہنم واصل ہو چکے ہیں)۔ دہشت گردوں نے بیٹھک کا ٹی وی چالو کیا ہے۔ ٹی وی پر مقامی چینلز کی لائیو کوریج ان کے لیے بہت مفید ہے۔اس کے ذریعے انھیں سرکاری محافظوں کے دستوں کا محل وقوع معلوم ہو رہا ہے اور وہ ان معلومات کی بدولت بہت کامیاب طریقے سے لڑ رہے ہیں۔ انھوں نے دشمنوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ پٹھان کو وقفے وقفے سے اس کے فون پر کال آ رہے ہیں اور وہ کال کرنے کو جوان سب کا امیر اعلیٰ معلوم ہو رہا ہے، کارروائی کی پیش رفت سے آگاہ کر رہا ہے اور اس سے حکم بھی لے رہا ہے؛''جی جناب، اب کمانڈو آگئے، جی جناب...اور ایک ہیلی کاپٹر جناب...ارسلان اور صغیر مغربی حصے کا دفاع کر رہے ہیں۔ وہ ایک پولیس کی گاڑی کو اڑا چکے ہیں۔ ہم اب تک ان کے بارہ کمانڈو جہنم واصل کر چکے ہیں....جی جناب....بہتر جناب....جی جناب...تابعدار۔'' پھر وہ اسی فون سے ارسلان اور صغیر کو امیر اعلیٰ کے احکام سنا رہا ہے؛''اچھا بات سنو! تم دونوں اب گیس پھینکو۔ کافر زیادہ قریب آگئے ہیں۔ اب وہ تھوڑی دیر رک جائیں گے۔ گرینیڈ آگے کے لیے بچا لو۔'' کالوں اور احکام کا یہ سلسلہ اس طرح بہت دیر تک جاری رہتا ہے۔ کتنی دیر، کچھ پتہ نہیں۔ جب سے دہشت گردوں کا حملہ شروع ہوا ہے، لمحے بےکراں وسعت اختیار کر چکے ہیں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ میں دو دنوں سے اس الماری میں روپوش ہوں، جب کہ مجھے زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے ہوئے ہیں۔ اور سچ بتاؤں؟ میں اس ساری صورت

حال سے تنگ آچکا ہوں۔ میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ یہ عذاب جلد از جلد ختم ہو جائے (جس سے میں اس وقت گزر رہا ہوں)۔ کسی بھی طرح ختم ہو جائے۔ مرنا اب مجھے پوری طرح منظور ہے، کیوں کہ میری روح سکون میں ہے۔ اپنی زندگی کے سفر کا جائزہ لینے کے بعد میں اپنے رقیبانہ ماضی کے ساتھ دوستی کر لی۔

''جی جناب!'' پٹھان کو ایک نیا کال آ رہا ہے۔ امیر اعلیٰ اس کو ایک مختصر سا حکم دے رہا ہے۔ پٹھان کہہ رہا ہے،''جی جناب، ہم سب تیار ہیں۔ فی امان اللہ....اللہ اکبر۔'' وہ فوراً ارسلان اور صغیر کو فون پر کہہ رہا ہے،''بات سنو! کافر ہلہ بولنے والے ہیں...سو تم لوگ انھیں چالیس سیکنڈ کی مہلت دو اور اپنے بیلٹ استعمال کرو۔ ہم بھی انھیں استعمال کرنے جا رہے ہیں۔ فی امان اللہ۔'' بیلٹ؟ تو ان لوگوں کے پاس بھی دھماکہ خیز پٹیاں ہیں؟ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا ہے، لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنی حیرت سے نکلوں، ایک زوردار دھماکے کی آواز نیچے سے آ رہی ہے اور ایک زلزلے کے جھٹکے محسوس ہو رہے ہیں۔ اتنے میں خوبیر، معایہ اور پٹھان ایک دوسرے کو الوداع کہہ چکے ہیں۔ اب وہ نعرۂ تکبیر لگا رہے ہیں۔ اچانک ایک ہیبت ناک آواز سنائی دے رہی ہے اور کنکریٹ کا ایک عفریت میری الماری کو اپنے پاؤں تلے کچل رہا ہے۔

صرف میری روح اس کے ظالم پاؤں کے نیچے سے نکلنے میں کامیاب ہوگی۔

صحیح انگلی کرنے والے دو لوگ ہیں

ژولیاں

جنسیت سے ڈر رہے ہیں اردو والے بہت سالوں سے۔ فیض کو پڑھو، راشد کو پڑھو، عورت کدھر ہے؟ عورت تو ہے لیکن اس کو سنگ مرمر میں ڈھانپا ہوا ہے۔ ایک ہی شاعر نے جنسیت کے بارے میں لکھا، اور وہ ہے میرا جی۔ اس نے اعلان بھی کیا کہ میں جنسیت کے بارے میں ہی لکھتا ہوں۔ تو وہ ڈر گئے سارے، اور انھوں نے اسے بھی اسی کھاتے میں شامل کر لیا کہ یہ تو ذہنی مریض ہے، بلکہ جنسی مریض ہے۔ صحیح انگلی کرنے والے دو لوگ ہیں جو اس زمانے میں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے اور ناپسند بھی؛ منٹو اور میرا جی۔ منٹو نثر میں اور میرا جی شاعری میں....

جنسیات کی نفی پر ادب کی ساری عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ یہاں آپ تضاد کو استعمال نہیں کر سکتے۔ دیکھیں، جب لوگوں نے کہا کہ کمیونزم تو ختم ہو گیا، لیکن تب کمیونزم اتنا اہم نہیں تھا جتنا کمیونزم کا بھوت، جو منڈلاتا رہے گا۔ اس کا نہ ہونا اب ہمارے لیے اس کے ہونے سے زیادہ اہم ہوگا۔ ایک نظریاتی خلا جو پیدا ہوا ہے، سیاسی خلا ایک طرح کا۔ بالکل ایسی ہی، جنسیت کو آپ نے نکال دیا۔ لیکن جنسیت کا نہ ہونا آپ کو بہت تنگ کرتا ہے اور آپ احساس کرتے رہتے ہیں کہ جنسیت نہیں ہے۔ اسی وجہ سے آپ حظ انگیزی (Titillation) کی طرف آ جاتے ہیں، وہ بھی جنسیت کی ہی نفی ہے۔

محمد انور خالد کی نظمیں

میں تصنیف حیدر کا زندگی بھر ممنون رہوں گا، اگر انھوں نے کچھ دنوں پہلے محمد انور خالد کی نظموں سے مجھے متعارف نہ کرایا ہوتا تو شاید اس غیر معمولی مسرت سے محروم رہتا جو ان نظموں اور ان جیسی پچاسوں نظمیں پڑھ کر حاصل ہوئیں۔ میں اس مسرت کو اپنے قارئین سے شیئر کرنے کا خواہش مند ہوں چونکہ مجھے اس بات کا پختہ یقین ہے کہ میری طرح ہندوستان کے کئی قارئین اس باکمال شاعر کے کمال سے ناواقف ہوں گے، جس کی ایک بڑی وجہ سرحد ہے۔

محمد انور خالد کو زندگی مختصر ملی، لیکن ان کی شاندار نظمیں اردو ادب میں انھیں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ یہ نظمیں ان کے مجموعہ ''ریت کا آئینہ'' سے انتخاب کی گئی ہیں۔ یہ مجموعہ پہلی بار 'آج کی کتابیں'، کراچی کے زیر اہتمام ۱۹۹۳۔۹۴ میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں اس کی دوسری اشاعت اسی اشاعتی ادارے سے ۲۰۱۵ میں کچھ اضافے کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ محمد انور خالد کی نظمیں خود اپنا بہترین تعارف ہیں۔ مستقبل میں ان کی مزید نظمیں شامل اشاعت ہوتی رہیں گی۔ ان نظموں پر قارئین کے ردعمل کا انتظار رہے گا۔ (مدیر)

ابن زیاد کا فرمان

تمھاری ہڈیاں مڑتی نہیں ہیں
رحم مادر سے نکلنے کے لیے بیتاب ہو
سوتے رہو، یہ گھر گرہستی کا زمانہ ہے
مویشی اصطبل میں جائیں گے اور
اونٹ خیمے میں
فرس ابن زیادہ کے لیے عضو زیادہ ہے
سواری واسطے مشکی ہرن زنجیر کرتے ہیں
زمین شور سے شوریدہ سر،
عفریت سے بونے
سمندر سے گلابی مچھلیاں
مٹی سے سورج مکھ کا جنگل
چار دیواری سے اٹھ کر دیکھتا ہے
آنگنوں میں ہل نہیں چلتے
ابوسفیان سے میں نے سنا تھا

ابوسفیان سے میں نے سنا تھا
آنگنوں کا حال، خیموں کی خبر، گھوڑوں
کے جل جانے کا قصہ
جب بدک کر بھاگ اٹھے تھے مویشی،
اونٹ، سورج مکھ سپہ زادے،
ابوسفیان کے بیٹے
ابوسفیان سے میں نے سنا تھا

ابوسفیان سے میں نے سنا ہے
آنگنوں کی خیر لکھی ہے زیادا ابن زیادہ نے

نئی بیلیں چڑھائی ہیں پرانی کرسیوں پر
میز پر خرگوش پالا ہے
گھڑوں میں ناریل کی کاشت کی ہے
بیچ انگنائی میں لکھا ہے
تمھاری ہڈیاں مڑتی نہیں ہیں
رحم مادر سے نکلنے کے لیے بیتاب ہو
یہ گھر گرہستی کا زمانہ ہے
مویشی اصطبل میں جائیں گے
اور اونٹ خیمے میں

تری ماں تجھ کو روئے ابن مقفع

تری ماں تجھ کو روئے ابن مقفع
چاند پچھلی رات کا پورا نہیں تھا
پہ تم پیغمبری کے زعم میں اندھے کنویں سے
چاند کا ست کھینچتے تھے اور بہت خوش تھے
اگر دو ڈول پانی کا نکل آتا تو اس میں
کیا برائی تھی

ہم اس تہذیب کے مارے ہوئے ہیں
جس میں ہر شے اپنی غایت سے الگ ہے
شاعری جادوگری ہے
کچھ نہیں کہنا
ہوا کی اوڑھنی میں نور و نکہت کے ستارے
ٹانکنے ہیں
گفتگو بازار کی شے ہے
کتابوں میں جو ہے، ہے
لڑکیوں نے خط نوری میں مجھے لکھا
کہ گھر آتے ہوئے جو لوگ
جنگل رک گئے تھے
کھمبیاں اُگ آئی ہیں ان کے بدن پر
ایسا ناہموار مصرع لڑکیوں نے
خط نوری میں لکھا مجھ کو
تری ماں تجھ کو روئے
شہر جنگل ہو گئے ہیں
دھوپ میں آزار ہے
بارش جلاتی ہے

سمندر پوچھنے آتا ہے، کئے گھر رہ گئے ہیں
آسمانی گھنٹیوں کے شور میں کیسا لگے گا
شور گریہ
گرد ساحل ریت کے طوفان میں کیسا لگے گا
لڑکیاں کیسی لگیں گی آئنوں کے سامنے
ہنسی ہنساتی
قصر عالیشاں، منقش بام و در،
نقشین چوبی کھڑکیاں
گہرے سمندر کی طرف کھلتی ہوئی
اور شہر دریا بُرد ہونے جا رہا ہے
ابن مقفع تجھ کو روئیں
تیرے سارے ڈھور ڈنگر،
بال بچے، بیویاں، لڑکے، کنیزیں
ایک جیتی جاگتی تہذیب
جس میں ہر شے اپنی غایت سے الگ ہے
گفتگو بازار کی شے ہے
کتابوں میں جو ہے، ہے
تری ماں تجھ کو روئے ابن مقفع

زینت محل یہ وقت ملاقات کا نہیں

زینت محل یہ وقت ملاقات کا نہیں
شہزادے قتل ہو گئے، شہزادیاں گئیں
جاٹوں نے ٹاٹ ڈال کے ان کو دکھائی آگ
اب جو نہیں ہے قصہ کہانی میں آئے گا
زینت محل چراغ میں بتی پڑی نہیں
اور سو گیا ہے گھر
اب جو اٹھے گا بھوک سے کیا زہر کھائے گا
دروازہ توڑ گھر میں گھس آئے ہیں مرد و زن
اب کون تیرے سننے سنانے میں آئے گا
زینت محل یہ رات اندھیرے میں جائے گی
'ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے
شہزادہ ذی وقار تو جنگل کو جائے تھا
شہزادی پائیں باغ کے جھولے میں مر گئی
زینت محل چلو کہ چراغی کے واسطے
ہم سرزمین بلخ و بخارا اٹھا کے لائیں
اک خال سبز ہے رخ گلنار پر غضب
اک طوف کوئے مرگ و ملامت ہے
جاں کے ساتھ
اک اسپ ہے سوار سے آگے بڑھا ہوا
زینت محل تمام خرابی ہے دل کے ساتھ
دل گرد باد سیل قیامت، بلائے زرد
اک اسپ ہے سوار سے آگے بڑھا ہوا
اک تیرہ شب ہے اور گھنے جنگلوں کی ہے

زینت محل یہ رات یہ درماندگی کی رات
زینت محل یہ رات ملاقات کی نہیں
یہ وقت ہے شکستن گل ہائے ناز کا
'یہ وقت قیدیوں کی رہائی کا وقت ہے'
'گلشن میں بند و بست برنگ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج'

ابومسلم خراسانی کے لیے ایک نظم

ابومسلم خراسانی
اب آدھی رات ہے، گھر جا کے دیکھیں
کس کا آنا رہ گیا ہے
سودھما کے دس نمازی ایک مسجد
ریاضی کی مساواتیں یہ مجھ سے
حل نہیں ہوں گی
ابومسلم خراسانی
ابومسلم ہماری آنکھ کی شہتیر سے
وہ گھاس کا تنکا بھی بھاری تھا
جو آسودہ ہوا شبنم سے
جب اس کی طراوت
گھاس سے نیچے نہیں پہنچی
تہہ خاک اس قدر آسودۂ افلاک
ابومسلم خراسانی
ابومسلم خراسانی چراغ گل رخاں لاؤ
بیاض دلبراں لاؤ
یہ کیا بسیار گوئی
سودھما کے دس نمازی ایک مسجد بیس لاشیں
ریاضی کی مساواتیں، ابوموسیٰ سے پوچھو،
کیسے حل ہوں گی
کہ ہم کُل آٹھ تھے
دو گھر گئے
دو راہ میں ہیں
دو کا آنا رہ گیا ہے
دو کسی کروٹ نہیں سوتے
طراوت گھاس کی جاتی نہیں
محراب سے چھت تک
ابومسلم یہ ہم دو اور ہیں جن کو
مساواتیں بنانی ہیں
سو اس کو یوں بناتے ہیں
ابومسلم خراسانی برابر مَیں
ابومسلم خراسانی برابر مَیں ابومسلم خراسانی
برابر مَیں
کہ آخر میں عدد بس ایک رہ جاتا ہے
ابجد کے طریقے سے

حاشیہ نشینوں کا کرب

شمس الرحمٰن فاروقی
انگریزی سے ترجمہ: عاصم بخشی

پرچہ مرتب ہو چکا تھا، پروف ریڈنگ ہو چکی تھی، پرنٹ فائل بھی تقریباً تیار ہو چکی تھی کہ اچانک میری نظر روزنامہ 'انڈین ایکسپریس' میں شائع شمس الرحمٰن فاروقی کے ایک تازہ مضمون پہ پڑی۔ ترجمہ کرانے کے لیے وقت کم تھا، بہرحال عاصم بخشی صاحب نے بیڑہ اٹھایا اور اپنی مصروفیت کے باوجود صرف دو روز میں اس مضمون کا ترجمہ کر کے میرے حوالے کر دیا۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مضمون کی حساسیت اور سنگینی کو دیکھتے ہوئے تصنیف حیدر اور راقم الحروف کے جواب بھی بالترتیب اس مضمون کے ساتھ شائع کیے جا رہے ہیں۔ مجھے اس پوری بحث پر ارباب قلم و بصیرت کی بے لاگ رائے کا انتظار رہے گا کہ اس بارے میں آپ کا کیا نقطۂ نظر ہے؟ آئندہ شمارے کے صفحات آپ کے لیے حاضر ہیں۔ (مدیر)

Our gayness and our gift are all besmirched / With rainy marching in the painful field.

- Shakespeare, Henry the Fifth

ہرش مندر ٹھیک کہتے ہیں: اس ملک میں مسلمانوں کو حاشیے کی جانب دھکیلا جا رہا ہے۔ میں اتنا اضافہ کروں گا کہ گو اس قدر زہریلی شدت سے تو نہیں لیکن تقسیم کے فوراً بعد ہی منصوبہ بند طریقے سے مسلمانوں کو بتدریج حاشیے پر دھکیلنے کا یہ سلسلہ جاری ہو چکا تھا۔ ابوالکلام آزاد نے کئی وجوہات کی بنا پر تقسیم کی مخالفت کی، جن میں سے ایک یہ تھی کہ غالب ہندو اکثریت پر مشتمل بھارت غیر ہندوؤں کے لیے اکثریت پسندانہ اور مستبدانہ ہوگا۔ اپوروانند بھی درست کہتے ہیں کہ ہر کوئی چاہتا ہے کہ مسلمان لبرل ہو، یعنی مسلمان سے

زیادہ ہندو ہو۔ آزاد کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہو رہی ہے۔

رام چندر گوہا نے دریافت کیا ہے کہ برقعہ بھی ترشول کی طرح ایک ہتھیار ہے۔ اب راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے سرسنگھ چالک کا وہ دعویٰ یاد کیجیے کہ ان کی تنظیم تین دن کے اندر کمانڈر اِن چیف کی کمک میں ایک تربیت یافتہ فوج اتار سکتی ہے۔ کیا کسی کو یہ مفروضہ قائم کر لینا چاہیے کہ اس فوج میں مسلمانوں کی اوسط شرح وہی ہوگی جو ہندوستان میں ان کی اوسط شرح ہے؟ مزید برآں کوئی دوسرا یہ مفروضہ قائم کر سکتا ہے کہ اس فوج میں ہندو تو ترشولوں کے ساتھ اور مسلمان، یعنی یقیناً عورتیں، ہتھیار کے طور پر برقعہ استعمال کریں گی؟ اگر صورتِ حال یہی ہے تو کیا مزید یہ بھی فرض کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان مردوں کو ملک کے خلاف دہشت گرد حملوں کے پیچھے ہدفی تختہ بنا کر چھوڑ دیا جائے گا؟ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ ہمارے وزیرِ اعظم ''دہشت گردی'' کو ہندوستان کا گھمبیر ترین مسئلہ شمار کرتے کبھی نہیں تھکتے۔ بے شک آئی آئی ٹی (IIT) یا آئی آئی ایم (IIM) کے تربیت یافتہ ہندو پکوڑا فروش یا پھر ان پڑھ دہاڑی دار ہندو مزدور کے پاس کہاں وقت ہے کہ دہشت گردی کے منصوبے بنائے جائیں۔

ذاتی طور پر میں برقعہ، حجاب، سر کی ٹوپی، ریشِ بے قرینہ وغیرہ کے ہی خلاف ہوں۔ ممکن ہوا تو اس قسم کا حلیہ بنائے ہوئے شخص کو ملامت کرنے کا موقع بھی کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ لیکن میں ایک جمہوریت میں کسی بھی اقلیت کو اپنی شناخت کا بیانیہ پیش کرنے کی ہر کوشش کے حق میں ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوششیں قانون کے خلاف قرار نہ دے دی جائیں، انھیں وہی سمجھنا چاہیے جو کہ یہ ہیں، یعنی ایک فرد کو اپنا آپ اپنی پسند سے دکھانے کا حق۔ مجھے یاد ہے کہ سکھ شدت پسندی کے زمانے میں ایک اوسط سکھ کس آسانی بلکہ بے پروائی سے اپنا شناختی نشان جمائے پھرتا تھا۔ اور کیوں نہیں؟ آخر اگر وہ سکھ بننا چاہے تو یہ اس کا حق تھا۔ یہ ایک الگ قصہ ہے کہ سکھوں کو اپنا یہ حق جتانے کی کڑی سزا دی گئی۔ شاید گوہا بھی برقعے، اور یوں بالواسطہ طور پر حجاب، ٹوپی اور داڑھی کی مذمت کر کے مسلمانوں کو اسی انجام کی دھمکی دے رہے ہیں؟

ہمیں ایک قانوناً جائز سماجی فعل کے لیے ''لَو جہاد'' (Love Jihad) کی اصطلاح سن کر ذرا ٹھٹک جانا چاہیے۔ پھر مزید ٹھٹکنا بنتا ہے، جب ہائی کورٹ یہ کہہ کر ایک شادی کو ختم کر دے کہ یہ 'لَو جہاد' یا کسی شدت پسند حملے کا پیش خیمہ محسوس ہوتا ہے۔ ہمیں ذرا ٹھہر کر سوچنا چاہیے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں، جب ایک طرف ہائی کورٹ پونا میں ایک مسلمان نوجوان کے قتل کے مرکزی ملزم کو اس لیے ضمانت پر بری کر دیا جائے کہ ملزم کے پاس قاتل بن جانے کی کافی وجہ ہے، اگر مظلوم کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔

خوش قسمتی سے ہمارے ہاں ایک ایسا سپریم کورٹ ہے جو بالآخر شادی کی تنسیخ کے خلاف فیصلہ دیتا ہے اور ہائی کورٹ کے اس جج کو جھاڑ پلاتا ہے جس نے پونا قتل کیس میں ملزم کو ضمانت پر بری کیا۔ لیکن سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم بطور ایک آزاد سیکولر قوم کے ان معاملات میں بس خوش قسمتی ہی کے رحم و کرم پر ہیں؟ کیا ہمارے ہاں کی قانونی ثقافت یہ یقین دہانی نہیں کرا سکتی کہ اس قسم کے ''خوش قسمتی کے مواقع'' کبھی پیش ہی نہ آئیں؟

کئی سال پہلے میں کراچی میں تھا تو وہاں کے قلم کاروں نے میرے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کیا۔ خوش آمدیدی کلمات میں ایک بہت سینئر لکھاری نے میری تعریف میں جس چیز کا ذکر کیا، وہ ان کے بقول میری اخلاقی جرأت تھی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے مہمان نے احمد آباد میں اردو شاعر ولی گجراتی کا مقبرہ گرائے جانے پر عوامی احتجاج کیا، جب کہ اس کے برخلاف ایک اور سینئر ادیب نے کہا کہ ادیبوں کو اس قسم کے تنازعات سے دور ہی رہنا چاہیے۔ میں نے اپنے جواب میں کہا کہ میری یہ ''اخلاقی جرأت'' اس لیے ممکن ہوئی کیوں کہ ہندوستان میں ایک ایسی وسیع لبرل ہندو رائے عامہ موجود ہے جس کا وزن اور سہارا ہی ہندوستانی مسلمان کے جیتے رہنے بلکہ پھلنے پھولنے کا ضامن ہے۔

مجھے افسوس ہے لیکن میں آج یہ بات نہیں کر سکتا۔

میں کانگریس کا مداح نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آج کی صورت حال کا بڑا حصہ بلا شک و شبہ کانگریس ہی کے مرہون منت ہے۔ کانگریس ہی کی حکومت میں ایک عزت مآب کانگریسی راہنما کی سرکردگی میں بابری مسجد میں مورتی رکھے جانے (یا معجزانہ طور پر ظاہر ہونے؟) کا واقعہ پیش آیا (۱۹۴۹)۔ ضلع مجسٹریٹ نے وزیر اعلیٰ کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا کہ مسجد سے مورتی ہٹائی جائے۔ احاطے کو مقفل کر دیا گیا۔ ۱۵۲۸تا۱۵۲۹میں تعمیر ہونے والی بابری مسجد ایک 'متنازعہ عمارت' بن گئی۔ ('وِوادت ڈھانچا' کی اصطلاح تو اس سے بھی زیادہ صلابت دار اور غیر تاریخی لگتی ہے۔) ایک اور کانگریس دور (۱۹۸۶) تھا جب 'متنازعہ عمارت' کو آزادانہ مورتی پوجا کے لیے کھول دیا گیا۔ پھر ایک اور کانگریس دور (۱۹۹۲) میں بابری مسجد کو ڈھا دیا گیا۔ نتیجتاً ہونے والی قتل و غارت اور بی جے پی کی افزائش (جس کے ۱۹۸۴ کی لوک سبھا میں صرف دو رکن تھے) کے بارے میں فی الوقت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تقریباً بیس سال بعد لائیبر ہینس کمیشن (Lieberhanse Commission) نے اس وقت کے وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کو دسمبر ۱۹۹۲ کی 'کارسیوا' میں 'متنازعہ عمارت' کے ڈھا دیے جانے کے متعلق انٹیلی جنس کی واضح اطلاعات کو نظر انداز کر دینے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

جوں جوں 'متنازعہ عمارت' کو توڑنے پھوڑنے اور ڈھانے کا دن (۶ دسمبر ۱۹۹۲) رات میں ڈھل رہا تھا، میں اپنی گنگا جمنی تہذیب کے لیے مشہور لکھنؤ کے 'نوابی' شہر میں مسلمانوں کے درمیان خوف و دہشت اور غم کی لہر دوڑتی دیکھ رہا تھا۔ مجھے 'متنازعہ عمارت' کے انہدام کے کچھ دیر بعد وزیر مواصلات کے لکھنؤ کا دورہ یاد ہے۔ انھوں نے مجھ سے اس انہدام پر مسلمانوں کے احساسات کے بارے میں سوال کیا۔ میں نے کہا یہ اسی طرح ہے 'جیسے ہم نے ایک قریبی عزیز کھو دیا ہو۔' معلوم نہیں، انھوں نے وزیرِ اعظم کو یہ خبر دی یا نہیں۔ شاید نہیں۔ لیکن یہ الفاظ اگر اس عزت مآب شخص کی کھوکھلی موجودگی تک پہنچے بھی تو یقیناً اس کی بند سماعت سے ٹکرا کر ہی واپس لوٹ آئے۔

میں پٹنہ میں تھا جب ۱۹۸۹ میں بھاگل پور 'فسادات' ہوئے۔ یہ دراصل ایک قتل عام تھا، تقریباً گجرات میں ۲۰۰۲ میں ہونے والے فسادات کی آزمائشی مشق۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۱۱۰۷۴ اموات

اسے 'مرکزی دھارے' میں مل جانے کی ترغیب دے رہا ہے۔ سلیم مرزا نے ہندوستان میں رہ جانے اور 'مرکزی دھارے' کا حصہ بن جانے کا فیصلہ کر کے سب کچھ لٹا دیا۔ میں ذرا بے رخی سے سوچتا ہوں کہ وہ اپنی ہستی کے جواز اور 'مرکزی دھارے' کے ایک بے وقعت قطرے کے طور پر اپنی شناخت مضبوط کرنے کے لیے اس سے زیادہ کیا کر سکتا تھا؟

کانگریس نے مسلمانوں کو یہ یقین دلانے کے لیے کبھی کچھ زیادہ نہیں کیا کہ ہندوستان ان کا گھر ہے۔ مسلمان دور اندیش اور زیرک راہنمائی کی عدم موجودگی میں اپنی قوتیں فضول مسائل پر خرچ کرتے رہے اور مذہبی رسوم سے متعلق ضمنی سوالات پر آپس میں لڑتے رہے۔ فرقہ وارانہ سیاست دانوں (جو صرف بی جے پی ہی میں نہیں، اگر چہ بی جے پی خیمہ زیادہ مہلک اور خطرناک ہے) نے پوری کوشش کی کہ مسلمانوں سے ان کی ہندوستانی شناخت سلب کر لی جائے اور آخر کار اسے ایک ایسے طبقے سے بدل دیا جائے جو گئو رکھشا کے نام پر مشتعل بھیڑ کے ہاتھوں قتل وغارت برداشت کرتا رہے۔ امن سے زندگی گزارنے کی قیمت چکانے کے لیے یہ فرقہ بخوشی اپنے ماضی اور کارناموں کو قومی یادداشت سے روسیاہ ہوتا یا مٹتا برداشت کرتا رہے گا۔ شاید یہ بائبل کے 'لکڑہاروں اور پانی نکالنے والوں' کا سا انجام پا کر ہی خوش ہوں۔

ٹیک چند بہار نے اپنی عظیم الشان فارسی لغت 'بہار عجم' (۱۷۴۶ تا ۱۷۶۵) میں 'ہندو' کی تعریف ایک ایسے شخص کے طور پر کی ہے جو ہندوستان کا باسی (ساکنِ ہند) ہو۔ انھوں نے اضافہ کیا ہے کہ سراج الدین علی خان آرزو کے مطابق لفظ 'ہندو' کے معنی ایک ایسے طبقے کے ہیں جو ایک مخصوص مذہب کا ماننے والا ہو اور 'ہندوستانی' کے لیے درست اصطلاح 'ہندی' ہے۔ جہاں تک کچھ شعرا کی طرف سے لفظ 'ہندو' اور 'ہندوستانی' کو ہم معنی مانا گیا ہے تو اس استعمال میں لفظ 'ہندوستانی' کو 'ہندی' پر ترجیح دی گئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ 'ہندو' اور 'ہندوستانی' کا برابر ہونا اصول صرف ونحو کا وہ مظہر ہے جسے قواعد کی رُو سے 'تغلیب' کہا جاتا ہے، جس کے معنی 'غالب ہونے' یعنی 'عمومی محاورے' کے مضبوط تر اور منطقی اعتبار سے افضل رجحان کو برطرف کر دینے کے ہیں۔

خان آرزو ماہر لسانیات اور قواعد دان ہوتے ہوئے ہمارے سماجی اور لسانی ماحول میں ہونے والی اس تبدیلی کا ادراک کر سکتے تھے جو 'مذہب'، 'قوم' اور 'نسل' جیسے اجنبی تصورات کے باعث بہت سست رفتاری سے رونما ہو رہی تھی۔ 'ہندو' بمعنی ایک خاص مذہب کا پیروکار، اس مغربی غیر ملکی سے متاثر ہو کر بعد میں تشکیل پانے والی اصطلاح ہے جس کے لیے مذہب کی شناخت، مقامیت یا پیشے کی بہ نسبت زیادہ معقول تھی۔ ہندوستانی حقیقت سے اپنے تعلقات کے آغاز میں یورپیوں کے لیے مشکل تھا کہ وہ ہندوستانیوں کی زمرہ بندی اور 'تقسیم' ورانہ نظام' کے تحت مختلف سماجی افعال اور پیشوں کی مناسبت سے کرتے۔ سترہویں صدی کے اوائل میں جنوب میں تلگو بولنے والے لوگوں سے واسطہ پڑا تو انھوں نے انھیں 'جینٹو' (Gentoo) کا نام دیا۔ 'جینٹو' دراصل یہودی مذاہب کے پیروکاروں سے امتیاز کی خاطر 'جینٹائل' (Gentile) اور 'ہندو' کے درمیان ایک سمجھوتہ تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ لفظ 'ہندو' کے معنی اپنی عصری تعریفات کے مطابق ہو گئے۔ کوئی

حیرانی کی بات نہیں کہ آکسفورڈ انگریزی لغت لفظ 'ہندو' کی تعریف ایک ایسے شخص کے طور پر کرتی ہے جو ہندوستان کے ''مقامی مذہب (ہندومت) کا ماننے والا ہو... یعنی کوئی بھی جو مذہبی اعتبار سے ہندو ہو۔''

سنگھ پریوار نے 'ہندوتوا' کے بہت سے تصورات انگریزوں سے اخذ کیے ہیں۔ یہ تصورات بس اتنے ہی ہندو ہیں جتنی ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانی تھی۔ ہربنس کھیا نے کئی سال پہلے یہ بات کہی تھی، لیکن کوئی سننے کو تیار نہیں تھا۔

پچھلی سات دہائیوں سے میں نے ہندوستان کی کئی اقسام اور شکلیں دیکھی ہیں۔ مجھے ۱۹۴۲ یاد ہے جب میرے آبائی ضلع اعظم گڑھ کے لوگ آزادی کے نظریے کی ترویج میں پیش پیش اور 'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک میں فعال تھے۔ مجھے ایک میلے میں گھوڑے پر سوار بیس پچیس سال کا ایک انگریز یاد آتا ہے جس کے چہرے پر تکبر اور عدم فہم کے آثار تھے اور جسمانی ردعمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ حالانکہ وہ ہمیں سمجھتا تو نہیں لیکن ہم اور ہمارے پیروں تلے موجود زمین اسی کی ملکیت ہے۔ وہ مقامی پولیس چیف تھا جس کے قبضے میں زندگی اور موت تھی۔

مجھے ۱۹۴۵ میں جنگ عظیم کا اختتام اور 'سینے پہ گولی کھائیں گے، پاکستان بنائیں گے' کے نعرے لگاتے ہمارے نوجوان بھی یاد ہیں۔ کوئی بھی بشمول میرے۔ جس کے والد کا خاندان کانگریس کی حواری جمعیت علما اور والدہ کا خاندان مسلم لیگیوں پر مشتمل تھا، نہیں جانتا تھا کہ پاکستان کے کیا معنی ہیں اور ہمارے لیے، ہندوستان کے لیے اس کے کیا معنی ہوں گے۔ گمان ہوتا تھا کہ جناح تک کو یہ معلوم نہیں کہ وہ کس مقصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ مجھے کیبنٹ مشن کا دورہ (۱۹۴۶) اور شملہ کی ٹھنڈی ہواؤں میں اس کے گرما گرم مذاکروں کی ناکامی بھی یاد ہے۔ کسی نے جناح پر الزام دھرا اور کسی نے نہرو پر۔ کچھ کو معلوم ہی نہ تھا کہ کس پر الزام دھریں۔ ابوالکلام آزاد، شاید مہاتما (گاندھی) اور چند کانگریسی مسلم راہنماؤں کے علاوہ کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ پاکستان کی تخلیق ہندوستانی مسلمانوں کے لیے کس قسم کی بیچارگی، ذلت ورسوائی اور حاشیہ نشینی لائے گی۔

جب تقسیم نے ہندوستانیوں کے قلب میں تیز دھار خنجر ترازو کیا تو آج ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں میں سے تقریباً کوئی بھی پیدا نہ ہوا تھا۔ کئی نوزائیدہ بچے تھے۔ اس وقت موجود لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد آج زندہ نہیں۔ تو پھر اکثریت پسندوں کی نظر میں آج کے ہندوستانی مسلمانوں میں سے کون تقسیم کا ذمہ دار ہے؟ کیا وہ، جو کبھی کبھار پاکستان کے حق میں نعرہ لگا دیتے ہیں جب پاکستان ہندوستان کے خلاف کوئی کرکٹ میچ جیت جاتا ہے؟ کیا وہ غدار یا عصری رموز کلام کی رُو سے وطن دشمن ہیں؟ اگر ایسا ہی ہے تو انھیں کس نے ایسا بنایا؟ اور کیا یہ وہ تھے جنھوں نے پاکستان بنایا؟ ان میں سے زیادہ تر کا تو پاکستان میں کوئی دور کا رشتہ دار بھی نہیں۔ کیا ہندوتوا بریگیڈ کو ذرا ٹھہر کر یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اس نیم ان پڑھ آدمی کی نظر میں پاکستان اتنا محبوب کیسے ہو گیا جو شاید پاکستان کے صدر یا وزیراعظم کا نام بھی نہیں جانتا؟ پاکستان کی منزل اس کی نگاہوں میں کیوں کر اتنی پرکشش ہو گئی؟ کیا واقعہ یہ نہیں کہ وہ بے روزگار یا کسی کم روزگار سے وابستہ ہونے

ہوئیں جن میں سے اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ ۱۱۰۰۰ سے زیادہ گھر تباہ ہوئے جن میں غالب تعداد مسلمانوں کے مکانات کی تھی۔ ۶۵ سے زیادہ مساجد اور ۲۰ مسلمان مزارات تباہ ہوئے۔ پولیس چیف کا لائق مواخذہ کردار اس حد تک واضح تھا کہ راجیو گاندھی نے اپنے دورے کے دوران اس کا فوری تبادلہ کر دیا۔ مجھے اب بھی اپنی شدید جھنجھلاہٹ یاد ہے جب انھوں نے وی ایچ پی اور ان کے اتحادیوں کے دباؤ تلے ہتھیار ڈال دیے اور اگلے ہی دن تبادلے کے احکامات واپس ہو گئے۔ رسمی انکوائری کمیشن نے پولیس چیف کو ملزم ٹھہرایا لیکن اس کی بدکاریوں کی ستر پوشی بعد میں اسی عدالت سے 'بری الذمہ' کے فیصلے کے ذریعے کر دی گئی۔ پولیس چیف مختلف ادوار میں ترقیاں پاتا رہا اور آج ریاستِ بہار کا ڈائریکٹر جنرل پولیس ہے۔

اگر کانگریس نے ان جرائم اور مسلمانوں اور نچلی ذات کے ہندوؤں کے خلاف ہونے والے ان جیسے لاتعداد مزید جرائم کا ارتکاب نہیں بھی کیا ہے، پھر بھی وہ یقیناً ان میں بلاواسطہ یا بالواسطہ بے دھڑک شریک رہی ہے۔ اگر ختم نہیں تو اردو کو کم از کم دبا دینے کی منظّم کوششیں، 'ہندی۔ ہندو۔ ہندوستانی' کے نعرے کا بغیر لب ہلائے اثبات، مسلمانوں سے بیگانگی اور انھیں معطون ٹھہرانے کا عمل؛ فہرست بہت لمبی ہے۔ کانگریس شاید بھول گئی ہو لیکن دنیا کو یاد ہے۔

پھر بھی میں آج کانگریس ہی کو ووٹ دوں گا، کیوں کہ اگر اور کچھ نہیں تو وہ کم از کم سماج میں تکثیریت پسندی اور رواداری کا زبانی جمع خرچ تو کرتی ہے اور کھلے عام بی جے پی اور سنگھ پریوار کو فرقہ وارانہ اور ہندووانہ برتری کا نظریہ رکھنے والی جماعتیں گردانتی ہے۔

بدقسمتی سے ہندو برتری کا نظریاتی زہر ہماری سیاسی زندگی میں اس وسعت اور گہرائی تک سرایت کر چکا ہے کہ سونیا گاندھی بی جے پی کو اس بات پر موردالزام ٹھہراتی ہیں کہ اس نے کانگریس کا چہرہ 'مسلم دوستی' کے الزام سے داغ دار کر دیا ہے۔ وہ اس الزام کو رفع دفع کرنے میں یوں جلد بازی کرتی ہیں جیسے مسلم دوست ہونا ہی وہ بدترین الزام ہے جو ایک دشمن کانگریس پر لگا سکتا ہے۔ سونیا گاندھی کو بس اتنا ہی کہنا تھا کہ کانگریس صرف مسلمان دوست نہیں بلکہ ہندوستان دوست ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں امید کا دامن تھامے ہوئے ہوں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ راہل گاندھی نے اس ہلاکت آفریں جھکاؤ کو درست کرنے کی کوشش کی ہے جو بظاہر ان کی والدہ اپنی جماعت کے لیے پسند کرتی ہیں۔ ممکن ہے کہ راہل گاندھی محض تکثیریت پسندی اور لبرل ازم کے مزار پر ایک رسمی سجدۂ تعظیمی ہی کر رہے ہوں، لیکن کم از کم وہ صرف ہندوؤں کی نہیں بلکہ ہندوستان کی بات کرتے ہیں۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو میں اعظم گڑھ کے اس اسکول میں کلاس نہم کا طالب علم تھا جس کا نام اس وقت ویسلے ہائی اسکول تھا۔ اب یہ ویسلے انٹر کالج ہے۔ ۱۸۴۷ میں برطانوی آسٹریلوی مشنری جماعتوں کے ہاتھوں قیام کے بعد یہ اپنی وضع قطع میں ایک مشنری ادارہ تھا۔ ہم کیا، پورے شہر ہی نے آزادی کا جشن مسرت پورے ذوق وشوق سے منایا۔ جب ہمارے اسکول کے آسٹریلوی منتظم نے قومی پرچم کو دیکھ کر اپنا ہیٹ اتارا تو میرے والد نے فخر سے مسکراتے ہوئے کہا کہ دیکھو یہ کیسے ہمارے پرچم کی تعظیم کر رہا ہے۔ ایک روز پہلے تک

وہ کبھی اسکول کے میدان میں پرچم گوارا نہ کرتا تھا۔

کچھ ہفتوں بعد یوپی حکومت کے ایک وزیر سری کرشنا دتہ پلیوال نے اعظم گڑھ کا دورہ کیا تو انھیں طلبا سے خطاب کے لیے مدعو کیا گیا۔ ہم سب نے ایک عالم محویت (یا تحیر آمیز سکوت؟) میں عزت مآب وزیر کو پاکستان کے خلاف، 'جناح میاں' کے خلاف، بلکہ عمومی طور پر مسلمانوں کے خلاف ہرزہ گوئی پر مبنی توہین آمیز تقریر کرتے سنا۔ 'جناح میاں' کا ذکر خیر خاص طور پر ہوا، اور وزیر صاحب ایک عالم شادمانی میں ہمیں یہی بتلاتے رہے کہ جب 'جناح میاں' ہندوستانی فضا میں پرواز کرتے ہوئے مشرقی پاکستان جانے کی کوشش کریں گے تو ان کا جہاز کسی نہ کسی طرح ہندوستانی علاقے میں پھنسا لیا جائے گا اور 'جناح میاں' کی ویسی ہی تواضع کی جائے گی جس کے وہ سزاوار ہیں۔

ایک سال بعد میرے والد کا تبادلہ گورکھ پور ہو گیا۔ مجھے ہائی اسکول کی تعلیم پوری کرنے کے لیے گورنمنٹ جوبلی ہائی اسکول (اب انٹر کالج) بھیج دیا گیا۔ ایک بار ہم اپنے قومی راہنماؤں کے بارے میں ویسے ہی گپ شپ لگا رہے تھے۔ ایک ساتھی طالب علم کہنے لگا کہ "اگر تم ابوالکلام آزاد کی دائیں کلائی پر نبض کی جگہ کھرچو تو تمھیں وہاں 'پاکستان' کندہ نظر آئے گا۔" ہم بلکہ خود آزاد بھی اس کا کیا جواب دے سکتے تھے؟

۱۹۵۱ میں میرے والد گورکھ پور میں شعبۂ تعلیم میں ایک معمولی ملازم تھے۔ دیہی گورکھ پور کے ایک چھوٹے سے قصبے گھوگھلی میں ایک دفتری دورے پر وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ہجوم کا نشانہ بنے جو نواحی کھیتوں میں ایک مردہ بچھڑا (جو ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کے ہاتھوں مارا گیا تھا) ملنے کی افواہوں پر مشتعل ہو گیا تھا۔ میرے والد پر اسی پرائمری اسکول میں حملہ کیا گیا جہاں وہ معائنہ کے لیے معمور کیے گئے تھے۔ ان پر لاٹھیاں برسائی گئیں، اور بے ہوشی کے عالم میں وہیں مرنے کے لیے پھینک دیا گیا۔ انھیں کوئی ہرجانہ، یہاں تک کہ اپنے اعلیٰ افسران کی جانب سے کوئی تعزیت نامہ یا ہمدردی کے دو بول تک موصول نہیں ہوئے۔ میرے نانا نے جو یوپی کی اسمبلی کے ایک رکن تھے، ڈائرکٹر تعلیم (جو اتفاق سے خود بھی ایک مسلمان تھے) کو ایک خط لکھ کر درخواست کی کہ میرے والد کا تبادلہ کسی ایسی تدریسی ملازمت میں کر دیا جائے جس میں باہر نہ نکلنا پڑے۔ مجھے آج بھی ڈائرکٹر کا یک سطری جواب یاد ہے: "میں یقیناً ذہن میں رکھوں گا۔" لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

اگر مسلمان اجنبیت محسوس کریں یا ہندوستانی سیاسی زندگی کے مرکزی دھارے سے خود کو علیحدہ محسوس کریں تو اس کا قصوروار کون ہے؟ مجھے اب بھی درد وغم کے ساتھ نام نہاد 'مسلم سماجی' فلم گرم ہوا (۱۹۷۴) کا آخری گیت یاد ہے۔ اپنے خاندان کو بکھرتے دیکھ کر سلیم مرزا اپنے گھر ہی سے بے دخلی کا کرب برداشت کرتا ہے کیوں کہ حکومت اس کو 'متروکہ اراضی' قرار دے چکی ہے۔ سلیم مرزا پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ وہ اس الزام سے بری ہو جاتا ہے لیکن اب وہ شکستگی کا شکار ہے، دوست اور شناسا اس سے منھ موڑ چکے ہیں۔ وہ اپنی پسندیدہ زمین سے ہجرت کر کے پاکستان چلے جانے کے عزم کو بھی خیرباد کہہ دیتا ہے، اس کی وہ زمین جس نے اسے مایوسی اور رسوائی کے علاوہ کچھ نہیں دیا۔ آخری منٹ میں وہ اس ہجوم میں شامل ہو جاتا ہے جو مہنگائی اور دوسرے مسائل کے خلاف احتجاج کر رہا ہے۔ آخری گیت

کے باعث اس ملک میں اپنا اور اپنے بچوں کا کوئی مستقبل نہیں دیکھتا اور اکثر اپنے ہی وطن میں اسے ایک عدم اطمینانی کا شکار کر دیا جاتا ہے؟

ہمیں اس وقت تو فوراً 'لو جہاد' یاد آ جاتا ہے جب ایک مسلمان مرد ہندو عورت سے شادی کرتا ہے۔ لیکن ہم یا تو آمادہ ہی نہیں یا پھر اتنی ہی سرعت سے ان ہزاروں مسلمان لڑکیوں کو نہیں دیکھ سکتے جو ہندوؤں سے شادیاں کر رہی ہیں۔ ہم گئو رکھشا کے نام پر خون بہانے میں تو بہت جلدی کرتے ہیں لیکن ان لاتعداد گایوں کو دیکھنے سے قاصر ہیں جو پلاسٹک اور کوڑا نگلنے کے باعث جان دیتی ہیں یا روز ہندوؤں کے زیر انتظام حفاظتی باڑوں میں بھوکی مر جاتی ہیں۔ کسی کو یاد بھی نہیں اور کوئی شاید ہی اس بارہ سالہ بچے پر ماتم کرتا ہے جس نے اپنے والد کو مجبور کیا کہ وہ اسے اپنے چچا کے ساتھ ایک گایوں کی خرید و فروخت کے ایک جائز کاروباری سفر پر جانے دے، اور پھر اس کا مقدر نڈر گئو رکھشاؤں کے ہاتھوں جنگل میں ایک درخت پر لٹکایا گیا پھندا ٹھہرا۔ ہم فوراً ایک مشکوک دہشت گرد کو تو دیکھ لیتے ہیں لیکن اس قسم کے درجنوں 'دہشت گردوں' کو دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں جو جیل میں دس، پندرہ، بیس سال گزارنے کے بعد بھی باعزت بری کر دیے جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایسے وزرا ہیں جو ہمیں رام زادہ اور حرام زادہ میں سے ایک کو چن لینے کی پیش کش کرتے ہیں۔ ایسے وزرا بھی ہیں جو ہمیں بتاتے ہیں کہ جو بی جے پی کو ووٹ نہیں دیتا، وہ پاکستان چلا جائے۔ ہمارے ہاں کچھ وزرا کا کہنا ہے کہ چونکہ کسی نے بھی بندر کو انسان میں بدلتے نہیں دیکھا اس لیے نظریۂ ارتقا بے بنیاد ہے۔ ہمارے ہاں ایک وزیر اعظم ہے جو فخر سے کہتا پھرتا ہے کہ گنیش بھگوان کا ہاتھی نما سر اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ قدیم ہندوستان میں کبھی اعضا کی پیوند کاری ہوتی تھی۔ ہمارے ہاں ایسے راہنما پائے جاتے ہیں جو ہندوؤں کو زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنے کی ترغیب دیتے ہیں مبادا مسلمان جلد ہی ان سے تعداد میں آگے نکل جائیں۔ یہ سب کچھ ایک ایسے ملک میں ہو رہا ہے جہاں لاتعداد بے روزگار، ان پڑھ اور غربت کی چکی میں پستے ہوئے عوام ہر روز روٹی، کپڑے اور مکان کے بغیر ہی زندگی کا پہیہ کھینچ رہے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ اچھا ہو جائے گا جب مسلمان مرد اپنی بد بخت ٹوپی اتار پھینکے گا اور مسلمان عورت اپنا کم بخت برقعہ اپنے بچے کے بچھونے کے طور پر استعمال کرے گی؟

[''انڈین ایکسپریس''، ۱۵ اپریل ۲۰۱۸]

ایک بوکھلائے ہوئے مضمون کے جواب میں

تصنیف حیدر

میں نے کہیں پہلے بھی دوستوں سے یہ بات کہہ رکھی ہے کہ ذرا وقت گزرنے دیجیے، معلوم ہوگا کہ فاروقی صاحب نے جو اتنی ساری اصناف پر ہاتھ صاف کر رکھا ہے، شاعری، افسانہ، ناول، داستان، تنقید، تحقیق اور لغات کسی چیز کو اپنی نگاہ محبت کے اثر سے محروم نہیں رکھا، اسی کے سبب ان کے کام میں موجود خامیوں کا جلد سے جلد پتہ لگا لیا جائے گا اور ان کے مریدین کی ایک بڑی تعداد مرتدین کے حلقے میں شامل ہوگی، جب کوئی ایک اور شخص علم تنقید لے کر اس میدان ادب میں اسی آن بان اور شان سے وارد ہوگا جیسے کہ وہ ہوئے تھے۔ ان کے لیے بہرحال ایک اچھی خبر یہ ہے کہ لوگوں نے پڑھنا لکھنا بہت کم کر دیا ہے، مگر بری خبر یہ ہے کہ بالکل ترک نہیں کیا۔ کہیں کہیں کوئی شخص اب بھی پڑھنے سے دلچسپی رکھتا ہے، جو ان کے حلقہ ارادت کو ہی کیا، ہر طرح کے مذہبی، علمی، شخصی تقدس کو پامال کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ ابھی تک یہ معاملہ غیر ضروری تنقید اور شاعری کی بلا سبب اصلاحات تک محدود تھا، چنانچہ ان کی طرف سے درگزر ہی بہتر تھا۔ اب ادھر انھوں نے ایک اور گل کھلایا ہے، موصوف نے ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں آواز بلند کی ہے اور ہندوستان کے ایک انگریزی اخبار میں بڑے کروفر کے ساتھ ان کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس میں ان بے چارے مسلمانوں کی ذہنی الجھن کو سمجھنے کا مشورہ دیا گیا ہے جو کرکٹ میں پاکستان کی جیت پر پٹاخے پھوڑ کر جشن مناتے ہیں، فاروقی صاحب کے بقول یہ وہ معصوم اور غیر محفوظ مسلمان ہیں، جنھیں ان کا مستقبل ہندوستان میں بہتر نظر نہیں آتا، چنانچہ وہ پاکستان کی جیت پر تالیاں بجا کر اپنے بچوں کا مستقبل تابناک بنانے کی ایک سعی ناکام کرتے ہیں، چونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ پاکستان ایک بہت روشن خیال، امیر و کبیر اور اکثریت و اقلیت کے حقوق کا بے حد خیال رکھنے والا ایک خوبصورت سا ملک ہے، چنانچہ ہندوستانی مسلمان اس حسرت میں مرا جا رہا ہے کہ اسے کسی بھی طرح پاکستان تک پہنچا دیا جائے، کیونکہ ہندوستان میں تو اس کی فکر کرنے والی حکومت نہیں ہے۔ فاروقی صاحب کو بس ایک بات بتا دوں کہ ان کا یہ مضمون اگلی بار بی جے پی کی الیکشن کیمپینگ میں بہت کامیاب وسیلہ ثابت ہو سکتا ہے، حالانکہ مجھے شک ہے کہ بی جے پی کے

پاس اتنے عقلمند سیاسی رہنما موجود ہیں، جو اس قسم کے مضامین سے فائدہ اٹھا سکتے ہوں، پھر بھی اگر ایسا ہوا تو اس مضمون کو بطور ثبوت پیش کیا جائے گا کہ مسلمان 'پاکستان زندہ باد' کے نعرے بھی لگاتے ہیں، پاکستانی کرکٹ ٹیم کے جیتنے پر جشن بھی مناتے ہیں اور یہ بات ہم نہیں کہتے بلکہ ایک ایسا شخص کہہ رہا ہے، جو مسلمانوں کی معاشی پسماندگی کے لیے ہندوستانی حکومت کو ذمہ دار قرار دیتا ہے اور خود کو مسلمانوں کا زبردست ہمدرد گردانتا ہے۔

اس پر بھی سوچے گا، مگر اس سے پہلے ایک پھیکے گھونٹ کی طرح اس سوال کو نگل جایئے کہ آخر اس عمر میں فاروقی صاحب کو مسلمانوں کی ابتری پر لکھنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ فاروقی تو بقول خود تقسیم کے چشم دید گواہ ہیں، وہ تو پھر بھی دور کی بات ہے، انھیں اردو کو غدار زبان کہے جانے کا ہمیشہ افسوس رہا ہے، حالانکہ وہ بابری مسجد کے انہدام اور گجرات فسادات کے وقت بھی پوری تندہی سے 'اردو تنقید وزبان' کے فروغ میں لگے رہے تھے اور ان کی کسی کتاب میں ایسا کوئی مضمون نہیں ملتا، جس میں انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی ابتری، ان کے خون، ان کے دکھ پر اتنی شدت سے آنسو بہائے ہوں اور اپنا غصہ ظاہر کیا ہو؛ پھر اچانک اس عمر میں ان کے نہایت اعظم گڑھی اسلام کے وجود میں آجانے کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں؟ پہلا سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے پیٹ میں داڑھی کی طرح دل میں یہ ہمدردی بہت دنوں سے چھپائے رکھی تھی، جس کا ظہور اب ایسے وقت زیادہ ضروری ہے، جب وہ دیکھتے ہیں کہ اردو ادب کے ٹچے قسم کے رائٹر بھی اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دے رہے اور کہیں ایوارڈ واپس کر کے، انگریزی میں انٹرویو دے کر غیر ملکی زبانوں میں اپنی بودی کتابوں کا ترجمہ کرا لینے میں کامیاب ہو رہے ہیں، چنانچہ موقع اچھا ہے، کیوں نہ ہم بھی اروندھتی رائے سے کچھ سیکھ کر اس کے نقش قدم پر چل کر دیکھیں۔ حالانکہ اروندھتی رائے سے میرا کچھ معاملات میں سخت قسم کا اختلاف ہے، مگر میں ان کی اس بات کی تو بہر حال تعریف کروں گا ہی کہ ان کا موقف نیا نہیں ہے اور وحی الٰہی کی طرح اچانک ان پر نازل نہیں ہوا ہے۔

میں سمجھ سکتا ہوں کہ جب شاعری ناکام ہو، تنقید کا مستقبل نظر نہ آئے، تحقیق کو کوئی پوچھے نہیں، داستانوں پر کیے گئے کام کو لوگ پڑھیں نہیں، ناول کیا انگریزی میں ترجمہ ہو جانے کے باوجود اس کو کوئی بڑا عالمی اعزاز نہ میسر آئے تو کوئی تو ایسی چیخ بلند کرنی ہی ہوگی جس سے روشنی کا نیلا دائرہ پرتو آفتاب کی طرح موصوف پر بھی پڑ سکے۔

اب آتے ہیں ہندوستانی مسلمانوں کی اس مظلومیت کی جانب، جس پر ہمارے اکلوتے نقاد ادب نے روتے دھوتے روشنی ڈالی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ایک چیز سے سخت چڑ ہے کہ انھیں 'ہندو' نہ کہا جائے۔ خواہ ہندو کہنے والا اپنی مذہبی شناخت کو بھی خطرے میں ڈال کر یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہو کہ ہندو لفظ مذہبی لفظ ہرگز نہیں، بلکہ ایک ثقافتی شناخت کا مظہر ہے۔ اس لفظ کو تسلیم کرنے میں وہی سازشی تھیوری سد راہ بنی ہوئی ہے، جو انگریزوں کے زمانے میں مسلمانوں کے راستے میں اس طرح حائل تھی کہ انگریز ہمارے بچوں کو اس لیے اپنی زبان پڑھانا چاہتے ہیں تاکہ انھیں عیسائی بنایا جاسکے۔ فاروقی صاحب تاریخ

داں ہیں، ادب شناس ہیں، ذرا سا پیچھے مڑ کر بتائیں کہ انگریزی زبان کو اس سازش کا نتیجہ سمجھ کر ترک کر دینے سے مسلمانوں کو کتنے نقصانات ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کا اصلی مسئلہ ہی یہ ہے کہ ان کے عالم، ان کے رہنما، ان کی کتابیں، ان کے مذہبی پرچار اس قسم کے معاملات سے بھرے پڑے ہیں کہ لوگ سازش کر کے تمھارا وجود دنیا سے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ واحد ایسی قوم ہے، جو مذہب کو انسان کا انفرادی معاملہ ماننے سے بہ بانگ دہل انکار کرتی ہے، اور اس کے نتیجے میں اب دوسری قوموں نے بھی یہی وطیرہ اختیار کرنا شروع کر دیا ہے۔ مسلمان چندہ مانگ سکتے ہیں، مسجدوں پر مسجدیں تعمیر کر سکتے ہیں، چالیس چالیس دن کی جماعتوں پر بھیجنے کے لیے لوگوں کو روانہ کر سکتے ہیں، گیارھویں پر دعوت عام رکھ سکتے ہیں، ہر سال قربانی پر ہزاروں روپے خرچ کر کے موٹے تازے بکروں کو اللہ میاں کی راہ میں قربان کر سکتے ہیں، مدرسے بنا کر انھیں 'دارالعلوم' کا خطاب بخش سکتے ہیں۔ مگر نہیں کر سکتے تو اسکول قائم نہیں کر سکتے۔ اسکول قائم کر بھی لیں تو انھیں 'اسلامی اسکول' کے نام سے نوازنے لگ جاتے ہیں۔ ہندوستان میں جتنی مسجدیں ہیں، اگر ان کے لاؤڈ سپیکر کباڑ میں بھی بیچے جائیں تو اتنے پیسے جمع ہو سکتے ہیں کہ ایک ڈھنگ کا اسکول قائم کر لیا جائے، جہاں بچوں کو تقلید وعقیدے کی ٹوپی اور چشمہ پہننے کے بجائے عقل اور معلومات سے کام لینا سکھایا جاسکتا ہے۔ رمضان آجائے تو رات رات بھر نہاری اور قورمے کے ہوٹل منہ کھولے فاقہ کشوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں، عید کی شاپنگ کے لیے ان مظلومین کی وجہ سے سڑکوں پر تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ فاروقی صاحب ہمارے محلے میں کبھی یونہی اپنی بھاری بھر کم ہمدردانہ پوشاک بدل کر سادہ لباس میں ٹہلتے ہوئے آنکلیں تو میں انھیں اپنے گھر ٹھہراؤں اور بالکل پڑوس کے اسکول سے صبح سویرے بچوں کو چیخ چیخ کر چھ کلموں کی گردان کرتے ہوئے سنواؤں، تب شاید انھیں معلوم ہو کہ مذہب اور مسلمانوں کو کسی بھی صورت الگ کر پانا کس قدر ناممکن سی بات ہے۔ ویسے فاروقی صاحب اس معاملے میں تو غلط نہیں ہیں کہ پاکستان یہاں کے مسلمانوں کا محبوب خطہ بہر حال ہے، اگر محبوب نہ بھی ہو، تب بھی اس پر مناسب اعتراض کی راہ نکالنا بھی اس قدر باعث گناہ تو ہے ہی کہ لوگ اس سے بچ نکلنے کا بہانہ ڈھونڈ لیں۔ میں نے ایک امریکی کمپنی میں کام کرنے والے انجینئر صاحب کو بھی پاکستان کی حمایت کرتے دیکھا ہے اور یہاں کے ایک ایسے نیتا کو بھی جو ٹھیک فاروقی صاحب کی طرح یہ مانتے تھے کہ مسلمانوں کا مستقبل ہندوستان میں نہیں بلکہ پاکستان میں زیادہ محفوظ ہے۔ اس نہایت مظلوم طبقے کے ایک اکثریتی محلے میں رہ کر میں نے خود دیکھا ہے کہ کوچنگ کلاسز پر اقبال کا شعر لکھوایا جاتا ہے:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

بچوں کو اسکول میں ٹوپی پہن کر اور لڑکیوں کو اسکارف باندھ کر آنے کی باقاعدہ ہدایت جاری کی جاتی ہے، حلال لپ سٹک، حلال پیزا تو چھوٹی باتیں ہیں، اسلامی اسکارف اور برقعوں کی خریداری پر زور دیا جاتا ہے، جس کا مقصد پردے کی حقیقی 'روح' سے واقف کرانا ہوتا ہے۔ دینی تعلیم کے بڑے بڑے مرکز قائم کیے جاتے ہیں۔ گھروں، بلڈنگوں کی چھتوں پر اسلامی جھنڈے لگائے جاتے ہیں۔ مسجد کے مینار تو دور کی بات

ہے، بلڈنگ کی گریلوں تک سے لاؤڈ سپیکر باندھ کر لوگوں کی سماعتوں میں زبردستی چیخ چیخ کر اذانوں کو انڈیلا جاتا ہے۔ اور مظلومیت کی انتہا کا عالم تو یہ ہے کہ اس کے باوجود مسلمانوں کو معزز اخباروں، ٹیلی ویژن شوز اور مباحث یا تقاریر میں یہ کہنے سے روکا نہیں جاتا کہ حکومت ان کا خیال نہیں رکھتی، ان کو پچھڑے ہی رہنے دینا چاہتی ہے۔ اور یہ کہ مسلمانوں پر زبردستی ہندو کا لفظ تھوپا جا رہا ہے اور اس میں صرف یوگی ادتیہ ناتھ جیسے سیاسی رہنما ہی شامل نہیں بلکہ اس سازش کے سرے فارسی لغت نویس ٹیک چند بہار سے جا کر ملتے ہیں۔ پھر تو حالی کی اس بات پر فاروقی صاحب نے بے کار ہی اعتراض کیا تھا کہ اردو لغت تیار کرنے کی جو اہم شرائط ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی مسلمان ہو، یعنی فاروقی صاحب کی خالص اصطلاح میں 'اپنا' آدمی ہو۔

آخر میں بس اتنی بات کہوں گا کہ فاروقی صاحب، یہ تو طے ہے کہ ادب گھٹیا شاعری اور غیر ضروری تنقیدی جملوں کے معاملے میں بڑا بے رحم ہے، جو بچی کھچی ہے، اسے بھی کیوں اس طرح کے جملوں سے کھو دیا جائے، کم از کم اتنا ہی خیال کیجیے کہ آپ کے ارادت مندوں میں صرف مسلمان ہی نہیں ہیں۔ وہ بھی ہیں، جو سراج الدین علی خان آرزو کے بتائے گئے مطلب سے بہت زیادہ اتفاق نہیں رکھتے اور آپ کی محبت میں چپ ہیں، یہ جانتے ہوئے کہ آپ یہ سب کچھ مسلمانوں کی ہمدردی میں نہیں کر رہے، ایک عدد انعام کے لیے کر رہے ہیں۔ مگر چھوڑیے بھی! ایسا انعام لے کر کیا کیجیے گا، جو لوگوں کے دلوں میں زبان اور مذہب کی بنیاد پر مزید نفرت پیدا کرے۔ آپ ایک صحیح العقیدہ مسلمان ہیں، چنانچہ اپنی عاقبت کی فکر کیجیے، ادب کی عاقبت کی فکر مت کیجیے، اردو والے کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، ایسے بھی سنگ دل نہیں کہ کبھی کبھی آل احمد سرور، احتشام حسین، کالی داس گپتا رضا، گیان چند جین، رشید حسن خاں اور آپ جیسے ادب شناسوں کو یاد نہ کر لیا کریں۔

فرقہ وارانہ استعارے

عامر ریاض

جیسے سیاست میں بنیادی اصول یہ ہے کہ آپ پارلیمان کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہیں یا نہیں؟ ایسے ہی مذاہب کے بارے میں بات کرتے ہوئے بنیادی اصول یہی ہے کہ آپ رواداری، بردباری اور اعتدال پسندی کو عملاً تسلیم کرتے ہیں یا نہیں؟

اگر آپ اس اصول کو مدنظر نہیں رکھتے تو پھر آپ فرقہ واریت کی مخالفت کرتے ہوئے فرقہ وارانہ استعارے ہی استعمال کرتے ہیں۔ یوں فرقہ وارانہ ماحول بدستور برقرار رہتا ہے۔

فاروقی صاحب کو یہ اختیار کس نے دیا؟

اشعر نجمی

شمس الرحمن فاروقی کا انگریزی مضمون "Agony of the Marginalised" ('انڈین ایکسپریس، ۵ اپریل ۲۰۱۸) پڑھا تو میرا جو سب سے پہلا تاثر تھا، وہ یہ تھا کہ 'انڈین ایکسپریس' جیسے مؤقر روزنامے میں یہ مضمون شائع کیسے ہو گیا؟ پھر ایک دوست کے توجہ دلانے پر اس مضمون کے آخر میں ایڈیٹر کا تعارفی فقرہ نظر آیا کہ 'اس مضمون کے مصنف اردو کے معروف ادیب ہیں۔' گویا کہا جا رہا ہو کہ کسی اردو ادیب سے آپ اور کیا توقع کر سکتے ہیں؟

ممکن ہے کہ فاروقی کا متذکرہ مضمون پڑھ کر ان لوگوں کو حیرت ہوئی ہو، جو ان کے ادبی نظریات سے روشن خیالی کی امید لگائے بیٹھے ہیں، لیکن مجھ پر کوئی خاص فرق اس لیے نہیں پڑا کہ اس صدمے سے کافی پہلے گذر چکا ہوں، جب 'شب خون' کے ایک شمارے میں ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوؤں پر ان کے خیالات جاننے کا اتفاق ہوا تھا۔ اپنے ارشادات میں فاروقی نے مسلمانوں کے لیے 'ہم لوگ' اور ہندوؤں کے لیے 'وہ لوگ' کا استعمال کیا تھا، جس سے ان کی علیحدگی پسندی اور نرگسیت کا ایک معمولی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بعد میں ذکیہ مشہدی نے ایک طویل خط لکھ کر اس پر اپنا سخت احتجاج درج کرایا تھا۔ لیکن اس میں فاروقی کو میں قصوروار نہیں سمجھتا، چونکہ اول تو وہ سیاسی یا سماجی مسائل پر ذرا کم ہی اپنی زبان کھولتے ہیں لیکن جب بھی کھولتے ہیں تو وہ دوسرے ریاکار مسلم رہنماؤں یا دانشوروں کی طرح اپنی گفتگو کو sugar-coat کرنے کا تکلف نہیں اٹھاتے، ان کی یہی ادا مجھے پسند ہے، وہ جو کہتے ہیں خم ٹھونک کر کہتے ہیں۔ اس سے ہم جیسے جاہلوں کو ان کا مافی الضمیر سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ زیر نظر مضمون میں بھی فاروقی نے اسی صاف گوئی کا سہارا لیا ہے، جس سے ان کی 'معصومیت' اور ان کی 'طبیعت کے میلان' کو سمجھنے کے لیے کسی راکٹ سائنس کی ضرورت نہیں پڑتی۔

میں فاروقی کی ادبی تحریروں کا دیرینہ مداح رہا ہوں بلکہ ان کے مجھ پر کافی احسانات ہیں۔ سب سے بڑا احسان تو یہی ہے کہ انھوں نے مجھے لکھنے اور پڑھنے کا بنیادی سبق سکھایا ہے۔ انھوں نے ہی مجھے سکھایا

ہے کہ 'عقیدت' کا اکلوتا مظہر 'تقلید' ہے، جسے ہماری تہذیب میں 'سعادت مندی' سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن علم و دانش کی دنیا میں ایسی 'سعادت مندی' کو بددیانتی تصور کیا جاتا ہے۔ فاروقی نے خود اپنے طویل ادبی سفر میں اس کا عملی ثبوت دیا ہے، مثلاً فراق گورکھپوری سے عقیدت رکھنے کے باوجود ان کی زندگی میں ہی ان کی شاعری پر سخت تنقید کی۔ سردار جعفری کی شاعری کا قائل ہونے کے باوجود فاروقی نے ان کے ادبی نظریات کا جس طرح تیاپانچہ کیا، سب جانتے ہیں۔ فیض اور قرۃ العین حیدر سے موانست ہونے کے باوجود ان کے تخلیقی رویوں اور کارناموں پر سوال اٹھائے۔ ایسی اور بھی بہت سی مثالیں وہ لوگ دے سکتے ہیں جو ۱۹۶۶ کے بعد اردو ادب میں پیدا ہوئی تھرتھری سے واقف ہیں۔ یہ وضاحت اس لیے ضروری تھی، چونکہ لوگ اکثر 'اختلاف رائے' کو رنجش یا بغاوت وغیرہ سے تعبیر کرنے کی جلد بازی دکھا دیتے ہیں، حالاں کہ فاروقی کے زیر بحث مضمون پر ان سے اختلاف کرنے کی ہمت بھی اسی لیے ہوئی کہ میں ان ہی کی علمی اخلاقیات کے تسلسل کی ایک کڑی ہوں۔

ظاہر ہے فاروقی کافی پڑھے لکھے آدمی ہیں، ادب ہی نہیں بلکہ دوسرے سماجی و سائنسی علوم کا مطالعہ بھی کافی وسیع ہے لیکن ان کا زیر نظر مضمون پڑھ کر مجھے مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک 'انتباہ' یاد آتا ہے کہ، ''تعلیم دماغ پر ایک نیا رنگ چڑھا دے گی لیکن اس کی بناوٹ کے اندر نہیں اترے گی۔ بناوٹ کے اندر ہمیشہ نسل، خاندان اور صدیوں کی متوارث روایات ہی کا ہاتھ کام کرتا رہے گا۔'' (غبار خاطر) فاروقی کے ساتھ بھی یہی حادثہ ہوا، مطالعہ ان کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد جو بنیادی سوال میرے ذہن میں گونجا، وہ یہ تھا کہ آخر فاروقی کو 'marginalised' مسلمانوں کی طرف سے بولنے کا اختیار کس نے دیا؟ پھر اسی سے برآمد دوسرا سوال بھی پیچھے پیچھے آ گیا کہ آخر ہندوستانی مسلمانوں کی کتنی بڑی تعداد ایسی ہے جو خود کو 'marginalised' سمجھتی ہے؟ بلاشبہ اس جمہوری ملک میں فاروقی کو اظہار رائے کا پورا حق حاصل ہے لیکن یہ اخلاقی بددیانتی ہے کہ وہ اپنے احساسات اور مخصوص مائنڈ سیٹ کے مطابق پوری کمیونٹی کا خود کو نمائندہ بنا لیں۔

فاروقی نے اپوروانند کی اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان سے لبرل ازم کے تقاضے کا مطلب مسلمان سے زیادہ ہندو ہونا ہے۔ اس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہے کہ فاروقی کا ہندوؤں سے سیکولر ہونے کے تقاضہ کا مطلب ہندو سے زیادہ مسلمان ہونا ہے، تو میرے خیال میں یہ بھی درست ہوگا؟ اور کیا واقعی یہ حقیقت نہیں ہے؟ آپ کی نظر میں ایک اچھا سیکولر وہ ہے جو مسلمانوں کی ہر جائز اور ناجائز باتوں کی حمایت کرے، ان کی ناز برداری کرے اور ان کے حقوق کے لیے لڑے؟ لیکن جیسے ہی اس نے مسلمانوں کے طرز فکر یا رویوں پر، خواہ کتنی ہی نرمی، محبت اور نیک نیتی کے ساتھ اصلاح کی غرض سے تنقید کی، تو وہ اسلام اور مسلم دشمن نظر آنے لگتا ہے۔ رام چندر گوہا کے ساتھ بھی یہی ہوا، اس بیچارے نے حجاب کو ترشول کا مقابلے میں کیوں کھڑا کر دیا؟ اگر یہی بات اپوروانند کہتے تو فاروقی ان کے مخالف ہو جاتے۔ لیکن دیکھنے والی بات یہ ہے کہ رام چندر گوہا سے برسوں پہلے مسلمانوں کی جعلی شناخت پر مولانا ابوالحسن علی ندوی المعروف علی میاں

تنقید کر چکے ہیں۔ بھیونڈی میں ۱۹۸۴ کے فرقہ وارانہ فسادات کے چند روز بعد وہاں کے مسلمانوں نے اپنے علاقے میں علی میاں کے لیے ایک جلسہ منعقد کیا، شاید اس خیال سے کہ مولانا موصوف دوسرے مذہبی رہنماؤں کی طرح ان کے مجروح جذبات پر اپنی جذباتی اور مبالغہ آمیز تقریر کا مرہم رکھیں گے لیکن علی میاں نے کرسی توڑ جذباتی تقریر کرنے کی بجائے مسلمانوں کی مخصوص 'شناخت' کو ہی اس کا ذمہ دار ٹھہرا دیا۔ ملاحظہ فرمائیں تقریر کا یہ اقتباس:

> اب آپ ہی بتائیں کہ کسی ملک میں مسلمان ایک ہزار برس سے ہوں اور وہ مسلمان نہ اپنا تعارف کرا سکیں، نہ ان کو متاثر کر سکیں، تو بتایئے یہ کوتاہی ہے یا نہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اخلاق کی خوشبو ہمارے ہم وطنوں کو نہیں پہنچ سکیں۔ انھوں نے ہم کو سیاسی میدان میں دیکھا یا انتخابی معرکہ (الیکشن) کے میدان میں ہم کو آزمایا، یا تجارت کے مقابلے میں ہم کو دیکھا، مسجدوں میں یہ آتے نہیں، انھوں نے ہم کو معاملات میں نہیں پرکھا، انھوں نے ہم کو اخلاق سے نہیں جانچا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس طرح مسلمانوں پر حملہ کرتے ہیں جیسے بالکل غیر مانوس، پردیسی اور دشمن پر کرتے ہیں۔ ...آپ کسی پڑھے لکھے ہندو سے پوچھ لیجیے کہ آپ نے اسلام کا مطالعہ کیا ہے؟ کہیں گے بالکل نہیں! اچھا آپ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق کیا جانتے ہیں؟ وہ کہیں گے کہ ہم مسلمانوں سے متعلق اتنا جانتے ہیں کہ مسلمان ختنہ کراتا ہے، گائے کا گوشت کھاتا ہے اور کچھ بات ہو جائے تو اسے بڑی جلدی غصہ آ جاتا ہے... ہمارے ایک عرب فاضل دوست کہتے تھے کہ جب میں امریکہ گیا تو وہاں کے لوگ مسلمان اور عرب سمجھ کر مجھ سے دو باتیں پوچھتے تھے، ایک یہ کہ بتاؤ کہ تمھارے حرم میں کتنی بیویاں ہیں؟ دوسرے تمھارے دروازے پر کتنے اونٹ بندھے ہیں؟ تو گویا مسلمانوں کی پہچان امریکہ دو ہیں؛ کئی بیویاں رکھتا ہو، اور اونٹ ضرور پالتا ہو، تو آج یہ ہندوستان کا جو متوسط درجے کا ہے (اسکالرز کو آپ الگ کر دیں) وہ یہ تین چار علامتیں مسلمانوں کے بارے میں جانتا ہے کہ ختنہ کراتا ہے، گائے کا گوشت کھانا اس کے مذہب میں داخل ہے، چاہے چوری سے کھائے، وہ سمجھتا ہے کہ ایمان اس کا ناقص ہوگا اگر وہ گائے کا گوشت نہ کھائے، اور غصہ اس کی ناک پر رکھا ہوا ہے، بات تم نے کی اور مسلمان کو غصہ آ گیا، مسلمانوں کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ (گویا دین کی علامت ہے) کہ مسجد کے سامنے دوسروں کا باجا نہیں سن سکتا، چاہے خود بجائے، لیکن غیر مسلم کی بارات کا باجا نہیں سن سکتا مسجد کے سامنے۔ اپنی اس کی جان ایک کر دے گا، یہ ہے کُل تعارف ہمارا اس ملک میں۔ (''فسادات اور ہندوستانی مسلمان''، بار اول، صفحہ ۱۰-۱۲، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ ۱۹۹۱)

یہ کون بول رہا ہے؟ آر ایس ایس کا کوئی لیڈر یا رام چندر گوہا جیسا کوئی ہندو کالم نویس؟ جی نہیں،

بلکہ یہ پورے دنیائے اسلام کی وہ محترم شخصیت بول رہی ہے جس کے ہاتھ میں خانۂ کعبہ کی کنجیاں اعزازاً سونپی گئی تھیں، یہ اعزاز میری دانست میں اس وقت تک کسی غیر عرب کو نہیں بخشا گیا تھا۔ یہ وہی علی میاں ہیں جنھوں نے کبھی وہائٹ ہاؤس کے سامنے واقع ایک ہال میں، جو امریکی سینیٹ کے ممبروں اور سرکاری عہدیداروں سے بھرا ہوا تھا، اپنی پُر اثر اور عالمانہ انگریزی تقریر کے ذریعہ ان کی سیاسی اخلاقیات پر سوال اٹھانے کی جرأت کی تھی۔ کیا فاروقی یا دوسرے رہنمایانِ ملت سے اس اخلاقی جرأت کی امید کی جاسکتی ہے کہ وہ غلط کے منہ پر غلط کہہ سکیں، پھر خواہ وہ 'اپنا' ہو یا 'غیر'؟ فاروقی کے 'مجروح جذبات والے فارمولے' کے مطابق یہاں یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ کیا مولانا موصوف کی حق گوئی انھیں 'مسلمان سے زیادہ ہندو بنا گئی'؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ سیکولرازم اور لبرل ازم کا مسلمانوں سے کیا رشتہ؟ سیکولرازم آپ کی ترجیح نہیں مجبوری ہے، جمہوریت آپ کی پسند نہیں بلکہ پناہ گاہ ہے، ورنہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں ان دونوں چیزوں پر لعنتیں برسائی جاتی ہیں۔ آیئے ذرا دنیا کی سیر کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ مسلمان کتنے لبرل اور سیکولر ہیں۔

تمام مسلم ممالک میں غیر مُسلم اقلیتوں کی تعداد میں مسلسل کمی آرہی ہے لیکن اسرائیل کی حدود میں رہنے والے مسلمانوں کی آبادی میں اتنی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے کہ ایک اندازے کے مطابق آئندہ آنے والی دو دہائیوں میں مسلمان اسرائیل میں اکثریتی مذہبی آبادی بن جائیں گے۔ مسلم ممالک میں غیر مسلم آبادی کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جا رہا ہے؟ اس کا اندازہ بھی ان اعداد وشمار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

(۱) ۱۹۴۷ میں پاکستان کی ہندو آبادی ۱۵ فیصد سے گھٹ کر ایک فیصد رہ گئی ہے جو مسلسل ظلم وستم کا شکار ہے۔

(۲) ۱۹۴۷ میں بنگلہ دیش کی ہندو آبادی ۳۰ فیصد سے گھٹ کر ۱۰ فیصد رہ گئی ہے۔

(۳) عراق میں آج سے دس سال پہلے ۸ لاکھ عیسائی آباد تھے، اب صرف ایک لاکھ پچاس ہزار رہ گئے ہیں۔

(۴) پہلی جنگ عظیم کے وقت ترکی میں ۲۰ لاکھ عیسائی آباد تھے جو اب گھٹ کے ایک لاکھ سے بھی کم رہ گئے ہیں۔

(۵) حالیہ 'عرب بہار' (Arab Spring) کے بعد مصر میں عیسائی کوپٹ آبادی (Copts) پر حملے اور ان کا قتل عام ایک معمول بن چکا ہے۔

ایسی درجنوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جو مسلم ممالک میں 'سیکولرازم' اور 'لبرل ازم' کے عمدہ نمونے ہیں۔ سعودی عرب کا شہری صرف ایک مُسلمان ہی ہو سکتا ہے۔ سعودی عرب میں دوسرے مذاہب کے افراد کا اپنی عبادت گاہیں بنانا تو دور کی بات ہے، اپنے گھروں تک میں اپنی مذہبی رسوم کی ادائیگی مشکل ہے۔ وہ یوں کہ دسیوں لاکھ غیر مُسلم افراد کو جو سعودی عرب میں بغرضِ روزگار مُقیم ہیں، اپنی مذہبی کتابیں جیسے گیتا یا بائبل یا مذہبی علامتی نشانات جیسے بت یا صلیب وغیرہ سعودی ریاست کے اندر لانے کی اجازت نہیں

ہے۔ حتیٰ کہ دبئی جیسی امارت میں، جو اپنی آزاد شبانہ زندگی میں لاس ویگاس کو مات دیتا ہے، چالیس لاکھ غیر مُسلم غیر ملکی کارکنان کے لیے صرف ایک گرجے اور ایک مندر کی اجازت ہے۔ فاروقی صاحب شاید سیکولر مسلمانوں کے ممالک میں پیش آنے والے ان واقعات کو بھی کم سمجھتے ہیں جن میں آئے دن دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو نذرِ آتش کر دیا جاتا ہے۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ پاکستان میں اب تک کتنے مندر ڈھائے گئے ہیں اور کتنے گرجوں کو آگ لگادی گئی ہے؟ بامیان کی مورتی تو آپ کو یاد ہی ہوگی ناں؟

مسلمان؛ خواہ ناخواندہ ہوں یا تعلیم یافتہ، اعتدال پسند ہوں یا انتہا پسند، ایک بات پر متفق ہیں، اس پر یقین رکھتے ہیں اور ہر دم اور ہر سطح پر اسی کا راگ الاپتے رہتے ہیں اور وہ بات یہ ہے کہ وہ ساری دنیا میں خواہ وہ امریکہ ہو یا یورپ، آسٹریلیا ہو یا فلپائن، بھارت ہو یا چین سنکیانگ (روس) چیچنیا یا سربیا، تھائی لینڈ ہو یا نائیجیریا، ہر جگہ مسلمان اقلیتوں پر مظالم ہو رہے ہیں اور خصوصاً اسرائیل اور فلسطین میں تو مسلمانوں پر قیامت ڈھائی جارہی ہے۔ ان کے لیے یہ بات ایک آفاقی کُلیے کی حیثیت رکھتی ہے کہ مسلمان جہاں کہیں بھی اقلیتی گروہ ہیں، وہ وہاں حکومتوں یا اکثریتی آبادی کے مظالم کا شکار ہیں۔ اس بہتان تراشی میں اسلامسٹ (Islamist) پروپیگنڈہ مشینری کے منہ میں زبان رکھنے والا دراصل مغربی دانشوروں اور سیاستدانوں کا اپنا ایک گروہ بھی ہے جس کا تعلق بائیں بازو یا اس آزاد خیال طبقے سے ہے جو شروع سے ہی اس مغربی معاشرے کو گالیاں دیتا آیا ہے، جس نے اسے اظہارِ رائے کی یہ آزادی دی ہے۔ ان میں سرفہرست کئی مشہور شخصیات ہیں، جیسے رپورٹر رابرٹ فسک، برطانوی سیاستدان جارج گیلووے، امریکی دانشور ایڈورڈ چرچل اور نوم چومسکی، لندن کا سابقہ میئر کین لیونگ اسٹون اور دیگر بہت سے۔ یہ آگ اور پانی کا اتحاد بھی بہت عجیب ہے۔ متذکرہ بالا اور ان کے قبیل کے دوسرے افراد ملحد یا لادین ہیں جو اسلامی نظریات اور قوانین کے مطابق سب سے زیادہ قابل نفرت اور لائق سزا ہیں۔ اگر مذہبی رہنماؤں کے بس میں ہو تو اسلامی قوانین کے مطابق ان افراد کے ساتھ بدترین سلوک ہو جیسا کہ ان جیسوں کے ساتھ اسلامی مملکتوں ایران، سعودی عرب اور طالبان کے زیرِ اثر افغانستان میں ہوا تھا۔ شاید بائیں بازو کے گروہ کو بالکل بھی یاد نہیں ہے کہ شہنشاہ ایران رضا شاہ کے ہٹائے جانے کے بعد ان کے دسیوں ہزار کامریڈوں کا ایران کے آیت اللہ حکمرانوں نے کیا حشر کیا تھا۔ وہ یہ بھی بھول چکے ہیں کہ افغانستان میں مولویوں نے ڈاکٹر نجیب کی لاش کو کابل کی سڑکوں پر کیسے گھسیٹا تھا۔ کیونکہ وہ مغرب کی آزاد اور محفوظ فضا میں اسلامسٹوں کی دسترس سے دور بیٹھے ہیں، وہ وہاں بیٹھ کر نہایت آسانی سے مغرب کو گالیاں دے سکتے اور اسلامسٹوں کی براہ راست یا گھما پھرا کر حمایت کر سکتے ہیں۔

اب آپ کہیں گے کہ فلسطین، افغانستان، پاکستان، سعودی، شام وغیرہ سے ہندوستانی مسلمانوں کا کیا رشتہ؟ جناب والا، بالکل ہے اور بہت مضبوط ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جب اسرائیلی وزیراعظم ہندوستان دورے پر آتا ہے تو اردو اخبار کیسے چیخ اٹھتے ہیں، علما اسے کن کن مادر پدر آزاد القابات سے نوازتے ہیں؟ مسلمان انھیں سیاہ جھنڈیاں کیسے دکھاتے ہیں؟ مجھے پورا یقین ہے کہ آپ سوشل میڈیا کی عیاشی سے دور ہوں گے لیکن آپ کو بتاؤں کہ ان دنوں پرنٹ میڈیا ہی نہیں بلکہ الیکٹرانک میڈیا کو بھی سوشل میڈیا نے چاروں

خانے چت کر رکھا ہے۔ ایک ہنگامہ برپا ہے اور ہنگاموں سے شرفا کو دور ہی رہنا چاہیے لیکن ان ہنگاموں سے ہم جیسے مبتدیوں کو ایک فائدہ یہ ہے کہ ہم عام آدمی کے جذبات اور اس کے دل کی بھڑاس کا بخوبی مشاہدہ کر سکتے ہیں چونکہ یہاں کوئی سینسر نہیں، ہر شخص اپنی رائے رکھنے کے لیے آزاد ہے۔ اسی سوشل میڈیا میں ہندوستانی مسلمانوں کے دل کی بھڑاس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے، جو بقول آپ کے حاشیے میں پڑے سسک رہے ہیں۔ کس طرح وہ ان نام نہاد مسلم ممالک سے ذہنی طور پر وابستہ ہیں اور کس طرح وہ اپنے خلاف، اپنے جامد تصورات کے خلاف اور اپنی اصلاح کرنے والوں کی ماں بہن کرتے رہتے ہیں۔ یہ میری اور آپ کی طرح سجا کر سنوار کر باتیں کرنے کے عادی نہیں ہیں، ان میں ریاکاری اور منافقت بھی نہیں ہے، جو دل میں ہے وہ زبان پر ہے۔ یہیں پتہ چلتا ہے کہ آپ کا مضمون حاشیہ میں پڑے جن لوگوں کا دفاع کر رہا ہے، انھیں آپ جانتے تک نہیں، ان کے ذہنی رویوں اور ان کی ترجیحات وتعصّبات سے آپ واقف ہی نہیں ہیں۔

ہزاروں کیلومیٹر دور شام، فلسطین، عراق، افغانستان پر آنسو بہانے والے ہندوستانی مسلمان اگر پورے جوش وعقیدت کے ساتھ کھل کر گلیوں، کوچوں اور سڑکوں پر نکل آتے ہیں تو پھر وہی جوش نائن الیون، ہندوستانی پارلیامنٹ میں ہونے والے دہشت گردانہ حملے اور ممبئی کی لوکل ٹرینوں میں ہونے والے دھماکوں کے خلاف اظہار مذمت کرتے ہوئے کیوں نظر نہیں آتا؟ بے شک مذمت ہوتی ہے، دیوبند سے فتویٰ بھی جاری ہوتا ہے جس میں دہشت گردی کو اسلام سے خارج بتایا جاتا ہے، مسلمانوں کے اخباروں میں کالم اور بیانات بھی شائع ہوتے ہیں کہ دہشت گردی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں اور یہ کہ 'ایک معصوم کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے' وغیرہ وغیرہ، لیکن یہ تمام افعال مخلصانہ کم اور معذرت خواہانہ زیادہ محسوس ہوتے ہیں۔ ان بیانات اور حرکتوں میں وہ زندگی نہیں نظر آتی جس کی رمق سنگھ پریوار اور یہودیوں کی مخالفت کرتے ہوئے آپ کے چہرے پر نظر آتی ہے۔ پتہ نہیں مجھ جیسے کور نظر کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ اپنی جان چھڑانے کے لیے ان مذمتوں کی حیثیت دفاعی تدابیر کے سوا کچھ نہیں۔

ایک اور سوال اٹھتا ہے کہ کیا اس سیکولر ملک میں آپ کا طرز فکر سیکولر ہے؟ مجھے معاف فرمائیں لیکن مظاہر بتا رہے ہیں کہ آپ اندر سے معاشرتی سطح پر تو خود کو سیکولر ظاہر کر رہے ہیں لیکن اندر قدامت پرستی کی کائی جمی ہوئی ہے۔ مثلاً طارق فتح جب زی ٹی وی پر مسلمانوں کے شعلہ بکف مسائل پر مسلمانوں ہی سے مکالمہ کرنا چاہتے ہیں تو کھلے عام اتر پردیش کا ایک مذہبی اور سیاسی رہنما ان کا سر قلم کرنے پر لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کا اعلان کرتا ہے، نہ آپ اس کی مذمت کرتے ہیں، نہ دوسری مذہبی تنظیمیں اور نہ ہی ہماری سرکار، کیوں؟ تامل ناڈو کے کوئمبٹور علاقے میں ایچ فاروق نامی ایک نوجوان کے قتل کے بارے میں تو آپ نے سنا ہی ہوگا، پیدائشی مسلمان تھا لیکن بدبخت نے اسلام چھوڑنے کا گناہ عظیم کیا تھا، سو اسے چار راسخ العقیدہ مومنین نے بے دردی سے قتل کر دیا۔ ممبئی کی وہ خاتون صحافی بھی آپ کو اب شاید یاد نہ رہی ہوں جنھوں نے اپنے اخبار میں شارلی ہیبدو کا متنازعہ کارٹون شائع کر دیا تھا، حالاں کہ اخبار نے بعد میں اعتذار شائع کیا اور اپنی غلطی کی معافی بھی مانگی لیکن اخبار کی کاپیاں جلائی گئیں اور خاتون ایڈیٹر کو روپوش ہونا پڑا، اس

کے بعد آج تک وہ صفحۂ صحافت سے غائب ہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک مذہب پر تنقیدی گفتگو ناقابل معافی گناہ ہے، خواہ وہ تنقید کتنی بھی شستہ اور عالمانہ دلائل سے کیوں نہ کی جائے، بہر حال وہ 'گستاخی' اور 'توہین' کے زمرے میں شمار کی جائے گی، البتہ اسی ملک میں عامر خان ایک مسلمان ہونے کے باوجود اپنی فلم ''PK'' میں ہندوؤں کی مقدس ہستیوں اور ان کے عقائد کا جم کر مذاق اڑاتا ہے، لیکن چھوٹے موٹے احتجاج کو چھوڑ کر فلم خوب اچھا بزنس کرتی ہے، ذرا تصور کریں کہ اگر یہی عامر خان مسلمانوں کے عقائد پر مبنی اسی طرح کی کوئی فلم بنائے تو اس کا ہندوستانی مسلمان کیا حشر کریں گے؟ میں جانتا ہوں کہ آپ 'پدماوتی' کا ذکر کرنے سے نہیں چوکیں گے، جسے بعد میں 'پدماوت' کا نام دے کر ریلیز کر دیا گیا۔ سوال اٹھتا ہے کہ اس فلم پر ہندو انتہا پسندوں کی جانب سے ہونے والی تمام تر شرانگیزیوں کے باوجود کیا اس مسئلہ کو جمہوری اور قانونی طور پر نمٹایا نہیں گیا؟ کیا صرف مسلمانوں کے 'جذبات' ہوتے ہیں، ہندو عوام بے حس ہوتی ہے؟ کیا کوئی انصاف پسند شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ 'پدماوت' کو ریلیز کر کے ہندوؤں کے جذبات سے خود سنگھ پریوار یا بی جے پی نے کھلواڑ کیا اور انھیں حاشیے پر ڈال دیا؟ کیا اسی بی جے پی کے ایک معزز پارلیامنٹ ممبر اور معروف ایکٹر پریش راول کی فلم ''اوہ مائی گاڈ'' آپ نے دیکھی ہے؟ 'گرم ہوا' کے علاوہ بھی کچھ دیکھ لیا کریں۔ ہندوتوا کے علمبردار پریش راول نے خود اپنی بنائی ہوئی فلم میں ہندو عقائد کا پوسٹ مارٹم کیا ہے، ان ہی کی ایک اور نسبتاً کم معروف فلم 'دھرم ادھیکاری' بھی موجود ہے جو ہندو مسلم تنازعہ پر مبنی ہے، اسے بھی دیکھ لیں کہ کس طرح اس فلم میں مسلمانوں کے تعلق سے برہمنوں کی تنگ نظری کی مذمت کی گئی ہے۔ کیا اس طرح کی فلموں کی توقع آپ پاکستان میں کر سکتے ہیں جو بقول آپ کے ہندوستانی نوجوانوں کو 'پُرکشش' لگتا ہے؟ پاکستان چھوڑیے، کیا ہندوستان میں ہی آپ اس طرح کی فلمیں برداشت کر پائیں گے جو مسلمانوں کی مذہبی تنگ نظری پر مشتمل ہوں؟ اس وقت تو آپ کو اس فلم میں سنگھ پریوار کا خفیہ ایجنڈا نظر آئے گا۔

دراصل ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنیت ایک سیکولر اور جمہوری ملک میں رہنے کے باوجود اب بھی وہی ہے جو پوری دنیا کے مسلمانوں کی ہے۔ آپ خود کو 'مغل اعظم' سمجھتے ہیں اور ناقابل تسخیر بھی، آپ سے افضل قوم اس دنیا میں کوئی دوسری نہیں، آپ سے اعلیٰ مذہب کسی کا نہیں اور آپ کی بے مثال اخلاقیات تو پوری دنیا کے لیے مشعل ہدایت ہے۔ یہ ہے وہ اصل ذہن سازی جو مسلمانوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، جسے ہمارے ناعاقبت اندیش رہنماؤں نے مزید ہوا دی۔

فاروقی صاحب کو کتے پالنے کا نہ صرف شوق ہے بلکہ وہ ان کی تمام آسائشوں کا خیال رکھتے ہیں۔ کسی زمانے میں ان کے دو کتے 'بادل' اور 'بجلی' کے نام سے پورے الٰہ آباد میں مشہور تھے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ فاروقی کتوں کی نفسیات سے خوب اچھی طرح واقف ہوں گے۔ کتے اور گھر کے مکینوں میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ کتا گھر کے باہر کھڑا، بیٹھا ہر آتے جاتے پہ بھونکتا رہتا ہے، اس کا کام ہر نامعلوم شخص پر بھونکنا ہوتا ہے، چاہے وہ اس گھر کی چھت مرمت کرنے آیا ہو یا باتھ روم کے chock up کو درست کرنے کے لیے، ظاہر ہے یہ دونوں کام مکینوں کے فائدے سے وابستہ ہیں۔ لیکن یہ بات سوچنے والی ہے کہ

کہیں ہم گھر کے باہر بیٹھنے والے اور ہر اس شخص پر زبان کھولنے والے تو نہیں بن گئے جو اس گھر کی اچھائی چاہتا ہو؟ کیا وجہ ہے کہ اپنی ذات کو چھوڑ کر ہم ہر اس ذات پر لپکتے ہیں جو ہمیں ناگوار گزرنے والی بات کہہ ڈالتا ہے، خواہ وہ ہمارے فائدے کی ہی کیوں نہ ہو؟ ذرا فاروقی صاحب پلٹ کر اسی ہندوستانی مسلمان کے ماضی میں جھانکیں تو انھیں وہاں سنگھ پریوار، بی جے پی اور کوئی رام چندر گوہا نظر نہیں آئے گا بلکہ وہ خود کو اپنے ہی پیشواؤں کے ساتھ پائیں گے۔ ذرا دیکھیے، آپ کے 'اپنے' آپ کی 'شناخت' کیا قائم کر رہے ہیں؟ ریڈیو حرام ہے۔ تصویر حرام ہے۔ ویڈیو حرام ہے۔ لاوڈ اسپیکر حرام ہے۔ پینٹ شرٹ حرام ہے۔ کیپ حرام ہے۔ جمہوریت کفر ہے۔ علی گڑھ یونورسٹی کفر کا اڈہ ہے۔ نامق کمال اور خیر الدین پاشا والی بات ابوالکلام آزاد نے کی تو دھتکارے گئے۔ سید حسین مدنی نے جدید ریاست کے تناظر میں ہی کہا تھا مذہب سے نہیں، قوم وطن سے بنتی ہے۔ اس نقطۂ نظر کے جواب میں حضرت علامہ اقبال نے جواب میں کیا الزام عائد کیا؟ یاد ہے وہ فارسی شعر یا دوہراؤں؟ مولانا عبیداللہ سندھی نے جمہوریت اور سیکولرازم کے محاسن گنوائے تو اپنے وقت کے ایک سنجیدہ شیخ الاسلام نے فرمایا سندھی صاحب دراصل ذہنی توازن کھو چکے تھے۔ لاحول ولاقوۃ۔ ارے نہیں نہیں، اصلاح معاشرہ سے بدکنا صرف ماضی کا قصہ نہیں بلکہ یہ تو اب تک ہمارا وظیفۂ حیات بنا ہوا ہے۔ کیا آپ کو گذشتہ دنوں بابری مسجد کے تعلق سے مولانا سید سلمان حسینی ندوی کا بیان اور اس بیان پر مسلمانوں کا غصہ نظر آیا تھا؟ کیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے بجائے ان کی تجویز پر سر جوڑ کر بیٹھنے کے انھیں بورڈ سے معزول نہیں کر دیا؟ رکیے رکیے، کیا آپ نے کچھ دنوں قبل شیعہ وقف بورڈ کے چیئرمین وسیم رضوی کا حشر نہیں دیکھا تھا جب انھوں نے مدرسے کے خلاف بیان دیا تھا؟ (اسلامی مدرسوں کے تعلق سے زیر نظر شمارے میں ہی ارجمند آرا کا نہایت ہی اہم اور تفصیلی مضمون شامل ہے) سوال اٹھتا ہے کہ کیا ہم کسی متنازعہ مسئلہ پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور و فکر کرنا بھول چکے ہیں، اور صرف بیان کنندہ کی کردار کشی ہی ہماری قومی شناخت بن چکی ہے؟

مسلم پرسنل لا بورڈ نے تو خیر عدالت کو اپنا تحریری موقف دے دیا کہ مسلمان عورت کی عقل مسلمان مرد سے آدھی ہوتی ہے، اس لیے طلاق کے سلسلے میں عورت کی مرضی کو اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ آپ کی چہیتی کانگریس نے اس حلفیہ بیان کی حمایت کی۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ نہایت ہی قابل قدر، مشفق اور 'شب خون' کو جاری رکھنے والی محترم شخصیت یعنی مرحومہ جمیلہ فاروقی کی عقل آپ سے آدھی تھی؟ اگر مرحومہ کے ذکر سے آپ کی دل آزاری ہوئی ہو تو معافی کا خواستگار ہوں لیکن چونکہ خود آپ نے اپنے مضمون میں اپنے اہل خانہ جس میں آپ کے والد سے وابستہ کئی یادوں کو مقتبس کیا ہے، سو مجھے حوصلہ ملا کہ میں آپ کی یادوں کے شبستان کو مزید منور کر دوں۔

عرض مدعا صرف اتنا ہے کہ جہاں بھی اور جب بھی کسی نے اصلاح معاشرہ کی بات کی، اس میں سنگھ پریوار کی سازش اور یہودی ایجنڈا نظر آجاتا ہے، کفر کے فتوے صادر ہونے شروع ہو جاتے ہیں، کردار کشی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، پھر خواہ وہ شاہ ولی اللہ ہوں، عبیداللہ سندھی ہوں، سرسید ہوں یا مولانا سلمان ندوی۔ میں پوری ذمہ داری سے کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کے تمام مسائل کی وجہ خود آپ ہیں، آپ خود کو چونکہ

ناقابل تسخیر اور ناقابل اصلاح تسلیم کر چکے ہیں، لہٰذا اپنے گریبان میں جھانکنے اور اپنا محاسبہ خود کرنے کی کبھی آپ کو نہیں سوجھتی، ہر دوست دشمن نظر آنے لگتا ہے، اس لیے آپ کو ہرش مندر اور اپوروانند جیسوں کی تلاش رہتی ہے، رام چندر گوہا جیسے لوگ آپ کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں۔ وولٹیئر نے بالکل درست کہا تھا: ''ان احمقوں کو آزاد کرانا مشکل ہے جو اپنی زنجیروں کی عزت کرتے ہیں۔''

فاروقی کے مضمون کے تین مرکزی نکتے ہیں، (۱) آزادی کے بعد کا ہندوستانی مسلمان، (۲) فرقہ وارانہ فسادات (۳) اور مسلمانوں کی تعلیم و روزگار کا وہ تجزیہ جو گذشتہ پچاس سالوں میں ایک کلیشے اختیار کر چکا ہے، جب کہ صورت حال کافی بدل چکی ہے لیکن 'جگالی' بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔ خیر، اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے فاروقی کے برعکس آزاد ہندوستان میں آنکھیں کھولیں۔ ظاہر ہے فاروقی نے جدوجہد آزادی اور جنگ آزادی، تقسیم اور پھر اس کے بعد نئے نویلے آزاد ہندوستان کی دنیا کے جدید نقشے پر پاؤں جمانے کی کوشش کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ میری نسل اکتسابی ہے، لہٰذا براہ راست فاروقی سے میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا آزادی سے پہلے اور اس کے بعد مسلمان امت واحدہ کی شکل میں تھے؟ کیا تقسیم کا واحد سبب مذہب تھا یا اس میں اشراف و اجلاف کی ذہنی اور سماجی کشمکش بھی شامل تھی؟

کون نہیں جانتا کہ جس وقت ہندوستان پر انگریزوں نے بتدریج قبضہ کیا، اس وقت ہندوستان پر مسلم اشرافیہ کی حکومت تھی۔ مختلف نسلوں کے مسلمان (ترک اور ایرانی) اور سلطنت دہلی اور مغلوں کی شکل میں مسلم خاندان گذشتہ چھ سات سو سال سے ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے۔ کئی علاقوں (جو پاکستان کا حصہ بنے) میں مسلمان ویسے ہی اکثریت میں تھے اور یہاں پر جو ہندو کلچر تھا، اس پر بھی مسلمانوں کی علمی اور ثقافتی چھاپ نمایاں تھی۔ کئی ایسے علاقے بھی تھے جو براہ راست مسلمانوں کے کنٹرول میں نہیں تھے لیکن اس کے باوجود ان پر مسلمانوں کے اثرات تھے کیوں کہ وہاں پر اشرافیہ میں مسلمان بھی شامل تھے اور آبادی میں مسلمان اقلیت کے طور پر بھی موجود تھے جس کی وجہ سے خوراک، فنون لطیفہ، تعمیرات حتیٰ کہ مذہبی فکر میں بھی مسلمانوں کے ملے جلے اثرات شامل تھے۔ تقریباً ایک صدی تک ہندوستان میں مذہبی شناخت تقسیم کا باعث رہی۔ ہندوستان کو اس وقت بیرونی طور پر سلامتی کے جن چیلنجوں کا سامنا ہے، ان کے حوالے سے کسی بھی قسم کی فیصلہ سازی میں مسلمانوں کے اس کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو ان ملکوں کے قیام میں شامل ہے جن پر جنوبی ایشیا مشتمل ہے۔ کیا وجہ ہے کہ مسلمان کبھی دلتوں کے حقوق کے لیے اس طرح اکٹھا نہیں ہوئے، جس طرح، جنتر منتر میں گئو رکھشکوں کی مذمت اور ہندوستانی سرکار سے مسلمانوں کے جان و مال کی ضمانت کو یقینی بنانے کے لیے "Not in my name" کے بینر تلے ہندوؤں کا احتجاج نظر آتا ہے؟ خیر، آپ دلتوں کے حقوق کے لیے آواز کیوں اٹھائیں گے، آپ تو خود مسلم اشرافیہ کے نمائندے ہیں۔ آپ کے تمام تعلیمی، سماجی اور سیاسی منصوبے صرف مسلم اشرافیہ کے مفادات کو تحفظ دینے کے لیے رہے ہیں۔ اسی شمارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی ''آپ بیتی'' کا وہ باب پڑھ لیں جو ''ہمارے آبا و اجداد'' کے عنوان سے شریک اشاعت ہے۔ مزید پڑھنا چاہتے ہیں تو Dr. Ambedkar Centre for Exclusion Studies

(ACESTA) Tansformative Action & کے ڈائریکٹر خالد انیس انصاری کا مضمون "It's not just religion, it's also caste" پڑھ لیں جو آپ کے مضمون سے ایک ہفتہ قبل اسی 'انڈین ایکسپریس' کے ۲۹ مارچ ۲۰۱۸ کے ایڈیشن میں شائع ہوا تھا۔

مضمون خاصا طویل ہوتا جارہا ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ فاروقی صاحب اور ان کے ہم خیالوں کے تمام تر ددات کا آج ہی تصفیہ ہوجائے، اگرچہ موضوع کا ہر نکتہ تفصیل طلب ہے اور کئی سروے رپورٹ اور ہر نکتے پر بیسیوں کتابوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے لیکن چونکہ فاروقی صاحب خود خاصے پڑھے لکھے آدمی ہیں، لہٰذا صرف کچھ بنیادی باتوں کی جانب ان کی توجہ مبذول کرانا مقصود ہے، باقی وہ خود جانتے ہیں کہ میں کن حوالوں سے باتیں کر رہا ہوں۔

بہرحال، میں یہ عرض کرنا چاہ رہا تھا کہ ہندوؤں کے جذبات کو صرف ہندو پاک کے درمیان ہونے والے کرکٹ میچ سے سمجھنا درست نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے آپ کو ہندوستانی مسلمانوں کے تاریخی اور ماضی قریب کے رویوں پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔ آپ گجرات اور بھاگلپور کی جگالی خوب کرتے ہیں، بلاشبہ یہ دونوں سانحے بلکہ بابری مسجد کا انہدام اور اس کے بعد ہونے والے فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات، سب جمہوریت، انسانیت اور سیکولرازم پر بدنما داغ ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا انسان دوست ہو جو اس کی مذمت نہ کرے لیکن اسے مسلمانوں کی منصوبہ بند نسل کشی سمجھنا غلط ہوگا۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ اسی سرزمین میں تیمور نے کھوپڑیوں کے مینار بنائے تھے؟ کیا آپ کو وہ نادر شاہ یاد ہے جس نے اپنے ہی ہم مذہبوں کے خون سے دہلی کی گلیاں سرخ کردی تھیں؟ محمد غزنوی اور محمد بن قاسم کون تھے؟ آپ کہہ سکتے ہیں جیسا کہ لوگ اکثر صفائیاں پیش کرتے رہے ہیں کہ ان کی حرکتوں کا موجودہ سیکولر ہندوستان یا آج کے ہندوستانی مسلمانوں سے کیا تعلق؟ لیکن آپ سے بھلا بہتر کون جان سکتا ہے کہ کسی معاشرے کا ماضی اس کے اجتماعی لاشعور کا حصہ ہوتا ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے۔ آج تک آپ خود اس ملک میں ۹۰۰ سالہ اپنی شہنشاہی بھول نہیں پائے، آج تک آپ کے ہیرو وہی لٹیرے ہیں، آج تک آپ تاریخی حقائق کو جھٹلانے کے لیے ان کا تاویلات سے دفاع کرتے رہتے ہیں، آج تک آپ کی تخلیقات میں اس 'سنہرے ماضی' کی بازگشت صاف سنی جاسکتی ہے۔ تو پھر آپ ہندوؤں سے کیوں یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنا ماضی بھول جائیں؟ آپ ان سے کیوں یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے دل سے ان سیاہ یادوں کو کھرچ کر پھینک دیں، جب کہ آپ اپنے شاندار ماضی کی غلام گردشوں کی سیر کرتے رہیں؟

تقسیم ہند یہاں کی اکثریت کے دلوں پر پر ایک بڑا زخم تھی جس کے نشان مٹنے کے لیے صدیاں درکار ہوتی ہیں اور پھر مسلمانوں نے اسے مٹانے کی کوئی خاص کوشش بھی نہیں کی بلکہ اپنی بودی تاویلات سے اپنے بزرگوں کی غلطیاں اب تک چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں، جیسا کہ خود فاروقی نے بھی اپنے زیر بحث مضمون میں کوشش کی ہے۔ ہندو 'قیام پاکستان' کا کرب آج بھی اسی طرح محسوس کرتا ہے، جس طرح مسلمان 'قیام اسرائیل' کے زخم کی ٹیس نہیں بھلا پایا ہے جب کہ قیام پاکستان کے بعد ہندوستان کی یہ کشادہ قلبی تھی کہ

اس نے پاکستان کے وجود کو تسلیم کرلیا، اس کے برخلاف اب تک اسرائیل کے وجود کو قبول کرنے سے تمام مملکت ہائے اسلامیہ انکاری ہیں۔ سوال اٹھتا ہے کہ ایک ہی طرح کی عمل جراحی پر دو متضاد دو موقف کیوں کر ہوسکتے ہیں؟ اس نفسیاتی اور ثقافتی خلیج میں بتدریج اضافہ کے سبب اگر ایک طبقہ مسلمانوں کو لے کر شبہے کا شکار ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان مشترکہ قومی شناخت کی بنیاد پر قائم قومی وحدت کے ساتھ پوری طرح مخلص نہیں ہیں تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ جو ہندو احیا پرستی کی آپ بات کر رہے ہیں اور آج ہم ہندوستان میں ہندو فرقہ واریت کا یہ جو مکروہ چہرہ دیکھ رہے ہیں، وہ راتوں رات آسمان سے نازل نہیں ہوا، اس کے کئی اسباب میں ایک سبب مسلمانوں کی نرگسیت اور ان میں علیحدگی پسندی کے وہ رجحانات تھے جو آزادی سے کافی پہلے ردعمل کی زمین ہموار کر رہے تھے۔ مشیر الحق صاحب کی کتاب ''آزادی کے بعد برصغیر کے مسلمان'' یا پھر غلام کبریا کی ''آزادی سے پہلے مسلمانوں کا ذہنی رویہ'' آج کی ہندو فرقہ پرستی کے پس منظر کو سمجھنے میں مدد کرسکتی ہیں۔ یہ موضوع اتنا اہم اور حساس ہے کہ اس پر صرف سنگھ پریوار کا راگ الاپ کر مسلمانوں کو خوش تو کیا جاسکتا ہے لیکن تاریخ سے انصاف نہیں کیا جاسکتا اور نہ اصل مرض کی تشخیص کی جاسکتی ہے۔ بات طویل ہوجائے گی، اس لیے صرف نظر کرتا ہوں کہ پھر کبھی اس موضوع پر الگ سے گفتگو کرنے کا موقع تلاش کرلوں گا۔

بلاشبہ ہندوستانی مسلمانوں کے کچھ سنگین مسائل ہیں، انھیں کچھ مشکلات درپیش ہیں لیکن کسی مذہبی فرقے کی حالت کو جانچنے کے لیے یہ کوئی درست معیار نہیں کہ وہ مشکلات ومسائل سے خالی ہو، کیوں کہ موجودہ دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اس دنیا کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ یہاں ہمیشہ 'عسر' اور 'یسر' دونوں موجود رہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو زندگی کی جدوجہد ہی سرے سے ختم ہوجائے گی اور جس سماج سے زندگی کی جدوجہد ختم ہوجائے، وہاں زندہ انسانوں کا باغ نہیں اُگتا، بلکہ مردہ انسانوں کا قبرستان وجود میں آتا ہے۔

مولانا وحیدالدین خاں کے فلسفۂ زندگی کا میں کوئی خاص بڑا معتقد کبھی نہیں رہا، لیکن ان کی کچھ باتیں لائق غور ہیں، مثلاً مولانا موصوف کہتے ہیں، ''یہودیوں نے اس حقیقت کو جان لیا کہ جب وہ اقلیت میں ہیں تو ان پر ایک بہت بڑی تاریخی اور سماجی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور وہ یہ کہ وہ اکثریت سے دوگنا زیادہ محنت کریں۔ یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز محنت اور دانش مندی ہے، خواہ یہودی ہو یا غیر یہودی۔ کوئی عام امت ہو یا اخیر امت۔ ہر ایک کو ایک ہی امتحان میں کھڑا ہونا ہے۔ یہاں کسی کے لیے بھی اس معاملہ میں کوئی استثنا نہیں۔'' مولانا کی اس بات سے میں متفق ہوں، یہ دنیا ہر شخص اور ہر قوم کے لیے ایک امتحان گاہ ہے، کوئی بھی آئیڈیل معاشرہ کہیں نہیں پایا جاتا۔ ایک دوسرے کے درمیان نزاع اور کشمکش کی صورتیں ہر جگہ ملیں گی۔ ایسے واقعات یک قومی سماج میں بھی پیش آئیں گے اور دو قومی سماج میں بھی۔ امریکہ میں کالوں اور گوروں کے درمیان جو تصادم ہوا، اس کی سنگینی سے کون واقف نہیں؟ پاکستان میں احمدی، عیسائی، شیعہ اور ہندو اقلیت میں ہیں، وہاں کوئی سنگھ پریوار نہیں ہے لیکن وہ لسانی اور مسلکی متشدد تعصب کے اعتبار سے پوری دنیا کے لیے عبرت کا نمونہ بنا ہوا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کو بتانے کے لیے عام طور پر جو چیز پیش کی جاتی ہے، وہ

سرکاری ملازمتوں کا معاملہ ہے۔ مسلم اخبارات، رسائل، رہنما اور دانشور ہمیں اعداد وشمار دکھاتے ہوئے سرکاری ملازمتوں میں عددی تناسب کے کم حصے کی شکایت کرتے ہیں۔ مردم شماری کی رپورٹ دکھا دکھا کر مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کی آبادی کے تناسب کے اعتبار سے سرکاری ملازمتوں میں ان کی حصہ داری کم ہے لیکن ان میں سے کوئی یہ نہیں سوچتا کہ مسلمانوں کی نصف آبادی عورتوں پر مشتمل ہے اور عام طور پر مسلمان اس کو پسند نہیں کرتے کہ ان کے گھروں کی خواتین سرکاری دفتروں میں جا کر کام کریں۔ اگر عورتوں کا یہ تناسب ان اعداد وشمار سے حذف کر دیا جائے تو نتیجہ زیادہ مایوس کن نظر نہیں آئے گا۔ دوسری بات یہ کہ سرکاری ملازمتوں کا تعلق حکومت کے سیاسی مفادات سے وابستہ ہوتا ہے۔ مثلاً، پاکستان کے سندھی مسلمانوں کو اپنی حکومت سے شکایت ہے کہ مرکزی حکومت کی ملازمتوں میں پنجابی مسلمان اپنے عددی تناسب سے بہت زیادہ حصہ پر قابض ہیں۔ صدام حسین کے دور کے عراق میں بیشتر اعلیٰ سرکاری ملازمتیں صدر کے قبیلہ کے افراد کو حاصل تھیں۔ ایران میں اعلیٰ سرکاری مناصب پر زیادہ تر شیعہ فرقہ کے افراد کو غلبہ حاصل ہے۔ سنی فرقہ کے افراد کی ایک بڑی تعداد ایران کی سرکاری ملازمت سے محروم ہے۔ یہی حالت دوسرے ملکوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ ہندوستان میں بھی یہ مسئلہ مختلف سطحوں پر موجود ہے لیکن یہ فرق صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نہیں بلکہ ہندوؤں اور ہندوؤں کے درمیان بھی ہے، مثلاً اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں اونچی ذات کا تناسب نچلی ذات کے مقابلے میں کافی زیادہ ہے۔ آزادی سے پہلے ریاست حیدرآباد میں سرکاری ملازمتیں زیادہ تر مسلمانوں کو دی جاتی تھیں، ہندوؤں کا حصہ سرکاری ملازمت کے شعبہ میں بہت کم تھا۔ اس کے باوجود ریاست حیدرآباد کے ہندو معاش کے شعبوں میں ریاست کے مسلمانوں سے بدرجہا بہتر تھے، کیوں کہ وہاں کے ہندو ریاست کی بیشتر تجارتوں پر قابض ہو گئے تھے، انھوں نے ملازمت کے شعبے میں جو کھویا تھا، اسے تجارت کے ذریعہ حاصل کر لیا۔ صنعتی انقلاب کے دور میں روزگار کے پھیلاؤ کی بنا پر اب یہ سرے سے ممکن ہی نہیں رہا کہ کوئی قوم یا حکومت کسی خاص گروپ کو خوشحال بننے سے روک سکے، البتہ اس گروہ کی اپنی بے عملی یا نادانی اسے ان نعمتوں سے محروم رکھ سکتی ہے۔ آپ اردو کے اخباروں اور کمیونسٹوں کے سروے کو چھوڑ کر ذرا خود اپنے محلے یا آبائی قصبوں اور شہروں کا دورہ کر کے دیکھیں کہ آزادی سے پہلے جو مسلم گھرانے موجود تھے، ان کی حالت اور ان کی اولاد کی موجودہ حالت کا موازنہ کریں تو علم ہو جائے گا کہ انھوں نے معاش، تعلیم اور طرز رہائش کی بنیاد پر کتنی ترقی کی۔ پھر آپ ذرا آزادی سے پہلے مسجدوں اور مدرسوں کی تعداد کا آزادی کے بعد کی تعداد سے موازنہ کر لیں تو آپ کو ان کے اضافے کے تناسب سے آگاہی ہو جائے گی۔ مذہبی تنظیموں کا بھی جائزہ لے لیں، دیوبند اور تبلیغی جماعت کے پھیلاؤ میں سیکڑوں گنا اضافہ ہوا ہے۔ یہ جو جگہ جگہ ہر روز کہیں نہ کہیں مسلمانوں کی بڑی کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں، ابھی گذشتہ دنوں مالیگاؤں میں ہی ایک عظیم الشان اجتماع ہوا جس میں ایک اندازے کے مطابق پانچ کروڑ روپے خرچ ہوئے، پھر بھی فاروقی صاحب مسلمانوں کی غربت کا ذکر رقت آمیز انداز میں کر رہے ہیں، اب کیا بچے کی جان لیں گے؟

میرے خیال میں یہ فاروقی صاحب کا موضوع نہیں ہے، وہ اس موضوع پر بھی ادبی تنقید کے اصولوں کا اطلاق کر رہے ہیں۔ انھیں سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں نسلی ثقافتی لسانی اعتبار سے ہم آہنگی یا یک رنگی نہیں پائی جاتی، بلکہ ان میں فرقہ وارانہ، علاقائی، ثقافتی اور ذات پات کا فرق بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کے مقابلے کیرل کے مسلمانوں میں خواندگی کی شرح زیادہ ہے، اسی طرح اتر پردیش اور مہاراشٹر کے مسلمانوں کے مقابلے کیرل کے مسلمانوں میں خاندانی منصوبہ بندی کی شرح بھی زیادہ ہے۔ اسی طرح گجرات کے تاجر پیشہ بوہرے، میمن اور کھوجے دوسرے عام مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ خوشحال ہیں۔ لہٰذا ہم اجتماعی طور پر ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی پسماندگی کا ذکر ایک سانس میں اس طرح نہیں کر سکتے جس طرح فاروقی کر رہے ہیں۔ وقف بورڈ کی بدعنوانیوں کا جو حال ہے، سب کو پتہ ہے۔ شاید فاروقی صاحب سے بھی نہ چھپا ہوگا کہ دہلی میں قیمتی املاک بدعنوان حکام کے ساتھ مل کر فائیو اسٹار ہوٹلوں کو کوڑیوں کے مول کس طرح دیا گیا۔ البتہ ایک اچھی مثال کرناٹک صوبہ کے گلبرگہ شریف کی انتظامیہ نے قائم کی کہ درگاہ سے ہونے والی آمدنی سے اس نے تعلیمی ادارے قائم کر دیے ہیں۔ اگر تروپتی مندر کے متولی اس کی آمدنی سے ایک یونیورسٹی چلا سکتے ہیں تو پھر اجمیر شریف کی درگاہ کے متولی مسلمانوں کے لیے ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟

خود آپ اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو لے لیں، کیا آزادی کے بعد واقعی آپ بھی دیگر مسلمانوں کی طرح 'marginalised' رہے ہیں؟ آپ نے اپنے مضمون میں ہمیں خود بتایا، ''۱۹۵۱ میں میرے والد گورکھ پور میں شعبۂ تعلیم میں ایک معمولی ملازم تھے۔'' پوچھنا یہ تھا کہ ایسے دور میں جب مسلمانوں کو، بقول آپ کے ہر شعبے میں پیچھے دھکیلا جا رہا تھا، آپ کی تعلیم، ملازمت اور ترقی میں ہندو عصبیت آڑے کیوں نہ آئی؟ آپ تو ماشااللہ ایک اہم سرکاری عہدے پر بھی فائز رہے، آپ کی لائق بیٹیاں بھی اپنی اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی بنا پر یونیورسٹی میں پڑھا رہی ہیں؟ سنا ہے کہ الہٰ آباد میں ہی آپ کا ایک نہایت معیاری اور عالیشان انگریزی اسکول چل رہا ہے جس کا شمار شہر کے چنندہ اسکولوں میں ہوتا ہے۔ میری تلخ نوائی کو اگر آپ درگزر کرنے کو تیار ہوں تو میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ اس طرح کے مسلسل تجربات کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ نام نہاد مسلم دشمن طاقتیں نہیں ہیں بلکہ خود مسلمانوں کے نام نہاد دانشور اور رہنما ہیں۔ یہ لوگ خود اپنے معاملات نہایت ہوشیاری اور حکمت عملی کے ساتھ حل کیے ہوئے ہیں لیکن جب وہ پریس اور دیگر سماجی پلیٹ فارم سے مسلمانوں کے بارے میں رائے زنی کرتے ہیں تو وہ بالکل برعکس چیز کی خبر دیتے ہیں۔ انھیں خود کے لیے اور اپنے بچوں کے لیے اسی ملک میں روشن مستقبل نظر آتا ہے جب کہ قوم کے بچوں کے لیے صرف حاشیہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ آپ کا پورا مضمون مایوس کن باتوں سے بھرا ہوا ہے، کاش آپ اس مضمون میں ہمیں یہ بتاتے کہ آپ نے کس طرح اسی ہندوستان میں تعلیم حاصل کر کے پبلک سروس کمیشن کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی اور اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے اور یہ بھی بتاتے کہ کس طرح آپ کی بچیاں بھی اسی ہندوستان میں پڑھ کر ہندوستان اور امریکہ کی

یونیورسٹیوں میں پہنچ گئیں اور اب وہ شاندار مستقبل کی طرف اپنا سفر طے کر رہی ہیں؟ شاید آپ کی اس کامیابی بھری داستان سن کر 'marginalised' مسلمانوں کو وہ راستہ نظر آجاتا جس کے بند ہونے کا آپ اپنے مضمون میں ماتم کر رہے ہیں۔

یورپی نوآبادیاتی نظام تو کئی لحاظ سے اپنی نوآبادیوں کے لیے ایک نعمت ثابت ہوا۔ مثلاً یہ برطانوی راج ہی تھا جس نے ہندوستان میں جمہوریت، آئین، قانون کی بالادستی اور جدید علوم وغیرہ کو متعارف کیا۔ اگر وہ نوآبادیاتی نظام برا بھی تھا تو بھی اس کا شکار صرف مسلمان ہی نہیں رہے بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگ مثلاً ہندو، بدھسٹ، سکھ وغیرہ بھی اس کے زیر اثر رہے ہیں۔ لیکن آج ہندو یا بدھسٹ تو یوروپ میں ہنگامہ آرائی نہیں کر رہے، وہ تو وہاں دہشت گردی کی کاروائیوں میں ملوث نہیں ہیں۔ مسلم دنیا ہی برطانیہ یا یورپ کو اپنے ہر مسئلے کا ذمہ دار کیوں ٹھہراتی ہے؟ غور طلب بات ہے کہ فاروقی نے کئی جگہ 'مسلم دہشت گردی' کی اصطلاح کو طنزاً استعمال کیا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ بھی دوسرے apologists کی طرح پوری دنیا میں ہونے والے دہشت گردانہ واقعات کو یہودی اور امریکی سازش ہی قرار دیتے ہوں اور مسلم ناموں کی دہشت گرد تنظیموں کو بھاڑے کے مجاہدین ہی تسلیم کرتے ہوں، چونکہ شاید اس وقت دنیا کی منڈی میں مسلمان ہی وہ اکلوتی قوم ہے جنھیں کوئی بھی ایرا غیرا کرائے پر حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن خیر جانے دیجیے، فاروقی سے پوچھنا یہ تھا کہ ممبئی کے لوکل ٹرینوں میں بم دھماکے کرنے والے کون تھے؟ ممبئی کے ہی ہوٹل تاج اور پارلیامنٹ میں ہونے والے حملوں کے پیچھے یہودی تھے، امریکی تھے یا سنگھ پریوار کے لوگ؟ اچھا یہ جو دو سال پہلے بریلی میں قبروں سے دیوبندیوں کی لاشیں نکال نکال کر باہر پھینکی گئیں تھیں، یقیناً ان میں بھی کوئی مسلمان نہ رہا ہوگا؟ فاروقی کے ہی صوبہ اتر پردیش میں جس عالم دین نے آئی ایس آئی ایس کے بدنام زمانہ دہشت گرد ابوبکر بغدادی کو اعلانیہ خلیفۃ المسلمین تسلیم کیا تھا، ممکن ہے کہ انھوں نے امریکہ کے ایما پر ایسا کیا ہوگا؟ مجھے شک ہے کہ فاروقی جنوبی ہند کے بعض شہروں میں داعش کی حمایت میں 'marginalised' مسلمانوں کے نکلنے والے جلوس کو بھی سنگھ پریوار کی سازش گردانتے ہوں گے۔ ہندو فرقہ پرستوں کے بیانات کو فاروقی بڑے مزے لے لے کر مقتبس کرتے ہیں لیکن مجال ہے کہ مجلس اتحادالمسلمین کے اسدالدین اویسی اور ان کے بھائی اکبرالدین اویسی کے جارحانہ اور متعصبانہ بیانات کا ذکر کر جائیں۔

فاروقی صاحب شاکی ہیں کہ جن سیکولر قوتوں کا ہندوستانی مسلمانوں کو کل تک سہارا تھا، وہ اب نہیں رہا۔ یہ تو میرے لیے انکشاف ہے۔ اب فاروقی صاحب ہی میری معلومات میں اضافہ کر دیں کہ گجرات سے لے کے گئو کشی تک کے معاملات میں مسلمانوں کی جانب سے کون لڑ رہا ہے؟ تیستا سیتلواڈ، ہربنس مکھیا یا جنتر منتر میں اکٹھے وہ ہزاروں کی تعداد میں 'Not in my name' کے بینر تلے پوری شدت سے احتجاج کرتے لوگ شاید مسلمان بلکہ مرد مومن ہی ہوں گے جن کی آواز سن کر پارلیامنٹ ہل گیا تھا اور ایک عوامی جلسہ میں وزیر اعظم نریندر مودی کو صاف لہجوں میں 'گئو رکھشکوں' کو 'اسمگلر' تک کہنا پڑا تھا۔ لیکن اصل سوال اٹھتا ہے کہ اس پورے منظر نامے سے ہندوستانی مسلمان کیوں غائب ہیں؟ کیا ہندو آپ کی رعیت

ہیں کہ وہی آپ کے حقوق کے لیے آوازیں اٹھائیں، آپ کی سلامتی کے لیے فرقہ پرستوں سے پارلیامنٹ سے لے کر عدالتوں تک لڑتے پھریں، آپ کے خودساختہ تحفظات کی پاسبانی کے لیے وہ سڑکوں پر نکل آئیں؟ اس کے برعکس آپ کا یہ رویہ کہ خود اپنی لڑائی میں شامل نہ ہوں، دوسروں کے مسائل سے تو خیر آپ کا کچھ لینا دینا ہی نہیں ہے؟ دلتوں اور پچھڑی ذاتوں پر صرف زبانی جمع خرچ کرنے والے آخر ان کے مسائل پر ان کے ساتھ سڑکوں پر کیوں نہیں اترتے؟ ابھی کچھ دنوں قبل مہاراشٹر کے لاکھوں کسانوں نے ناسک سے ممبئی کے آزاد میدان تک اپنے جائز حقوق کے لیے بھوکے پیاسے پیدل مارچ کر کے ریاستی حکومت کو ہلا دیا تھا۔ اس مارچ میں عورتیں اور بوڑھے بھی شامل تھے، اتنی لمبی مسافت میں کئی لوگ بیمار ہو گئے، آپ نے بھی اپنے رنگین ٹی وی سیٹ پر یہ سب کچھ دیکھا ہوگا لیکن کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ اس بے مثال احتجاج میں مسلمان کہاں غائب تھے؟ دوسری سب سے اہم بات یہ کہ آخر یہ کسان خود کو 'marginalised' کہہ کر پاکستان یا نیپال کی جانب کشش محسوس کیوں نہیں کرتے؟ چلیے، کسانوں اور دلتوں کو چھوڑیے، میرے ایک سوال کا جواب آپ پوری دیانت داری سے دینے کی کوشش کریں کہ کبھی آپ یا آپ کے ہم خیالوں نے مسلمانوں کے مسائل کے سوا عام ہندوستانی مسئلہ کو ایشو بنا کر ووٹ دیا ہے؟ آپ جس حق سے موجودہ مرکزی حکومت پر اپنے احسانات جتا رہے ہیں، کیا وہ آپ کے اور آپ کے مسلمانوں کے ووٹ سے مرکز میں اقتدار میں آئی ہے؟ اس کے برخلاف آپ لوگوں نے تو اسے اقتدار سے دور رکھنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا، اسے حاشیے میں پھینکنے کی کوشش میں آپ نے لنگڑی لولی سیاسی جماعتوں کو ووٹ دے ڈالا تھا، پھر آپ موجودہ سرکار سے کیوں توقع رکھتے ہیں کہ سب سے اچھے انگور کے گچھے آپ کے حصے میں آئیں؟ آپ تسلیم کریں یا نہ کریں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ آزادی کے بعد آپ اپنے خول میں سمٹے ہوئے لوگ ہیں، آپ کو ہندوستان کے عام مسائل سے کچھ لینا دینا نہیں، آپ کو صرف اپنے مسائل، اپنے حقوق اور اپنے تحفظ سے مطلب ہے۔

بہرحال، ایک بات کی تو میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ جو بات اب تک سنگھ پریوار اور فرقہ پرست طاقتیں ثابت نہ کر پائیں، چشم زدن میں آپ نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ آپ جب کہتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان پاکستان کی جانب کشش رکھتا ہے تو میں کنفیوژ ہو جاتا ہوں کہ کون سا پاکستان؟ کیا یہ وہی پاکستان تو نہیں جس میں احمدیوں کے سلام کرنے پر انھیں تین سال کی قانونی سزا ہو جاتی ہے؟ کیا یہ وہی پاکستان تو نہیں جہاں عیسائی جوڑوں کو زندہ آگ کے بھٹے میں پھینک دیا جاتا ہے اور پورا ماحول نعرۂ تکبیر کی گونج سے روحانی ہو جاتا ہے؟ کیا یہ وہی پاکستان نہیں جہاں ہندوؤں کی لڑکیوں کو وڈیرے سرعام اغوا کر کے پہلے ان کا ریپ کرتے ہیں، پھر انھیں کلمۂ شہادت پڑھا کر اپنے حرم میں ڈال لیتے ہیں؟ کیا یہ وہی پاکستان ہے جہاں شیعوں کے امام باڑوں پر خودکش حملے ہونا عام بات ہے؟ کیا یہ وہی پاکستان ہے جہاں اسکول کے معصوم بچوں کو گولیوں سے بھون دیا جاتا ہے؟ کیا یہ وہی پاکستان ہے جہاں یونیورسٹی کے طالب علم سرعام اپنے ساتھی طالب علم پر توہین مذہب کا الزام لگا کر گولی مار دیتے ہیں اور بعد میں اس کی لاش کا مثلہ بھی کرتے

ہیں؟ کیا یہ وہی جنت نظیر پاکستان ہے جہاں ایک گورنر کو دن دہاڑے اسی کا باڈی گارڈ اس لیے قتل کر دیتا ہے چونکہ گورنر نے ایک قانون کے وجود پر سوال اٹھایا تھا؟ کیا یہ وہی پاکستان ہے جہاں کے حریت پسند بلاگروں کو راتوں رات غائب کر دیا جاتا ہے؟ کیا یہ وہی پاک سرزمین ہے جہاں ایک ۱۴ سالہ مسلم بچی کو صرف اس لیے گولی کا نشانہ بنایا جاتا ہے چونکہ وہ پڑھنا چاہتی تھی؟ کیا یہ وہی پاکستان ہے جہاں کے وزیراعظم کو اپنی حکومت اور ایمان بچانے کے لیے مولویوں سے صرف اس لیے معافی مانگنی پڑتی ہے چونکہ اس سے اپنے ملک کی ہندو اقلیت کو ہولی کی مبارک باد دینے کا گناہ کبیرہ سرزد ہو گیا تھا؟ میں تھک چکا ہوں فاروقی صاحب، اب تو خدا کے لیے بتا دیں کہ آپ کس پاکستان کی بات کر رہے ہیں جو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے کشش رکھتا ہے؟ میں بھی آپ ہی کی طرح 'گر فردوس بروئے زمیں است ...' گنگنانا چاہتا ہوں بشرطیکہ مجھے بھی 'نشان امتیاز' مل جائے۔

آپ نے کچھ دنوں پہلے ایک بیان دیا تھا کہ آپ کو اردو اخباروں کو دیکھ کر متلی ہوتی ہے، بالکل درست کہا تھا لیکن آپ کا یہ مضمون پڑھ کر شکایت جاتی رہی، چونکہ جب برصغیر کا اتنا بڑا دانشور ایسی غیر ذمہ دارانہ بلکہ بچکانہ باتیں کرے تو اردو اخبار کس کھیت کی مولی ہیں، شکریہ اس بات کا کہ آپ کے مضمون نے میرے اس شک کو یقین میں بدل دیا کہ اگر ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں نہ ہوتے تو وہی سب کچھ کرتے جو فی الحال پاکستانی مسلمان اپنے یہاں اپنی اقلیتوں اور لبرلوں کے خلاف کر رہے ہیں۔

آپ نے اپنے کالم میں لفظ 'ہندو' کا ایسا خود ساختہ مفہوم نکالا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کو اس لفظ سے کتنی نفرت ہے۔ حالاں کہ آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ عربی و فارسی روایت میں ہندو کا مطلب ہے 'کالا' یعنی 'Nigger'۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان خود کو 'ہندو' نہیں کہلوانا چاہتے، حالاں کہ عرب ان کو یہی کہتے اور سمجھتے رہے ہیں۔ میں اس موضوع پر تفصیل میں نہیں جانا چاہتا، صرف ایک حوالہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر زحمت نہ ہو تو اپنی نہایت ہی شاندار ذاتی لائبریری میں سے خواجہ حسن نظامی کے سفر نامۂ حج کو نکال کر اس میں وہ اقتباس ڈھونڈنے کی کوشش کریں جس میں لکھا ہے کہ ہندوستانی حاجیوں کو دیکھ کر عدن کے عربوں نے ''الہنود! الہنود!'' کا نعرہ لگایا تھا۔ پھر اگر سر سنگھ چالک آپ سے یہی مطالبہ کرتے ہیں تو آپ خود کو 'marginalised' کیوں محسوس کرنے لگتے ہیں؟

اپنے مضمون میں فاروقی صاحب نے کچھ لطیفے بھی سنائے ہیں۔ اس سے پہلے مجھے علم نہیں تھا کہ مزاح کا میدان بھی آپ سے نہیں چھوٹا ہے۔ فاروقی ہندو وزیروں کے مذہبی عقائد کو بڑے مزے لے لے کر سناتے ہیں کہ فلاں نے نظریۂ ارتقا کو رد کر دیا اور فلاں نے گنیش جی کے ہاتھی سر سے انسانی جسم کی پیوند کاری کا جواز ڈھونڈ لیا وغیرہ۔ اب مجھے نہیں علم کہ ہندوستان کے اسلامی مدارس میں آدم و حوا پر مبنی نظریۂ تخلیق کو چھوڑ کب سے چارلس ڈارون کے نظریۂ ارتقا کو پڑھانا شروع کر دیا گیا ہے؟ حالاں کہ گذشتہ برس سنا تھا کہ ہارون یحییٰ کے ملک ترکی نے نظریۂ ارتقا کو اسکولی نصاب سے خارج کر دیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہندوستان کے اسلامی مدارس میں اب واقعۂ معراج کی بجائے 'تھیوری آف ریلٹیویٹی' پڑھائی جا رہی ہو۔ واللہ اعلم۔

فاروقی صاحب عمر اور علم کے جس مقام پر ہیں، مجھے گمان تھا کہ وہ اتنی چھوٹی سی بات تو سمجھتے ہی ہوں گے کہ ایمان اور معتقدات کا رشتہ عقل و منطق سے نہیں بلکہ انسان کی جذباتی وابستگی سے ہے جسے وہ دوسروں کے سامنے 'عقلیانے' کے لیے کسی حد تک بھی جا سکتا ہے، مثلاً نیل آرم اسٹرانگ کے چاند پر جانے کے واقعہ کو ہی لے لیجیے، جس کے بارے میں یہ افواہ گرم ہوئی کہ اسے چاند پر اذان کی آواز سنائی دی تھی، یہ بات کچھ اس طرح جنگل میں آگ کی طرح پھیلی کہ خود نیل آرم اسٹرانگ کو اپنے لیٹر ہیڈ پر اپنے دستخط کے ساتھ اسے رد کرنا پڑا۔ مجھے حیرت اس وقت نہیں ہوتی جب ایک عام آدمی ایسی حرکت کرتا ہے، میں اسے ہمدردی سے دیکھتا ہوں، لیکن افسوس اس وقت ہوتا ہے جب فاروقی صاحب جیسے اہل علم و دانش اپنے گریبان میں جھانکنے سے پہلے دوسروں کے معتقدات کا مذاق اڑانے کا کوئی موقع نہیں گنوانا چاہتے۔

بہرحال، میں فاروقی صاحب کو یقین دلانا چاہوں گا کہ مسلمان اقلیتیں غیر مسلم ممالک میں نہایت امن و سکون کی زندگی بسر کر رہی ہیں؛ اگر کہیں کوئی مسئلہ ہے تو وہ خود ان کا پیدا کیا ہوا ہے، جبکہ مسلم ممالک میں غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ انتہائی غیر انسانی سلوک ہو رہا ہے جس میں جدید مسلم ممالک جیسے ملائشیا، انڈونیشیا، پاکستان اور بنگلہ دیش بھی شامل ہیں۔

آخر میں فاروقی صاحب کی ہندوستانی مسلمانوں سے ہمدردی کو دیکھتے ہوئے درخواست کرنا چاہوں گا کہ وہ حاشیہ میں پڑی سسکتی مسلم عورتوں کے مسائل پر 'انڈین ایکسپریس' میں ہی کوئی مضمون لکھ دیں۔ مدرسے کے طلبا کی حالت زار اور مسلم رویے پر آپ نہیں بولیں گے تو کون بولے گا، چونکہ اگر کوئی دوسرا بولے گا تو اس پر سنگھ پریوار کا خفیہ ایجنڈا یا یہودی سازش کا الزام آئے گا۔ کیا ضروری ہے کہ زخم کو سہلا سہلا کر اسے ناسور بنا دیا جائے؟ یہ تو بڑی ظالمانہ بات ہوگی کہ محض اپنے معاشرے کے اختلاف کے ڈر سے ہم اس معاشرے کے علاج کی تدابیر تلاش کرنی ترک کر دیں اور صرف دوسروں کو تختۂ مشق بنا کر ہاتھ جھاڑ لیا کریں۔ لیکن فاروقی ایسی غلطی نہیں کریں گے چونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ کام جوکھم کا ہے، اچھے اچھوں کی دستار سلامت نہیں رہی تو وہ کس شمار قطار میں ہیں۔ لہٰذا سیف گیم یہی ہے کہ آپ اس معصوم اور بدقسمت قوم کی اشک شوئی کرتے ہوئے اس کے نام نہاد دشمنوں کو جی بھر کر گالیاں دیں اور اس سے کہیں کہ تمھارا اس میں کوئی قصور نہیں، تم یوں ہی سسکتے رہو، کسی دن پھر آ کر تمھارے آنسو پونچھ جاؤں گا۔

چلتے چلتے فاروقی صاحب کو ایک بری خبر سنانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی نئی نسل اپنی لڑائی لڑنا سیکھ چکی ہے۔ وہ اپنی روزی کمانا جانتی ہے، وہ فرقہ وارانہ مسائل سے نمٹنا جانتی ہے، اب اپنے ناعاقبت اندیش رہنماؤں کے مشوروں پر اپنی ترجیحات کا فیصلہ نہیں کرتی، چونکہ نئی ٹیکنالوجی نے اس کے سامنے سارے راز کھول دیے ہیں۔ یہ نسل تعلیم اور روزگار دونوں میں اپنی کفالت کر سکتی ہے۔ ٹھیک ہے، یہ حلقہ ابھی نسبتاً چھوٹا ہے لیکن اس کا دائرہ بتدریج بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ لہٰذا ہندو پاک کے درمیان ہونے والے کرکٹ میچ اور تعلیم و روزگار جیسے رٹے رٹائے موضوعات کے معیار پر ہندوستانی مسلمانوں کے رویوں اور ان کے مستقبل کا تجزیہ کر کے اپنا مذاق نہ اڑائیں۔ نئی نسل کے اس حلقہ کے لیے، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان؛ مندر

مسجد کا قضیہ، فرقہ پرست طاقتوں کے سیاسی شگوفے، گئوکشی، مسلم پرسنل لا بورڈ کے فیصلے، تین طلاق کا مسئلہ وغیرہ جیسے موضوعات اپنی اثر انگیزی کھو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک مکمل طور پر اقتدار میں آنے کے باوجود سنگھ پریوار ہندوستان کو ہندو راشٹر بنانے کا اپنا دیرینہ خواب نہ پورا کر سکا۔ ذرا سوچیے، آخر وہ کون سی طاقت ہے جو انھیں ایسا کرنے سے روکے ہوئے ہے، مقتدر اعلیٰ ہونے کے باوجود انھیں کس سے خطرہ ہے؟ اگر نریندر مودی لوک سبھا کا الیکشن جیتے تھے تو یاد رکھیے، انھوں نے 'سب کا وکاس' کا نعرہ دیا تھا، جس نے ہندوستان کی نئی نسل کو متاثر کیا تھا۔ اس نے مودی کے اس نعرے پر یقین کر لیا لیکن دو سال بعد ہی معاشی بدحالی کو دیکھنے کے بعد وہی نسل مودی کے خلاف کھل کر سوشل میڈیا میں بول رہی ہے، ان کا مذاق اڑا رہی ہے اور مختلف موقعوں پر سڑکوں پر اتر آنے سے بھی نہیں چوکتی۔ یاد رکھیے، یہاں بھی بیشتر مسلمانوں کا رویہ محض دفاعی ہے، جب کہ ہندوؤں کی نئی نسل اصولی جنگ لڑ رہی ہے۔ ممکن ہے کہ ۲۰۱۹ کا الیکشن پھر سے مودی ہی جیت جائیں، کیوں کہ الیکشن جیتنا ایک آرٹ ہے، آخر کانگریس بھی تو اپنی تمام تر نااہلی کے باوجود مدتوں مرکز میں اپنی حکومت بناتی رہی ہے، لیکن یہ طے ہے کہ مودی کو جو مقبولیت پہلی بار حاصل ہوئی تھی، اسے وہ کھو چکے ہیں اور اگر انھوں نے یہی رویہ برقرار رکھا تو بی جے پی کا بھی حال کانگریس کی طرح عبرت ناک ہوگا۔ ہندوستان کی مٹی کا بنیادی مزاج سیکولر ہے، خود ہندو مذہب کا اصل مزاج سیکولر ہے، لہٰذا فرقہ پرستی زیادہ دنوں تک اس مزاج سے لگا نہیں کھا سکتی۔

خودسری اور منافقانہ روش بدلنا ہوگی

علامہ محمد ظفر منصوری

اغیار سے ہمیں کیا گلہ ہو سکتا ہے جبکہ دین اسلام کا گلشن خود اپنوں نے اجاڑا ہے۔ مسلمان پر گمراہی اور کفر کے فتوے دینے والا، شیعہ کو کافر، بریلوی کو مشرک اور دیوبندی کو گستاخ رسول کہنے والا کوئی غیر مسلم نہیں بلکہ کلمہ گو خود ہیں۔ ذلت اور رسوائی کی اس تاریکی سے نکلنے کے لیے ہمیں ہر صورت اپنی خودسری اور منافقانہ روش بدلنا ہوگی۔

قسم ہے اس سچ کی، جسے سنا نہیں گیا

فرنود عالم

کل تک خبر تھی کہ اتر پردیش کے ہندو شہریوں نے اخلاق احمد کو اس افواہ پہ سنگسار کر دیا کہ اس نے گائے ذبح کی۔ آج خبر آتی ہے کہ گجرات کے الیکشن میں اہل پاکستان سے بات کرنے والا مردود قرار پا رہا ہے۔ اب اس حادثے پہ کیا بحث کریں؟ آئیں بنیادی بات کی طرف چلتے ہیں۔

سین یہ ہے۔ آپ ہندو ہیں۔ پاکستان میں رہتے ہیں۔ اقلیت میں ہیں۔ سماج تہہ در تہہ مذہب کی بحث میں الجھا ہوا ہے۔ عددی برتری جسے حاصل ہے، اسی کو خدا کے لہجے میں بولنے کا حق ہے۔ اندیشوں اور وسوسوں نے گھر کا رستہ دیکھ لیا ہے۔ خدشات قدم سے قدم ملا کر چل رہے ہیں۔ آپ خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگے ہیں۔ آخری امید کے طور پہ بھگوان کو پکار رہے ہیں۔ دعا کر رہے ہیں؛ ''اے بھگوان! کچھ بھی ہو، پاکستان کو ایک مذہبی ریاست بننے نہ دینا۔''

سین بدل گیا۔ آپ مسلمان ہیں۔ ہندوستان میں رہتے ہیں۔ اقلیت میں ہیں۔ سماج تہہ در تہہ مذہب کی بحث میں الجھا ہوا ہے۔ عددی برتری جسے حاصل ہے، اسی کو خدا کے لہجے میں بولنے کا حق ہے۔ اندیشوں اور وسوسوں نے گھر کا رستہ دیکھ لیا ہے۔ خدشات قدم سے قدم ملائے چلے جا رہے ہیں۔ آپ خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگے ہیں۔ آخری امید کے طور آپ کی نگاہ سیدھا عرش معلیٰ سے جا لگی ہے۔ دعا کر رہے ہیں؛ ''اے مولا! کچھ بھی ہو، ہندوستان کو کبھی ہندو مذہبی ریاست نہ بننے نہ دیجیو۔''

سین بدلا۔ آپ ہندو ہیں۔ ہندوستان میں رہتے ہیں۔ آپ اقتدار اس مذہب کو سونپ دینا چاہتے ہیں، جو آپ کی نظر میں فلاح کی تنہا ضمانت ہے۔

سین پھر بدلا۔ آپ مسلمان ہیں۔ پاکستان میں رہتے ہیں۔ آپ اقتدار اس مذہب کو سونپ دینا چاہتے ہیں، جو آپ کی نظر میں کامیابی کا حتمی پروانہ ہے۔

ہندو متوجہ ہوں۔ کیوں ڈرتے ہو اسلام سے؟ کیا یہ پرامن مذہب نہیں ہے؟ کیا گاندھی نے اسلام کا فلسفۂ امن تسلیم نہیں کیا؟ کیا ناں؟ پھر؟ لاشعور سے جواب آتا ہے!

''اسلام پہ کوئی بحث نہیں، مسلمان سے ڈر لگتا ہے صاحب۔''

اب مسلمان متوجہ ہوں۔ کیوں ڈرتے ہو ہندومت سے؟ کیا یہ پرامن مذہب نہیں ہے؟ کیا حضرت حسین مدنی نے ہندو مذہب کے فلسفۂ امن کو تسلیم نہیں کیا؟ کیا ناں؟ تو پھر؟ لاشعور سے جواب آتا ہے!

''ہندو مذہب پہ بحث نہیں، ہندو سے ڈر لگتا ہے صاحب۔''

اے خدواندان مذاہب وعقائد! تسلیم کیوں نہیں کرتے کہ اس قدر مذہبی تنوع کے ساتھ زمین نامی سیارے پہ زندگی بسر کرنا اب ممکن ہی نہیں ہے۔ عہد قدیم کے کسی عمرانی معاہدے میں نظم اجتماعی کا کوئی امکان موجود نہیں ہے۔

دل پہ ہاتھ رکھیے۔ اب بتایئے۔ کیا اہل مذہب کی ایسی کسی قطعیت اور حتمی لہجے کے ساتھ زندہ رہا جا سکتا ہے کہ جس میں کابل کی حافظ قرآن فرخندہ صرف اس لیے سنگسار کر دی جائے کہ اس نے تعویذ جلا دیا تھا؟ کیا عقیدوں اور ایقان پر ایسے اصرار کے ساتھ سانس لینا آسان ہے کہ جس میں اتر پردیش کے اخلاق احمد کو صرف اس افواہ پہ سنگسار کر دیا گیا کہ اس نے گائے ذبح کی تھی؟ کیا کسی ایسے الوہی تصور کے ساتھ جیا جا سکتا ہے کہ جس میں ممتاز قادری کو ہیرو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو؟ اور پھر ادھر دیکھیں، سلمان تاثیر کے سینے میں پورا 'برسٹ' صرف اس لیے اتار دیا گیا کہ ایک قانون پہ اس نے سوال اٹھایا۔ پھر 'برسٹ' چلانے والا ہیرو؟ پھر کیا جج، کیا وکیل، کیا ملا اور کیا صوفی؛ سبھی ہجوم در ہجوم اس کا ماتھا چومنے کو پہنچے؟ سوچتے کیوں نہیں؟ سوچو کہ خدائی کے ایسے تصور کے ساتھ سیاست میں در آنے سے کیا حاصل کہ جس میں انسانیت کے لیے خون کے چند قطروں کے سوا کچھ نہ ہو۔

کیا کیجیے صاحب۔ آؤ ایک ایسے معاہدے کی طرف جو اجتماعی تناظر میں خدا پہ نہیں، انسان پہ بحث کرے۔ یہ وہ بات ہے جس کو آپ کا عمل تسلیم کر چکا ہے۔ افسوس مگر یہ ہے کہ صرف تب اظہار کرتے ہو، جب خود پہ بن آتی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ اگر غلط ہوں، تو ہندو ہی بتا دے کہ ہندوستان میں اقتدار کا حق اگر کسی برہمن کو ہے، تو پاکستان میں سیکولر دانش کدوں کی آڑ میں سہمے سہمے کیوں کھڑے ہو؟ مسلمان ہی بتا دے کہ پاکستان میں اقتدار کا ضامن اگر منبر ہے، تو پھر ہندوستان میں سیکولرازم کے پردوں میں پناہ کیونکر لی ہوئی ہے؟

سنیے۔ جدید ریاست ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اس کے ہوتے آپ کے پاس چہرے پہ دوہرا نقاب رکھنے کے سوا چارہ نہیں۔ آپ کے اس دوہرے رویے کو اگر الفاظ دیے جائیں، تو عبارت کچھ یوں بنتی ہے کہ ''سماج میں صرف مشترک نکات پہ جیا جا سکتا ہے''۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ ایک مشترک چیز کیا ہے جسے نقطۂ ارتکاز تسلیم کیا جا سکے؟

کیا ہے؟ آپ ہی بتا دیں؛ صرف اور صرف انسانیت کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟

ہمارے آباواجداد

مولانا عبدالماجد دریابادی

'ہندوستان کے باسیوں میں ذات پات کی تفریق کے تانے بانے دو ہزار سال قبل دراوڑوں اور آریاؤں کے درمیان لڑائیوں سے جا ملتے ہیں۔ یہ جنگیں کم وبیش چار سو برس تک جاری رہیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے باسی عرب مسلمان تاجروں سے متعارف ہوئے اور بعدازاں اس علاقے کے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ انیسویں صدی کے ہندوستانی معاشرے میں مسلمانوں نے اپنے آپ کو اشراف، اجلاف اور ارذال (رذیل کی جمع) میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اشراف ذاتوں میں شیخ، سید، پٹھان اور مغل شامل تھے۔ اجلاف میں محنت کش طبقے جیسے جولاہے یا انصاری، جبکہ ان سے بھی بدتر طبقات مثلاً نائی، بھنگی، چمار اور کنجر وغیرہ ارذال میں شامل تھے۔ نچلی ذات کے افراد کو اچھا کھانا جیسے پلاؤ یا بریانی بنانے، تعلیم حاصل کرنے، اسلامی نام رکھنے اور کچھ مقامات پر تو پختہ مکان بنانے کی اجازت تک نہ تھی۔ پردہ صرف اشراف کی خواتین کے لیے مخصوص تھا، جبکہ دیگر طبقات کی خواتین کو پردے سے روکا جاتا تھا۔ اس دور کے کئی معزز مسلمانوں کے ذات پات کے موضوع پر خیالات تعصب سے بھرپور تھے۔

معروف عالم دین، محقق اور مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی ۱۶ مارچ ۱۸۹۲ کو دریاباد، ضلع بارہ بنکی، ہندوستان میں ایک قدوائی خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ بہت سی تنظیموں سے منسلک رہے۔ ان میں 'تحریک خلافت'، 'رائل ایشیاٹک سوسائٹی' (لندن)، 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی'، 'ندوۃ العلما' (لکھنؤ)، 'شبلی اکیڈمی' (اعظم گڑھ) کے علاوہ اور بہت سی اسلامی اور ادبی انجمنوں کے رکن تھے۔ عبدالماجد دریا آبادی نے انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی ایک جامع تفسیر قرآن لکھی ہے۔ آپ نے ۶ جنوری ۱۹۷۷ کو وفات پائی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی ''آپ بیتی'' بھی لکھی جس میں انھوں نے ایک باب میں اپنے آباواجداد کے ذہنی رویے اور اس مسلم معاشرے کی تصویر کو اپنی مانوس نثر میں مجسم کر دیا ہے۔ قارئین کی خدمت میں متذکرہ باب پیش خدمت ہے۔ امید ہے آپ اپنے تاثرات سے نوازیں گے۔ (مدیر)

ملک کی عام فضا سے صوبۂ اودھ اور ہمارے ضلع بارہ بنکی کی حالت کچھ مستثنیٰ نہ تھی، نکبت وادبار کی گھٹا جو ساری ملت پر چھائی ہوئی تھی، اس میں دہلی و لکھنؤ کے قرب وجوار والوں کا حصہ شاید کچھ زیادہ ہی تھا۔ دونوں آخرُ شاہیؔ شہر تھے اور دولت کی ریل پیل کو رخصت ہوئے ابھی کچھ ہی زمانہ ہوا تھا۔

نائی، دھوبی، بھشتی (سقہ)، دُھنیے، جلاہے، لوہار، بڑھئی، مزدور، کسان، قلی، وغیرہ سارے پیشہ ور 'کمینے' قرار پاگئے تھے، اور شرافت کا معیار یہ ٹھہر گیا تھا کہ نسب میں 'میاں لوگوں' کی ٹکر کا کوئی بھی نہیں، اونچی اور شریف ذاتیں صرف شیخ و سید میں محدود ہو کر رہ گئی تھیں اور پھر باہم ان میں بھی تفاضل۔ اور شیخوں کی شیخی کی کوئی حد ہی نہیں، اپنے ہاتھ سے اپنا کام کرنا سو عیبوں کا ایک عیب اور سو ذلتوں کی ایک ذلت۔ تجارت، دوکانداری، کاشت کاری، سب میں ہماری سبکی اور توہین۔ سارا سہارا زمینداری کے بعد بس ملازمت کا رہ گیا تھا، یا پھر وکالت یا طبابت۔ باقی شرعی اکل حلال کے سارے راستے بند۔ خدمتی پیشے والے (نائی، منہار، کنجڑے، قصائی وغیرہ) سب پَرجا یا رعایا کہلاتے تھے، ان کی نہ کوئی عزت نہ ان کی عورتوں کی کوئی عصمت۔ ہم میاں لوگ ان سب کے مقابلہ میں فرعون بے سامان بنے ہوئے۔ مجال نہیں کہ جب کوئی میاں لوگ اپنے بیٹھکے میں بیٹھے ہوں تو کوئی نیچ قوم کا لڑکا یا جوان ان کے سامنے سائیکل پر گذر سکے۔

جوار کی شریف اہم برادری میں ایک اہم برادری قدوائی خاندان کی تھی، یہ خاندان کہنا چاہیے کہ ضلع بارہ بنکی کے ساتھ مخصوص ہے، گدیہ، بھیارہ، مسولی، رسولی، بڑے گاؤں وغیرہ میں پھیلا ہوا تھا۔ ضلع لکھنؤ کے بھی ایسے قصبے جو بارہ بنکی کی سرحد پر واقع ہیں، مثلاً جگور، خال خال لوگ اس خاندان کے فیض آباد، اُناؤ، رائے بریلی، ہردوئی وغیرہ اضلاع اودھ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ خاندان کے مورث اعلیٰ کا نام قاضی معزالدین عرف قدوۃ الدین تھا، ان کا زمانہ کہا جاتا ہے کہ دسویں صدی عیسوی کا تھا اور وہ محمود غزنوی کے ہم عصر تھے، بعد کو ان کا نام زبانوں پر محض قاضی قدوہ رہ گیا۔ مشہور ہے کہ سلطان محمود ہی کے زمانے میں کسی لشکر کے ساتھ ہندوستان آئے اور قصبۂ اجودھیا (ضلع فیض آباد) میں مقیم ہوگئے۔ وہیں ایک مزار بھی ان کی جانب منسوب ہے، نسلاً اسرائیلی تھے، خاندانی نسب ناموں میں ان کا سلسلہ حضرت ہارونؑ سے ہوتا ہوا لادی بن حضرت یعقوبؑ سے ملتا ہے، اس لیے قدوائی خاندان بھی اسرائیلیوں کی ایک شاخ ٹھہرتا ہے۔

لکھنؤ اور شہر لکھنؤ سے متصل قصبہ بجنور کے شیخ زادے نسب میں کسی کو اپنے برابر کا سمجھتے ہی نہ تھے، مگر قدوائیوں سے قرابتیں کر کے ان کو انھوں نے اپنے میں ملا لیا۔ اور سادات بانسہ وغیرہ نے بھی اپنی لڑکیاں قدوائیوں کو دیں اور ان کی لڑکیاں اپنے ہاں لیں۔ اس طرح قدوائیوں کی عالی نسبی مسلم ہوگئی۔ اور نسل ونسب کے لحاظ سے یہ کسی سے ہیٹے نہ رہے اور اسی زمرے میں شمار ہونے لگے، جس میں عباسی، انصاری، علوی، عثمانی وغیرہ تھے۔ مسلم حکومت کے دوران اس کنبہ میں عالم وفاضل، مشائخ ودرویش، اطبا اور سرکاری عہدیدار برابر پیدا ہوتے رہے اور جب انگریزی حکومت آئی، جب بھی قدوائیوں کے علمی و منصبی امتیاز میں کوئی کمی نہ آنے پائی، اور اس وقت ۶۷ء تک شفیق الرحمٰن قدوائی (وزیر تعلیم، صوبہ دہلی) اور رفیع احمد قدوائی (نامور وزیر مرکزی) سے لے کر خدا معلوم کتنے ادیب وشاعر، کتنے طبیب وڈاکٹر، کتنے وکیل وبیرسٹر،

کتنے عالم ودرویش، اسی خاندان سے اٹھ چکے ہیں۔

☆

گھر میں کھیل کود کے لیے پردیس (سیتاپور) میں کوئی ہم سن لڑکا عزیزوں میں سے تو تھا ہی نہیں، اور نہ سول لین کی اس کوٹھی میں کسی ہمسائے زادے کا کوئی امکان تھا۔ سگے بھائی بھی ایک تھے اور ان سے بے تکلفی بھی تھی، پھر بھی سن میں کئی سال کی چھٹائی بڑائی کا کیا علاج تھا۔ گھر کی پروردہ لڑکیاں البتہ کھیل کے لیے کئی ایک تھیں، کم سن بھی اور میری ہم سن بھی (ہم میاں لوگوں کی زبان میں 'لونڈیاں' یا 'باندیاں')، لڑکا بھی کوئی ایک آدھ اس طبقہ کا تھا، البتہ سن میں مجھ سے دو چار سال بڑا۔ بہرحال جو بھی تھیں یا تھے سب مرتبہ میں مجھ سے کم اور کہیں کم، میں مالک اور آقا، وہ سب غلام اور کنیزیں، میں میاں اور وہ سب کمینے۔ میں سب پر شیر، سب کا حاکم، جب جس کو جی چاہا پیٹ دیا، جس کو جو چاہا کہہ بیٹھا۔ یہی غنیمت ہے کہ زبان گالیوں پر نہیں کھلی تھی (اور اس کی لم صرف یہ ہے کہ اپنے باپ اور بھائی کو کبھی گالی دیتے نہیں سنا تھا) والد ماجد اور والدہ ماجدہ دونوں اپنی والی بڑی قدغن میری زبان درازیوں اور دست درازیوں دونوں پر رکھتے۔ اور والد ماجد سے میں ڈرتا بھی تھا، تاہم ان سے چرا چھپا کر تو موقع آخر مل ہی جاتا۔ اس صورت حال یعنی اپنے برابر والے ساتھی نہ ملنے سے دو نتیجے نکلے، ایک اچھا ایک بُرا، اچھا نتیجہ یہ کہ زبان اور کان دونوں بچپن بھر، گالی گلوج اور فحش گندے مذاق سے محفوظ رہے اور بُرا نتیجہ یہ نکلا کہ طبیعت سے عادی شروع ہی سے حکومت وحکمرانی کی ہوگئی، اور نفس کو چسکا بچپن ہی سے اپنی بڑائی کا پڑ گیا۔ ساتھیوں سے احساس مساوات کا پیدا ہی نہ ہونے پایا، کبھی انھیں پیٹ دیا تو کبھی خود ہی ان سے پٹ گئے، اس کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔

کئی کئی پروردہ لڑکیاں گھر میں آخر جمع کیسے ہوگئیں! اس گتھی کو بھی تو سلجھاتے چلیے۔

میری پیدائش کا شاید پانچواں ہی سال تھا کہ ہمارے صوبہ میں (اس وقت اس کا نام NWP یا ممالک شمالی ومغربی تھا) ایک شدید قحط پڑا، ایسا کہ قحط زدہ بے چاروں نے اپنی اولاد تک کو بیچنا شروع کر دیا، خیر اس کی تو قانون سے ممانعت تھی۔ البتہ سرکاری محتاج خانوں میں لڑکیاں کثرت سے داخل ہونے لگیں اور اس کی اجازت حکومت سے تھی کہ جو چاہے انھیں پرورش کرنے کے لیے اپنے ہاں رکھ لے۔ والد مرحوم ڈپٹی تھے ہی (غالباً ضلع بستی میں) انھیں بڑی تعداد میں لڑکیاں آسانی سے مل گئیں، کچھ تو انھوں نے اپنے عزیزوں مخلصوں میں تقسیم کر دیں اور کئی ایک اپنے ہاں رکھ لیں۔ میں ان میں سے کم سن تھیں، وہ بچارے اپنی ذات سے اس کا اہتمام رکھتے تھے کہ ان کے لیے کوئی ظلم زیادتی نہ ہونے پائے اور والدہ ماجدہ بھی حتی الامکان شفقت ہی کا برتاؤ ان کے ساتھ رکھتی تھیں لیکن قابو کے بعد کون لحاظ 'حقوق' اور احکام الٰہی کا رکھتا؟ معاشرہ اور برادری کا اصرار تھا کہ یہ سب لونڈی تو غلام ہیں، کمینے اور نیچ، نہ ان کی کوئی عزت نہ کسی انسانی اکرام واحترام کے مستحق، سوا اس کے کہ انھیں پیٹ بھر کھانے کو دے دیا جائے، گویا یہ انسان تھے ہی نہیں، چوپائے تھے، جن کا محض قالب انسانی تھا۔ اچھوت پن کی لعنت ہندوؤں تک کب محدود رہی تھیں، مسلمانوں میں خصوصاً ہم میاں لوگوں میں پوری طرح سرایت کر گئی تھی۔

خوش حال گھرانوں میں ایک اور مصیبت یہ تھی کہ یہ 'زرخرید' چھوکرے اور چھوکریاں آقازادوں اور آقازادیوں کی خدمت کے لیے شروع ہی سے نامزد (allot) کر دیے جاتے تھے، گویا حق ملکیت باضابطہ بھی فلاں صاحب زادہ کا فلاں چھوکرے اور فلاں چھوکری کے لیے ثابت ہو جاتا تھا؛ چنانچہ ایک چھوکرا مجھ سے تین چار سال چھوٹی، دونوں میرے نام کر دیے گئے، اور میں عملاً ان کی قسمت کا مالک قرار پا گیا۔ اتنی کم سنی میں انتہائی خواجگی کا احساس اور پندار تفوق و برتری جیسی مریضانہ بلکہ خبیثانہ ذہنیت پیدا کر سکتا ہے، ظاہر ہی ہے، اور پھر میں تو طبعاً بھی تند خو تھا۔ یہ چیز ظاہر تو 'آج' ہے، اس وقت کہاں تھی؟ آج واضح و صریح سہی، معاشرہ کی اس منزل میں سوچنے کے بعد بھی ذہن کا اُدھر منتقل ہونا دشوار تھا۔ اچھے اچھے نیک، ثقہ اور دیندار لوگ بھی ظلم وشقاوت کی اس رو میں اندھوں بہروں کی طرح بہے چلے جا رہے تھے۔

نفس بہیمی نے آخر کھیل کھیلا اور کیوں نہ کھل کھیلتا، نفس تن تنہا خود ہی کیا کم ہے، پھر جب اسے شہ دینے والی ساری برادری ہو، پورا ماحول ہو، ہر چیز میں کوئی نہ کوئی پہلو جرم وخطا کا نکال لیتا، ذرا ذرا سی بات پر بھی سخت سزا دیتا۔ اپنے کو ہر وقت بڑا سمجھتا اور ہر زیردست کو ہر طرح حقیر وخوار سمجھتا، غرض شقاوت وسنگ دلی کا پورا اظہار، یہ اس صورت حال کا ایک لازمہ تھا، ادائے حقوق کی یاد تو خیر کوئی کیا دلاتا، شہ ہر طرف سے یہی ملتی رہتی کہ میاں آپ نے تو بڑی نرمی دکھائی ورنہ یہ پاجی تو اس سے کہیں زیادہ کڑی سزا کا مستحق تھا۔ لے دے کر ایک والد ماجد ایسے تھے جو کبھی کبھی ٹوک دیتے اور والدہ ماجدہ بھی کبھی کبھی بیٹھے سبق پند ونصیحت کے دے نکلتیں، خیر ان بیچاری کی بات تو میں کیا خیال میں لاتا، رہے والد تو وہ ہر وقت موجود کہاں رہتے، کبھی کچہری گئے ہوئے ہیں، کبھی کہیں اور۔ ادھر ان کی آنکھ بچی، اُدھر میں نے ڈانٹ پھٹکار مار کٹائی کے کارنامے دکھانے شروع کر دیے۔ یہی غنیمت ہے کہ نوبت یہیں تک آ کر کیسے رک گئی، اس سے بڑھ کر کیوں نہ آ گئی۔

یہ ایک اخلاقی تذکرہ تو محض ضمناً آ گیا، اور پھر اس کا تعلق محض اس سن کے ساتھ مخصوص بھی نہیں، اس نے آگے کے بھی کئی سال اپنی لپیٹ میں لے لیے۔

[''آپ بیتی''، عبدالماجد دریابادی، مکتبۂ فردوس، لکھنؤ، ۱۹۷۸]

ایک ضروری درخواست

گذشتہ شمارے کے تعلق سے ہمیں قارئین کے بہت سارے مکتوبات موصول ہوئے، لیکن ان میں ایک بھی ایسا مکتوب نظر نہیں آیا جو مشمولات پر مکالمہ قائم کرتا نظر آتا ہو۔ چنانچہ ہماری اپنے قارئین سے درخواست ہے کہ مشمولات پر اظہار خیال فرماتے ہوئے موضوع کے تعلق سے اپنا موقف پیش کریں تاکہ گفتگو آگے بڑھ سکے۔ ضروری نہیں کہ آپ رسالے کے سارے مشمولات پر تبصرہ کریں، کسی ایک ایسے عنوان پر آپ مفصل تبصرہ کر سکتے ہیں جو آپ کی توجہ کو اپنی جانب نسبتاً زیادہ مبذول کرتا ہو، تاکہ مکالمے کی فضا استوار ہو سکے۔ انتظامیہ

مدرسے اور مسلم تشخص کی تشکیل

ارجمند آرا

گذشتہ دنوں وطن عزیز میں اسلامی مدارس کے تعلق سے ایک بار پھر ہلچل نظر آئی جس کا سبب شیعہ وقف بورڈ کے چیئرمین وسیم رضوی کا وہ متنازعہ بیان تھا جس میں انھوں نے کہا تھا، ''مدرسوں کو بند کر دینا چاہیے، کیوں کہ وہاں دہشت گرد تیار کیے جاتے ہیں۔'' حسب سابق علما، مسلم لیڈر اور اردو اخبارات نے ویسا ہی ردعمل دکھایا جو ایسے ایشوز کے اٹھتے ہی نظر آتے رہے ہیں، مسلم تشخص اور سازش کی گردان شروع ہوئی اور بیان کنندہ کی شخصیت کو نشانہ بنایا گیا۔

وسیم رضوی یا انتہا پسند ہندو تنظیموں کا یہ الزام تو خیر سراسر غلط ہے کہ ہندوستانی مدارس میں مذہب کے نام پر دہشت گردی کی تعلیم دی جاتی ہے یا دہشت گردوں کو پناہ دی جاتی ہے یا دیگر مادی وسائل سے ان کی مدد کی جاتی ہے۔ لیکن سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اصل شے بندوق نہیں بلکہ ذہن سازی ہے اور ذہن سازی کی غذا نصاب اور اس نصاب کی تشریح کرنے والے استاد کا زندگی و آخرت کو دیکھنے کا زاویہ ہے۔ حالاں کہ یہ صورت حال صرف مدرسوں کی نہیں، دیگر مذہبی اداروں، آشرموں اور آر ایس ایس کے زیر اہتمام چلنے والی شاکھاؤں کی بھی ہے۔

تو یہاں سوال اسلامی مدارس یا ہندو شاکھاؤں کا نہیں بلکہ ایک مخصوص مذہبی نصاب کا ہے جو بچوں کے دماغوں میں ٹھونسی جاتی ہے اور کچی عمروں میں ان کی ایک خاص طرز سے ذہنی تربیت کی جاتی ہے۔

اہم سوال یہ ہے کہ مدارس میں کس چیز کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس تعلیم کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ ان مدارس میں انھیں مذہب کے متعلق تعلیم دی جاتی ہے یا انھیں مذہبی بننے کی تعلیم دی جاتی ہے؟ انھیں تعلیم یافتہ بنانا مقصد ہے یا مبلغ اسلام؟ واضح رہے کہ معلم اور مبلغ میں فرق ہوتا ہے۔

کچھ لوگ مدارس کی جدید کاری کی باتیں کرتے ہیں، یعنی نصاب پر نظر ثانی کرنے کی تجویز پیش کرتے ہیں، جو ایک احمقانہ تجویز ہے۔ جدید تعلیمی نظام کو ایک مذہبی ادارہ کبھی پوری طرح قبول نہیں کر سکتا۔ نتیجتاً سائنس پڑھنے کے بعد بھی ایک مدرسے کے طالب علم کی فکر غیر سائنسی بن کر رہ

جائے گی، ظاہر ہے وہ مذہب کو شک کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا، چنانچہ وہ سائنس پر ہی شک کرے گا۔ گویا مدرسے کے طلبا کی شخصیت دونیم ہو جائے گی اور 'ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر' کے مصداق انھیں جس ذہنی اذیت سے گذرنا پڑے گا، وہ عیاں ہے۔

ارجمند آرا نے اپنا زیرنظر مضمون ممبئی سے شائع ہونے والے مؤقر ہفتہ وار "Economic and Political Weekly" کے لیے انگریزی میں تحریر کیا تھا، بعد میں انھوں نے خود اس کا اردو میں ترجمہ کیا جو 'آج'، کراچی میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انھوں نے اسلامی مدارس کا برصغیر کے تاریخی اور معاشرتی تناظر میں جائزہ لیا ہے۔ ۱۹۴۷ کے بعد کے عرصے میں مدرسوں کے کردار کے سلسلے میں ان کی توجہ مکمل طور پر ہندوستانی معاشرے پر مرکوز ہے۔ امید ہے قارئین اس موضوع پر اظہار خیال فرماتے ہوئے مکالمہ قائم کریں گے۔ (مدیر)

انگریزی روزنامے ''ٹائمز آف انڈیا''، نئی دہلی، کی ۱۷ اگست ۲۰۰۳ کی اشاعت شدہ ایک خبر کے مطابق میرٹھ (یوپی) سے کوئی بیس کلومیٹر کی دوری پر واقع بسالہ گاؤں میں ایک مدرسے کے طلبا نے یوم جمہوریہ کے موقعے پر اپنے مدرسے پر پاکستانی پرچم لہریا اور اسامہ بن لادن کے حق میں نعرے لگائے۔ مگر اگلے ہی مہینے ہندی روزنامے ''نو بھارت ٹائمز'' میں ۳۰ اکتوبر ۲۰۰۳ کو ایک اور خبر شائع ہوئی جس کے مطابق اس وقت کے فروغ انسانی وسائل کے وزیر مرلی منوہر جوشی نے وشو ہندو پریشد کے صدر اشوک سنگھل اور ایسے دیگر لوگوں کو چیلنج کیا جو مدرسوں کو شک وشبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مرلی منوہر جوشی نے مطالبہ کیا کہ اگر آر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد جیسی تنظیموں کے لوگ مدرسوں کو دہشت گردی کے کیمپ سمجھتے ہیں تو پھر ان کی دہشت گردی کا ثبوت پیش کریں۔

مدرسوں کی سرگرمیوں پر لاتعداد رپورٹیں، ان کے حق میں یا پھر مخالفت میں، ہر طرح کے اخبارات وجرائد میں مسلسل شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ۱۹۹۸ سے ۲۰۰۴ تک جب مرکز میں بی جے پی برسر اقتدار تھی، اس وقت ایک طرف جہاں لال کرشن آڈوانی جیسا اقلیت دشمن وزیر داخلہ مدرسوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے حق میں تھا، وہیں دوسری جانب اس کے نظریاتی بھائی مرلی منوہر جوشی دینی مدارس کی تعریف میں رطب اللسان تھے کہ مدرسے علم وتعلیم کے مراکز ہیں اور خواندگی اور تعلیم کے فروغ کے قومی مقاصد کے حصول میں مثبت کردار نبھاتے ہیں۔

ہم اگر ان دونوں لیڈروں کے بظاہر متضاد نظریات کا بغور جائزہ لیں تو منطقی طور پر یہ ہمیں ایک ہی دھاگے میں پروئے ہوئے نظر آئیں گے۔ ایسے تضادات کا پیدا ہونا دراصل ہمارے موجودہ سیاسی اور معاشی نظام کا خاص وصف ہے۔ ہندوستان ایسے جمہوری نظام کو، جہاں نام نہاد عوامی نمائندے حکومت کرتے ہیں، مختلف گروہوں کے بازار سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جن کے مسابقتی رشتوں میں توازن اور ہمواری ہی حکومت کے تسلسل کی ضامن ہوتی ہے۔ عوام کا استحصال کرنے والی ان باہم متضاد قوتوں کا اپنی بقا کے لیے اتنا

انتخابیت پسند (eclectic) ہونا ضروری ہے کہ وہ مختلف سماجی گروہوں کے شعلہ بیاں بالائی طبقے کو اپنے نظام کا حصہ بنا کر عوام کو فریب میں مبتلا رکھ سکیں۔ عوام اپنے بالائی طبقے کی فلاح کو اپنی فلاح سمجھنے کے فریب میں مبتلا رہتے ہیں اور اس طرح یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ معاشرے کے تمام پسماندہ اور پائمال طبقات کسی بھی صورت میں متحد ہو کر استحصالی قوتوں کے خلاف صف آرا نہ ہو سکیں۔ اس طرح کے نظام میں یہ حکمت عملی اختیار کی جاتی ہے کہ پہلے کچھ مقبول عام مطالبات/مسائل کو اچھالا جاتا ہے اور پھر ان مسائل کی نمائندگی کرنے کے لیے کچھ لیڈروں اور بالائی طبقے کو سیاسی نظام کا جزو بنا کر عوام کی تشفی کر دی جاتی ہے۔ اس عمل میں الگ الگ مخصوص تشخص رکھنے والے فرقوں کی ایک مخصوص سانچے میں ڈھلی ہوئی (stereotypical) تصویر کی تشہیر کر کے انھیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر متذکرہ بالا بیانات میں آر ایس ایس اور بی جے پی کے لیڈروں کا مقصد مسلمانوں کو ایک خاص امیج کے حامل ملک دشمن طبقے کے طور پر پیش کرنا ہے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے ایک علیحدہ اقلیتی طبقے کی امیج کو زندہ رکھا جائے تا کہ اس 'دشمن' کو واضح طور پر پہچانا جا سکے۔ مذکورہ بیانات میں یہ کام مرلی منوہر جوشی نے کیا۔ بی جے پی کے دور اقتدار میں اگر مدرسوں کے دفاع میں بیانات دیے گئے تو اسے مذکورہ بالا حکمت عملی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے، کیوں کہ اقلیتوں کو اقلیت بنائے رکھنے سے ہی سنگھ پریوار کے ہندوتوا کی توسیع کے ایجنڈے کو تقویت مل سکتی ہے۔

بی جے پی کی سربراہی میں بننے والی ہندوستان کی این ڈی اے حکومت کی مدرسوں کے بارے میں اس دوغلے موقف پر مزید بحث کی گنجائش نہیں، لیکن اس حکومت کے ایک اور دوغلے رویے کا ضمناً تذکرہ ضروری ہے تا کہ سنگھ پریوار کی مذکورہ حکمت عملی کو سمجھنے میں مزید مدد مل سکے۔ اس حکومت کی کشمیر پالیسی بھی اس کی اقلیتی پالیسی ہی کی طرح دوغلی تھی۔ اس کے مطابق وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی تو اپنے دور حکومت میں کشمیر کے لیے نسبتاً زیادہ خودمختاری کے حق میں اکثر بیان دیتے رہتے تھے لیکن ان کے نائب لال کرشن آڈوانی، آئین ہند کے آرٹیکل ۳۷۰ کو، جس کے تحت جموں وکشمیر کے علاقے کو خصوصی درجہ حاصل ہے، منسوخ کرنے کا راگ الاپتے رہتے تھے جو آر ایس ایس کا آفیشیل موقف ہے۔ مدرسوں، اقلیتوں اور کشمیر کے حوالے سے بی جے پی کے موقف پر مزید اظہار رائے کے بغیر میں اس ضمنی موضوع کو یہیں ترک کرتی ہوں اور اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے اپنی بات یہاں سے شروع کرنا چاہتی ہوں کہ ہندوستان میں چلنے والے مدرسے اپنی خصوصیات اور مقاصد کے اعتبار سے مختلف النوع ہیں، اور مدرسوں کے بارے میں گفتگو شروع کرتے وقت اس حقیقت کو ذہن نشین رکھنا چاہیے۔

نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ ٹاور پر گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ کے دہشت گردانہ حملوں کے بعد امریکہ نے جیسے ہی 'اسلامی دہشت گردی' کو اس کا ذمے دار ٹھہرایا، دینی مدرسوں کی جانب دنیا کی نظریں لگ گئیں اور یہ جاننے کی کوشش کی جانے لگی کہ خصوصاً پاکستان اور افغانستان میں واقع مدرسے مذہبی شدت پسندی کی تبلیغ اور عالم گیر دہشت گردی کے کیمپوں کی حمایت میں کس حد تک ملوث ہیں۔ ہندوستان کے مدرسے بھی شکوک و

شبہات کے گھیرے میں آئے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مدرسوں کے نظام کو سمجھے بغیر اس قسم کے الزامات کی بابت کوئی رائے قائم کرنا گمراہ کن ہوگا۔ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ہمارے ملک میں پانچ لاکھ کل وقتی مدرسے ملک گیر پیمانے پر چل رہے ہیں جن میں تقریباً پانچ کروڑ طلبا زیر تعلیم ہیں۔ اس فہرست میں جز وقتی اور شبینہ مدارس شامل نہیں ہیں (ماہنامہ ''اردو دنیا''، جولائی ۲۰۰۳،صفحہ ۷)۔ یہ اتنی بڑی تعداد ہے کہ مذکورہ الزامات بڑی تشویش کا باعث ہو سکتے ہیں۔ گو یہ بات درست ہے کہ ہندوستان کے دینی مدرسوں کو افغانستان اور پاکستان کے مدرسوں کی مانند دہشت گردی کے اڈے نہیں سمجھا جاتا لیکن ان کے بارے میں بے اطمینانی کا عمومی ماحول پایا جاتا ہے اور بہت سے لوگ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ یا تو ان مدرسوں کے بنیادی ڈھانچے میں اصلاحات کی جائیں، یا ان پر سخت پابندیاں ہوں، یا پھر یہ ادارے بند کیے جائیں۔ اخباروں میں مسلمانوں سے متعلق شائع ہونے والی اکثر خبروں اور مضامین کے ساتھ مدرسوں کے بچوں کی جو تصویریں شائع ہوتی ہیں، ان میں وہ تپلی بنچوں پر کلام پاک اور سیپارے رکھے اپنے سبق از بر کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسی بیشتر تحریروں میں ان بچوں کو ایسے تنگ نظر مذہبی انتہا پسندوں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو اشارہ ملتے ہی گویا انسانی بم میں تبدیل ہو جائیں گے۔ مدرسے کے اکثر طلبا کی یہ تصویر کشی یقیناً درست نہیں ہے، لیکن یہ خیال عام ہے کہ مدرسے والوں کا ذہنی افق عموماً وسیع نہیں ہوتا اور وہ ہر جدید شے کے مخالف ہوتے ہیں، اور یہ بات زیادہ غلط نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ مسلمان اس وقت عجیب بے چینی محسوس کرتے ہیں، جب وہ کرتے پائجامے میں ملبوس، ٹوپی لگائے، چھوٹی ڈاڑھیوں والے نوجوان طالب علموں کو گروہ کی صورت میں مسجد یا مکتب سے نکلتے ہوئے یا کسی مسلمان بھائی کے گھر دعوت کھانے کے لیے جاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ بے چینی غالباً مسلمانوں کی عمومی تعلیمی پسماندگی کے سبب ہوتی ہے، لیکن جدید تعلیم یافتہ طبقے کا یہ ردعمل کسی ترقی پسندانہ اقدام کے لیے کوئی رہنمائی نہیں کرتا۔ مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی ترقی کے خواہاں لوگوں کو بدلتے ہوئے عمومی سماجی تناظر میں ایسے بہت سے سوالوں کے جواب تلاش کرنے ہوں گے جو مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے بنیادی مسئلے کو سمجھنے میں مدد کریں۔ اس کو سمجھنے کے لیے جو سوال ہمارے ذہنوں میں سب سے پہلے پیدا ہوں گے، وہ کچھ اس قسم کے ہوں گے:

وہ کون سے حالات ہیں جن کے سبب اتنی بڑی تعداد میں مدرسے وجود میں آئے؟

ان کی تاریخ کیا ہے اور ان کی بقا کی سماجیات کیا ہے؟

اس کے کیا اسباب ہیں کہ موجودہ ترقی یافتہ سماج میں بھی عہد وسطیٰ کے ان اداروں کو مسلمانوں میں مقبولیت حاصل ہے؟

عام لوگوں کی بہ نسبت مدرسوں سے وابستہ لوگوں کی مجموعی پسماندگی اور تعلیم یافتہ مسلم معاشرے سے کٹ جانے کے اسباب کیا ہیں؟

اس افسوسناک صورت حال کے لیے سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالات کس حد تک ذمے دار ہیں؟

یہ اور اس قسم کے بہت سے سوال ہم میں سے بہت سے لوگوں کو پریشان کرتے ہوں گے، خصوصاً

ایسے دور میں جب ملک کے مختلف خطوں میں ہر طرح کے مذہبی جنون کو ہوا دے کر فضا کو مسلسل مسموم کیا جا رہا ہے، ایک ایسے مسلمان کے لیے جو کثیر مشرب (pluralist) معاشرے میں ایک جدید ہندوستانی شہری کے طور پر زندہ رہنا چاہتا ہے، یہ صورت حال بڑی دشوار گذار ہے۔ اس مضمون میں مذکورہ تمام سوالوں کو ذہن میں رکھ کر خصوصاً ہندوستان میں نظام مدارس کو تاریخی تناظر میں سمجھنے اور موجودہ دور میں ان کی افادیت کے تجزیے کی کوشش کی گئی ہے۔

ابتدائی دور کے مدارس

عہد وسطیٰ میں مسلمانوں کے درمیان کوئی باقاعدہ نظام تعلیم رائج نہ تھا۔ صوفی، علما، مشائخ، مصلحین، امرا اور روسا اپنی خانقاہوں اور ڈیوڑھیوں ہی کو تعلیم وتربیت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ذاتی نوعیت کے ان مدرسوں میں عموماً کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی (سید مناظر احسن گیلانی، ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت''، ندوۃ المصنفین، جامع مسجد، دہلی، ۱۹۸۷،صفحہ ۳۵)۔ مدرسوں کے قیام کے تاریخی شواہد فراہم کرتے ہوئے قمر الدین لکھتے ہیں کہ عہد سلطنت میں مسلم حکمرانوں اور امرا نے بہت سے مدرسے اور مکتب قائم کیے (''ہندوستان کی دینی درس گاہیں''، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کا کل ہند سروے، دہلی، ۱۹۹۶،صفحہ ۳۵)۔ مسجدوں اور خانقاہوں میں مکتب لازماً چلائے جاتے تھے، جہاں طالب علموں کو قرآن پڑھنا اور دینی ارکان سکھائے جاتے تھے۔ امرا کے بچوں کی تربیت کا اہتمام ان کے گھروں میں کیا جاتا تھا۔ مدرسے کے لغوی معنی درسگاہ کے ہیں، یعنی وہ جگہ جہاں تعلیم دی جائے۔ اصلاً اس لفظ سے کوئی مذہبی یا غیر مذہبی مفہوم مترشح نہیں ہوتا۔ ابتدا میں چونکہ مذہبی اور دنیاوی تعلیم کے الگ الگ اداروں کا کوئی تصور نہیں تھا، اس لیے مدارس میں تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فلسفہ، عروض، قواعد، ریاضی، منطق، تاریخ اور جغرافیہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اگر کسی طالب علم کو کسی مخصوص علم (مثلاً طب یونانی) میں مہارت حاصل کرنی ہوتی تو پھر وہ اس علم کے ماہرین سے رجوع کرتا تھا۔ رموز سیاست اور سپہ گری جیسے فنون کی تعلیم امرا اور روسا تک محدود تھی۔ یہ طرز تعلیم ہندوستان میں مسلم حکمرانوں اور مسلم طرز معاشرت کے استحکام کے ساتھ ساتھ فروغ پاتا رہا۔ اکبر پہلا بادشاہ تھا جس نے تعلیم کا ایک علیحدہ محکمہ قائم کیا جہاں ہندو اور مسلمان ایک ہی مدرسے میں پڑھتے تھے، البتہ ان کو الگ الگ نصاب کے انتخاب کی آزادی تھی (سلامت اللہ، ''ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم''، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۰،صفحہ ۳۱)۔ ہندو اشراف بھی؛ جن میں اکثریت برہمنوں اور کائستھوں کی تھی، اپنے بچوں کو اسلامی تعلیم کے لیے مدرسوں میں داخل کرانے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتے تھے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ عام لوگوں کی تعلیم پر کبھی کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اس وقت کا سماجی ڈھانچہ ہی اس قسم کا تھا کہ اس میں عوام کی تعلیم پر غور کرنے کی کوئی گنجائش پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ مسلم اشراف کو اپنے ہم پلہ ہندو اشراف کی طرح (بلکہ اگر درست لفظ استعمال کیا جائے تو برہمن کی طرح، جو خود کو علم ودانش کے متولی اور امین سمجھتے تھے) عام لوگوں کی تعلیم وتربیت سے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا۔ مثال کے طور پر علی گڈھ تحریک کو

پیش کیا جاسکتا ہے جو سرسید کی قیادت میں انیسویں صدی کے اواخر میں شروع ہوئی اور علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے قیام پر منتج ہوئی۔ یہ ایک ایسی تحریک تھی جس کا بنیادی تصور مسلم اشراف کو جدید (انگریزی) تعلیم بہم پہنچانا تھا تاکہ وہ اقتدار کے بدلے ہوئے نظام میں شراکت دار ہوسکیں۔ اس تحریک کے 'روشن خیال' دانشوروں کے نزدیک عورتوں اور نیچی ذات کے لوگوں کی تعلیم کا سوال کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ اپنی کئی تحریروں میں سرسید احمد خاں نے واضح الفاظ میں عورتوں کی تعلیم کی مخالفت کی ہے۔ ان کے خیال میں عورتوں کو جدید تعلیم دینا 'نامبارک' بات تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر سماج میں مردوں کے حالات درست ہوجائیں تو عورتوں کی حالت ازخود درست ہوجائے گی، اس لیے ان کا خیال تھا کہ تمام تر کوششیں صرف مردوں کے تعلیمی اور سماجی حالات کو بہتر بنانے میں صرف کی جانی چاہئیں۔ جنوری ۱۸۸۴ میں گورداس پور (پنجاب) کی عورتوں کی ایک اپیل کے جواب میں انھوں نے کہا؛ ''لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔ پس جو خدمت میں تمھارے لڑکوں کے لیے کرتا ہوں، درحقیقت وہ لڑکوں لڑکیوں دونوں کے لیے ہے۔'' (''خطبات سرسید''، جلد اول، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۲، صفحہ ۶۵-۴۶۶) دکن میں ۱۸۹۱ میں منعقد ہونے والی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے چھٹے اجلاس میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے سرسید نے کہا تھا؛ ''جب مرد لائق ہوجاتے ہیں تو عورتیں بھی لائق ہوجاتی ہیں۔ جب تک مرد لائق نہ ہوں، عورتیں بھی لائق نہیں ہو سکتیں۔ یہی سبب ہے کہ ہم کچھ عورتوں کی تعلیم کا خیال نہیں رکھتے، اسی کوشش (لڑکوں کی تعلیم) کو لڑکیوں کی تعلیم کا بھی ذریعہ سمجھتے ہیں۔'' (''خطبات سرسید، جلد دوم، مجلس ترقی ادب، لاہور، صفحہ ۲۲۳-۲۴) انھوں نے کانگریس کے اس مطالبے کی بھی مخالفت کی کہ متعہد عہدوں (convenanted posts) پر مقابلے کے امتحانات، جو صرف برطانیہ میں منعقد ہوتے تھے، ہندوستان میں بھی منعقد کرائے جائیں۔ سرسید نے اس مطالبے کی مخالفت کی، کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ اس سے نچلی ذاتوں اور طبقوں کے لوگ ان اعلیٰ عہدوں پر منتخب ہوسکتے ہیں اور ان کا تقرر ''ہندوستان کی شریف قوموں'' کے لیے ناگوار خاطر ہوگا (''مکمل مجموعۂ لیکچرز واسپیچز''، لاہور، ۱۹۰۰، صفحہ ۲۵۰-۵۲)۔ ان حوالہ جات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سرسید کا تعلیمی نظریہ عملاً اور اصولاً دونوں ہی سطحوں پر اشرافیہ مسلم طبقات کی تعلیمی فلاح تک محدود تھا۔ تعلیم یافتہ مسلم اشراف جس قسم کے نظام تعلیم کو فروغ دینا چاہتے تھے، اس کا مقصد دراصل فیوڈل سماج کا تحفظ کرنا تھا۔

سماج کے کمزور طبقات کے تئیں مسلم اشراف کے اس بے حس، بلکہ معاندانہ رویے نے مسلمانوں میں طبقاتی فرق کو مزید بڑھایا اور علما، قاضیوں، مولویوں اور حکیموں کے الگ الگ طبقات الگ الگ ذاتوں کی مانند مستقل حیثیت اختیار کر گئے۔ یہ لوگ چونکہ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے ذات پات میں یقین رکھنے والے ہندوؤں کی طرح معاشرتی تفریق ان کے بھی شعور کا حصہ تھی۔ حالاں کہ مسلمانوں میں طبقاتی فرق پیشے کی بنیاد پر قائم ہے اور اسلام میں ذات پات اور چھوت چھات کے لیے کوئی گنجائش نہیں، پھر بھی مقامی تہذیبی اثرات سے اور مذکورہ طرز تعلیم اختیار کرنے کے سبب ہندوستان میں مسلمانوں میں ذات پات کو خوب فروغ حاصل ہوا اور پورا مسلم سماج دو طبقوں میں تقسیم ہوگیا؛ 'شریف' اور

'رذیل'۔ (قمر الدین، ''ہندوستان کی دینی درس گاہیں''، دہلی ۱۹۹۶، صفحہ ۳۵)۔ مسلمانوں میں تقسیم ہندوستان تک یہ غیر تحریر شدہ قانون نافذ تھا کہ رذیلوں میں سے کوئی بھی شخص؛ مثلاً نائی، بڑھئی، لوہار، جلاہا وغیرہ، کسی مسجد کا امام یا شہر کا قاضی نہیں بن سکتا۔ قاضیوں کی حد تک یہ قانون آج بھی مروج ہے۔ اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو مسلمانوں کا تعلیمی نظام اپنے خلقیے میں ہندوؤں میں مروج تعلیمی نظام سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا، جہاں پاٹھ شالاؤں اور گروکلوں میں صرف برہم اور دُوِج (ا) ہی داخل ہونے کے مجاز تھے۔ ہندو اور مسلم دونوں فرقوں کے نظام ہائے اعلیٰ طبقات کے لیے ہی دستیاب تھے۔

چونکہ انگریزوں کی حکومت میں مغرب سے آنے والے افکار و تصورات کا اثر معاشرے پر پڑنا ناگزیر تھا، اس لیے مسلمانوں کے نظام تعلیم میں بھی تبدیلیاں آئیں، البتہ جدید تعلیم کی تمام برکتیں اعلیٰ طبقات ہی تک محدود رہیں۔ ہر سماجی نظام کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ حاشیے پر جینے والے لوگ مقتدر طبقے کی تہذیب کو تحسین کی نظروں سے دیکھتے اور اسے اختیار کرنا چاہتے ہیں، جس کی وجہ سے صاحب اقتدار طبقے کی تہذیبوں کی توسیع اور غلبے کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ ماہرین سماجیات بھی مختلف سماجی گروہوں کے طرز زندگی کے مطالعات و مشاہدات کے ذریعے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ کم ترقی یافتہ طبقے ہمیشہ آگے بڑھنے اور برسر اقتدار طبقے کی تہذیب و ثقافت کو اختیار کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کے زوال سے پہلے تک غیر مسلموں کے اعلیٰ طبقات، بالخصوص کائستھ مسلمانوں کے طرز معاشرت کو اختیار کرنا مستحسن تصور کرتے تھے اور مسلمانوں کے طرز تعلیم کو فخر و مباہات سے اختیار کرتے تھے۔ اس زمانے میں غیر مسلم علما کے ماہرین اسلامیات ہونے کی مثالیں بھی عام طور پر اس لیے مل جائیں گی کیوں کہ یہ علما اپنے تہذیبی رویوں میں اعلیٰ مسلم طبقے سے قطعی مختلف نہ ہوتے تھے۔

برطانوی حکومت کے اثرات

برطانوی راج قائم ہوا تو ہندوستانی معاشرے میں زبردست تبدیلیاں آنا شروع ہوگئیں۔ تعلیمی نظام اس وجہ سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوا کہ برطانوی حاکموں نے اپنے مفادات کے پیش نظر عوامی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ لیکن جیسے ہی جدید یا مغربی تعلیم کا نفاذ ہونا شروع ہوا 'نئی تہذیب' اور نئی تعلیم کے خلاف ایک زبردست تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا (گیلانی، صفحہ ۳۰۲-۳، ۳۱۷-۱۸)۔ بدلتے وقت کے ساتھ بدلنا منظور نہ تھا، انھوں نے بہاؤ کے خلاف تیرنے کی کوشش کی۔ روایتی تعلیمی ادارے اور مدرسے بھی اس نئی تہذیب اور نئی تعلیم کے خلاف تھے اور آہستہ آہستہ ان میں سے کئی ادارے ایک طرح سے سامراجی حکومت کے خلاف مدافعت کی علامت بن گئے۔ انگریزوں کے خلاف ان کی یہ مدافعت اور مخالفت بعد میں تحریک آزادی میں مدرسوں کی شمولیت پر منتج ہوئی۔ دیوبند تحریک، وہابی تحریک اور خلافت تحریک کا مطالعہ اسی پس منظر میں کیا جانا چاہیے۔ لیکن دینی مدرسوں کے ذریعے انگریزوں کی مخالفت کا ایک اور نتیجہ یہ بھی سامنے آیا کہ مشرقی تہذیب اور تعلیم کی حمایت کرتے کرتے وہ اپنے مقاصد اور نظریات میں مزید شدت پسند ہوگئے اور انھوں نے ہر قسم

کے مغربی علوم کے دروازے اپنے اوپر بند کرلیے۔اس طرح آہستہ آہستہ ان کے نصابات معاصر معاشرے کی ضرورتوں کے مطابق نہ رہے۔

تبدیل شدہ سیاسی حالات کے سبب مغربی تعلیم کا فروغ لازمی تھا۔مغربی تعلیم اور طرز زندگی کو خصوصاً ان لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا جو برطانوی راج کے نئے ملازمتی شعبوں میں شامل ہونے کے خواہاں تھے۔ان نئی تبدیلیوں کے ساتھ وطن پرستی اور وفاداری کے سوال بھی اٹھائے جانے لگے تھے اور یہ بھی سوال تھا کہ نئے حالات میں کون سا راستہ اختیار کیا جائے۔ ہندوستان میں کسی بھی مذہبی فرقے میں اس سوال پر اتفاق رائے نہ تھا۔ کچھ لوگ اپنے روایتی نظام تعلیم اور عہد وسطیٰ کی اقدار سے وابستہ رہے اور کچھ لوگ نئی تعلیم اور مغرب کے حامی ہوگئے۔ آخر الذکر لوگوں میں بیشتر آسودہ حال اور اعلیٰ طبقے کے لوگ شامل تھے۔ مثلاً سرسید احمد خاں جدید مغربی تعلیم کے زبردست حامی کے طور پر میدان میں آئے۔ وہ یہ مانتے تھے کہ سائنسی علوم کا حصول ترقی کا زینہ ہے اور سائنسی علوم تک رسائی صرف انگریزی زبان کے ذریعے ہوسکتی ہے۔

سماج میں ایک اور بڑی تبدیلی بھی آرہی تھی۔ انصاف ومساوات کے نئے پیمانوں کے طفیل عام لوگوں کے لیے بھی نئی تعلیم کی راہیں کھلنے کے امکانات بڑھ گئے تھے۔ بیداری کی یہ نئی لہر آنے کے سبب عام لوگ بھی بہتر طرز زندگی اختیار کرنے کی توقع کرنے لگے تھے۔نسبتاً پسماندہ اور غیر تعلیم یافتہ مسلم عوام نے یہ توقع اپنے بچوں کو دینی مدرسوں میں بھیج کر پوری کی، جن کو وہ علم ودانش کی اعلیٰ ترین مراکز خیال کرتے تھے۔ اس صورت حال نے ان عام مسلمانوں کے طرز فکر پر نمایاں اثر ڈالا جن کے حالات بصورت دیگر اپنے ہم پلہ ہندو بھائیوں سے قطعی مختلف نہ تھے۔ اس نئی تعلیمی تبدیلی کے سبب مذہب اور مذہبی تشخص کے لیے بھی ایک بیداری پیدا ہونے لگی۔ بنگال میں نشاۃ ثانیہ اور شمالی ہند میں احیا پرستی کا عروج تہذیبی اور مذہبی شناخت کی اسی بیداری کی لہر کا نتیجہ تھا۔ شناخت کے لیے بیداری کی اس لہر نے اتنا زور پکڑا کہ وہ لوگ بھی جو جدید نقطۂ نظر رکھتے تھے اور سائنس کی تعلیم کے حامی تھے، مذہبی اور سیکولر تعلیم کو یکجا کرنے کی وکالت کرنے لگے تھے (سلامت اللہ، ''ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم''، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۰، صفحہ ۵۵)۔

اشرافیہ کی روایت کا یہ اصول عام ہے کہ وہ تمام شعبہ ہائے زندگی پر حاوی رہنے کی کوشش کرتی ہے۔اسی کلیے کے مطابق مسلم اشراف نے بھی نظام مدارس کے ساتھ ساتھ نئی تعلیم کی درس گاہوں پر بھی اپنے گرفت مضبوط کی۔ روایتی تعلیم کے عالموں اور مبلغوں کی صورت میں جہاں ایک طرف انھوں نے اپنے دینی بھائیوں پر گرفت مضبوط رکھی، وہیں دوسری طرف اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت بھیجنے کا بھی کوئی موقع انھوں نے نہیں گنوایا۔ مثال کے طور پر اردو کے مشہور شاعر اکبرالٰہ آبادی نے، جنھوں نے مغربی تہذیب کی مخالفت میں اکثر غیر معقول موقف اختیار کیا، اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے اسی برطانوی کلچر کے حوالے کردیا، اپنی شاعری میں وہ جس کے شدید مخالف تھے۔

جدید تعلیم کے رجحان کو فروغ ملنے کے بعد عمومی صورت حال کچھ یوں بنی کہ اعلیٰ طبقے کے اکثر مسلمان تو نئی تعلیم کی طرف راغب ہوئے اور نچلے طبقات کے مسلمانوں نے مدرسوں کا رخ کیا۔ان میں سے

بیشتر چونکہ نیم خواندہ یا ناخواندہ گھرانوں سے آتے تھے، اس لیے عربی اور فارسی کا نصاب تعلیم ان کے لیے ایک مسئلہ بن گیا۔ان کی تعلیم کا بیشتر وقت ان زبانوں کو سیکھنے میں صرف ہوجاتا تھا اور اکثر صورتوں میں وہ ان میں درک حاصل نہیں کرپاتے تھے۔ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے دینی مدارس کا معیار تعلیم بتدریج زوال کی سمت بڑھنے لگا۔ یہی وہ دور تھا جب مغل حکومت کا زوال بھی اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہا تھا اور فارسی زبان مقتدر طبقے کی زبان کے طور پر اپنی حیثیت کھو رہی تھی اور اس کی جگہ اردو چلن میں آچکی تھی۔ لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ جب دینی مدارس کے نصاب کے اردو ترجمے کے بارے میں غور کیا جاتا۔ نئے تعلیم یافتہ طبقے کو اس کا ذرا احساس نہ ہوا کہ عربی فارسی کے چلن سے باہر ہونے کے سبب تعلیمی معیار کتنی تیزی سے گر رہا ہے، اور اگر انھیں احساس ہوجاتا تو بھی اس کو بچانے کے لیے شاید وہ کچھ بھی نہ کرپاتے۔

نئے سیاسی نظام میں جب سیاست کے روایتی ڈھرے چرمرائے تو مسلم عوام پر سے مسلم اشراف کو اپنے اقتدار کی ڈور پھسلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ صورت حال کو قابو میں رکھنے کے لیے لازم تھا کہ ہر قسم کا حربہ استعمال کیا جائے۔ مذہب ایک ایسا حربہ تھا جس کا استعمال وہ مسلم عوام پر اپنا رسوخ قائم رکھنے اور ساتھ ہی مغربی اثرات کو دور رکھنے کے لیے کرسکتے تھے۔ بصورت دیگر اس بات کا قوی امکان تھا کہ آئندہ دنوں میں عام مسلمان تک نئی تعلیم کی رسائی ان کے سماجی نظام کو زیروزبر کردے گی۔ وہابی اور دیوبند تحریکوں سے لے کر (جن کا مقصد مسلم حکمرانی کی عظمت رفتہ کے احیا کے لیے جہدوجہد کرنا تھا) علی گڈھ تحریک اور تحریک خلافت تک، سبھی نے عوام کی سیاسی بے چینی اور اقتصادی بدحالی کا فائدہ اٹھا کر اپنے اپنے رسوخ کو بڑھانے کی کوششیں کیں۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے انھوں نے مسلمانوں کی علیحدہ قومی شناخت یا مذہبی تشخص پر سب سے زیادہ زور دیا کیوں کہ یہی وہ شعبہ تھا جو ان کے مقاصد کے حصول کی راہ ہموار کرتا تھا۔

مسلم تشخص کی تشکیل اور مذہبی تنظیمیں

اس طرح وقت کے ساتھ مسلمانوں میں جو نظام تعلیم مروج ہوا، وہ دراصل زمینداری نظام کا ایک ضمنی نتیجہ تھا۔ اصولاً ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں جمہوریت اور روشن خیالی کی نئی اقدار کے ساتھ یہ تعلیمی نظام آہستہ آہستہ کمزور ہوکر زوال پذیر ہوجاتا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دوسری جانب جماعت اسلامی جیسی تنظیموں نے، جن کا ایک مقصد مذہب کے نام پر جاگیرداروں کے حقوق کی نمائندگی اور تحفظ کرنا بھی تھا، مسلم عوام کے سیاسی اور مذہبی معاملات پر حاوی ہونے کی کوششیں شروع کردیں۔ مذہب کے لبادے میں جماعت اسلامی نے آمرانہ طرز حکومت کی کھل کر حمایت کی۔ جیسے جیسے آزادی، یعنی جمہوریت کی منزل قریب آرہی تھی، ویسے ویسے مسلمانوں کی مذہبی سیاسی تنظیمیں مذہب کی آڑ میں جاگیردارانہ نظام کی بقا کے لیے سرگرم ہورہی تھیں۔ پاکستان کی قیام کی راہ ہموار کرنے میں اس قسم کی کوششوں کے عمل دخل کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ یہ مذہبی جماعتیں جاگیرداری نظام کی بقا کے لیے جاگیرداروں کے ساتھ کس قسم کی سازش میں مصروف تھیں، اس کا ایک دستاویزی ثبوت جماعت اسلامی کے بانی مولانا

مودودی کا درج ذیل بیان ہے جو ان کی کتاب ''رسائل ومسائل'' میں موجود ہے:

''بلاشبہ اسلامی قانون انفرادی حق ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔قومی ملکیت کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر یہ کہاں درست ہے کہ کوئی پارلیمنٹ ایک حکم کے ذریعے سے اراضی اور دیگر ذرائع پیداوار پر سے افراد کے نجی حقوق کو ساقط کر کے ان پر اجتماعی حقوق قائم کر دے؟ زمین کی ملکیت اور جاگیروں کے بارے میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ زمینی جائیداد اور جاگیری کی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔اگر پیداوار کے دیگر ذرائع مثلاً ملوں اور فیکٹریوں کی بات کی جائے تو ان کے قومیانے کا تصور ہی اسلام کے بنیادی نظریے کے یکسر خلاف ہے۔'' (بحوالہ کے ایم اشرف، "An Overview of Muslim Politics in India"، مانک پبلی کیشنز، نئی دہلی ۲۰۰۱، صفحہ ۱۴۳)

مذہب کے نام پر اس قسم کے پروپیگنڈے نے ناخواندہ عوام کو خاموش کر دیا، یہی سبب ہے کہ برصغیر کی تقسیم کے بعد پاکستان میں؛ جسے مذہبی تنظیموں کی حمایت حاصل تھی، جمہوریت اپنے قدم کبھی نہ جماسکی اور سارا سیاسی نظام جاگیرداروں اور فوج کے ہاتھ میں چلا گیا، بلکہ فوج پر بھی جاگیرداروں ہی کا تسلط قائم ہے۔یہ تاریخی حقیقت بھی جاگیرداروں اور جماعت اسلامی جیسی تنظیموں کے باہمی تعلق کی عکاس ہے۔

اس دوران رفتہ رفتہ مدرسوں کا تعلیمی نظام پھیلتا رہا، ساتھ ہی مذہبی اور سیاسی جماعتوں کی پیش عملی نے بھی مسلم تشخص کی تشکیل میں فعال کردار ادا کیا۔آزادی کے بعد کے اس اہم دور میں جب تمام معاشرہ نظام کہنہ کو خیر باد کہہ کر نئی اقدار کی تعمیر کے عمل سے گذر رہا تھا، مسلمانوں کی امیج ایک روایتی، بنیاد پرست اور اپنے ہی خول میں بند رہنے والے فرقے کے طور پر بن رہی تھی۔ایسے ماحول میں مذہبی تعلیم مفاد پرست مذہبی تعلیم مفاد پرست مذہبی رہنماؤں کا ہتھیار بن گئی اور انھوں نے اسلام کی صرف ایسی تعلیمات کی تبلیغ کو فروغ دیا جو انھیں اپنے مفاد میں سب سے بہتر نظر آئیں۔مثلاً یہ کہ عام لوگ ائمہ اور علما کی اتھارٹی کے بارے میں کسی قسم کے سوال نہ اٹھائیں اور مذہبی معاملوں میں عقلیت پسندی کی راہ نہ دی جائے۔علما نے حقوق عباد کے مقابلے میں دینی ارکان کی پابندی پر مصلحتاً زیادہ زور دیا اور ہر مذہبی فریضے کی ادائیگی کے بدلے میں عالم بالا میں بے شمار ثواب ملنے کے خواب دکھائے تاکہ دنیا اور اس کے معاملات پس منظر میں چلے جائیں، اور ان مسائل اور ان کے اسباب پر غور کرنے کا عام لوگوں کو موقع نہ ملے۔نیم تعلیم یافتہ عوام کے لیے ایسی بے شمار ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں ان کتابوں میں درج طریقوں کے مطابق مذہب پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت کی گئی ہے۔تبلیغی جماعت نے ازخود یہ ذمے داری لے لی کہ ''تبلیغی نصاب'' کی مدد سے ناخواندہ اور بے علم مسلمانوں کے درمیان مذہب کے اس تصور کا پیغام عام کرے گی جس پر تبلیغی جماعت کے عمائدین نے اصرار کیا ہے۔جماعت کے ''تبلیغی نصاب'' میں نماز، روزہ، حج جیسے فرائض کے فضائل بیان کرنے کے علاوہ تبلیغ کے فوائد بھی بیان کیے گئے ہیں جن میں بہت سے جھوٹے سچے اور من گھڑت قصوں کی مدد سے ایک مبینہ سچے مذہب پر چلنے کی راہ دکھائی گئی ہے۔قرآن کا حوالہ دے کر تبلیغی جماعت کے لوگ یہ تو تبلیغ کرتے ہیں کہ جو لوگ ایمان والے ہیں اور جنھوں نے عمل صالح کیا، ان کو اللہ زمین پر اقتدار بخشے گا، ان

کو حیات طیبہ دے گا (مولانا وحیدالدین خاں، ''تبلیغی تحریک''، نئی دہلی ۱۹۹۴، صفحہ ۲۱)، لیکن اس مبینہ اقتدار کی نوعیت کیا ہوگی، اس پر وہ خاموش ہیں۔تبلیغی جماعت کے مبلغین کا تقاضا اپنے پیروکاروں سے یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی لوح تقدیر پر مکمل یقین رکھیں، یعنی اپنے آپ کو پوری طرح سے تقدیر کے حوالے کر دیں، اور بدحالی اور غریبی میں بھی صبر وقناعت سے کام لیں، کیوں کہ صبر کرنے والوں کو مرنے کے بعد بہتر زندگی ملے گی؛ بالواسطہ اس پیغام کا یہ مطلب ہوا کہ چونکہ تقدیر پہلے ہی لکھی جاچکی ہے، یوں حالات کو بدلنے یا بہتر بنانے کی ساری تدبیریں بیکار ہی ہوں گی، اس لیے تقدیر کو چپ چاپ تسلیم کر لینا چاہیے۔دنیا سے بے رخی، عالم بالا کی بہتر زندگی اور صبر وقناعت کی تلقین وتعلیم میں غریب کے لیے بڑی کشش ہوتی ہے، کیوں کہ یہ خیال ان کے لیے باعث تسکین ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد ہی سہی، کبھی تو ان کے دن پھریں گے۔انھیں یقین ہوتا ہے کہ صبر وقناعت کی وجہ سے خدا انھیں زیادہ عزیز رکھتا ہے، اس لیے معاشی بدحالی کے تدارک کی طرف ان کا دھیان نہیں جاتا۔جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کا الگ رنگ ہے تو اس سے مراد تقدیر پرست مسلمانوں کے اسلام سے ہوتی ہے (کیوں کہ عرب دنیا کے صاحب ثروت لوگوں کا اسلام تو یکسر مختلف ہے جس میں ہر طرف امارت اور وسائل کی فراوانی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے)۔اس طرح تقدیر پرستی کا یہ طرز فکر بدلتے ہوئے حالات کے مطابق نئے راستے دکھانے کے بجائے عام لوگوں کو حاشیے پر دھکیلتا رہتا ہے۔ہندوستان میں مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی پسماندگی اسلام کے اسی ہندوستانی برانڈ کا ایک براہ راست نتیجہ بھی کہی جاسکتی ہے۔

انگریزوں کے لائے ہوئے نئے تعلیمی نظام اور مسلم تعلیمی نظام میں بظاہر جو کشاکش نظر آتی ہے، اس کا سارا فائدہ زمینداری نظام کے پروردہ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے کو پہنچا ہے۔اس طبقے نے ایک طرف تو مسلمانوں پر اجارہ داری قائم رکھی اور دوسری طرف نئے حالات کے مطابق خود کو ڈھال کر نئی نظر کا نمائندہ بنا اور شریک اقتدار ہونے میں بھی کامیاب ہوا۔

دینی مدارس اور ترقی

جاگیردار اشراف نے روایتی تعلیم کی آبیاری غریبوں کے لیے ضرور کی لیکن اس طرح کہ اس پر ان کی گرفت بھی مضبوط رہے۔غالباً اس کا ایک سبب یہ تھا کہ جاگیرداروں کے اقتدار کی بقا دراصل ایک ایسے نظام کی بقا میں مضمر تھی جس میں جاگیردارانہ اقدار قائم ودائم رہ سکیں۔پسماندہ مسلمانوں کو جاگیردارانہ اقدار کے پروردہ مسلم رہنماؤں نے بار بار یہ یقین دلایا کہ ان کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ، یعنی اسلام خطرے میں ہے۔اس لیے عام مسلمانوں کا ایک نکاتی ایجنڈا یہ رہا کہ وہ روایتی تعلیمی نظام (یعنی مدارس) کی ہر طرح سے حفاظت کریں اور اسے ختم نہ ہونے دیں، کیوں کہ ان کے خیال میں مدرسوں کی بقا میں ہی دراصل اسلام کی حفاظت مضمر تھی۔آج بھی یہ تصور مسلمانوں کے درمیان عام طور پر رائج ہے کہ مدرسے ہی دراصل وہ ادارے ہیں جنھوں نے اسلام کو بچانے میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ بیچارا مسلمان جو

مدرسوں کو اسلام کا محافظ سمجھتا ہے، اس کا ذہن اس سامنے کی حقیقت کو نہ دیکھ سکا کہ وہ اکثر حضرات جنھوں نے انھیں مدرسوں کے نظام تعلیم کی طرف راغب کیا، خود اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم کے پرائیوٹ اسکولوں، یعنی پبلک اسکولوں اور کانونٹوں میں بھیج رہے ہیں اور اعلیٰ تعلیم کے لیے یوروپ اور امریکہ تک بھیجتے ہیں۔ مسلم عوام کی عمومی سیاسی کم فہمی اور تعلیمی پسماندگی کے سبب یہ روایتی تعلیمی نظام آج بھی اسی طرح سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے، جس طرح یہ آزادی سے پہلے تھا۔ تبدیلی صرف اتنی واقع ہوئی ہے کہ اب ہندوستان میں مذہبی اداروں کی باگ ڈور جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے، ان میں ایسے لوگ مل جائیں گے جنھوں نے سینٹ اسٹیونز کالج اور دہلی پبلک اسکول جیسے قابل رشک اداروں میں تعلیم پائی لیکن اپنا حلقۂ اثر بڑھانے کے لیے غریبوں کے اسلام سے وابستگی کو اپنا مقصد بنایا۔ (چند برس پہلے میری ملاقات جمعیۃ العلمائے ہند کے صدر دفتر، دہلی، میں سینٹ اسٹیونز کالج کے طالب علم سے ہوئی جو اب وہاں ایک اہم عہدے پر فائز ہیں۔ یقیناً اس کیریئر کے سبب انھیں جلد یا بہ دیر کوئی نہ کوئی قائدانہ رول بھی مل جائے گا اور کم از کم سماج میں ایک منفرد معزز مقام تو مل ہی گیا۔) علما اور مولویوں کے خاندانوں میں مذہب سے باہر شادی کرنے کی بھی مثالیں مل جائیں گی۔ ہر قسم کے سیاسی مفاد کے لیے مسجد کے اماموں کی سیاست کرنے والے مولانا جمیل الیاسی کے بیٹے صہیب الیاسی کی مثال بالکل سامنے کی ہے۔ وہ معروف ٹی وی اینکر ہیں، جدید تعلیم یافتہ ہیں اور انھوں نے ایک غیر مسلم خاتون سے شادی بھی کی جس کی موت کے بعد وہ آج تک اس شک کے دائرے سے باہر نہیں کہ انھوں نے اپنی بیوی کو قتل کیا۔ (تازہ اطلاعات کے مطابق، دہلی کی کڑکڑ ڈوما عدالت نے صہیب کو اپنی بیوی کے قتل کے جرم کی پاداش میں عمر قید کی سزا سنادی ہے: مدیر) جو لوگ اس معاملے سے واقف ہیں، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ انجو الیاسی کی آخری رسوم ہندو مذہب کے مطابق ادا کی گئی تھیں۔ یہ طرز زندگی روایتی مسلم گھرانوں کو بھی قبول نہیں ہوتا، چہ جائیکہ مذہبی رہنماؤں کے گھرانے۔ سوال یہ ہے کہ یہ طرز زندگی ہندوستان کے بڑے شہروں میں رہنے والے اعلیٰ متوسط طبقے کے اکثر ہندو یا مسلمان لوگوں سے کس طرح مختلف ہے؟

مذہبی اداروں سے متعلق لوگوں کی ذاتی زندگی کے حوالے اپنی بات یہیں ختم کرتی ہوں، اور اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے اس بات پر زور دینا چاہتی ہوں کہ مدرسوں کا ارتقا ایسے اداروں کی صورت میں ہوا جہاں عموماً وہ غریب مسلمان پڑھتے ہیں جن کے لیے کسی اور ذریعے سے تعلیم حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ مدرسوں کے تمام اخراجات، طلبا کے کھانے پینے اور رہائش کے انتظامات سے مسلمانوں کے دیے ہوئے عطیات اور زکوٰۃ سے کیے جاتے ہیں لیکن نظام کچھ ایسا بن گیا ہے کہ طلبا کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے سوا کسی اور قسم کی سہولت انھیں فراہم نہیں کی جاتی اور اس طرح مدارس کی آمدنی کا زیادہ حصہ مہتمموں کے مفادات کی نذر ہو جاتا ہے۔ علم کے حصول کے لیے دوسری سہولتوں سے محروم ان طالب علموں کو تین برس سے بھی زیادہ قدیم درس نظامی پڑھایا جاتا ہے جس کے سبب طالب علم عصر حاضر کے علوم سے نابلد رہتے ہیں اور نتیجتاً آج کی ضرورتوں اور چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہو پاتے۔ نہایت دقیق اور از کار رفتہ عربی اور فارسی نصاب کی کتابیں طالب علموں میں شاید ہی کوئی دلچسپی خود سے کچھ اور پڑھنے کی

خواہش پیدا کرتی ہوں۔

تعلیمی اور سماجی طور پر پسماندہ طبقات سے آنے والے بہت سے طالب علموں کے لیے مدرسے کی تعلیم مذہبی مدرس کے طور پر روزگار کی ضمانت بن جاتی ہے۔ قصبوں اور دیہاتوں کی مسجدوں میں مؤذن، امام اور مدرس کے طور پر انھیں کام مل جاتا ہے۔ یہ نظام سیکڑوں برس سے اسی طرح جاری و ساری ہے۔ چھوٹے چھوٹے مدرسے آج بھی جگہ جگہ کھل رہے ہیں اور ان میں مدرسوں کے فارغین کو روزگار بھی مل جاتا ہے۔ اس کا لامحالہ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اپنے آپ میں مطمئن پسماندہ مسلمان اپنے حقوق کے لیے سرکار سے کوئی مطالبہ نہیں کرتے اور ان کا ایک بڑا حصہ حکومت کی اس توجہ سے محروم ہے جو دوسرے پسماندہ طبقات کو حاصل ہے۔ اسلام جو اپنے ماننے والوں سے جدوجہد اور حرکت کا مطالبہ کرتا ہے، مسلم معاشرے میں ہر طرح کی بے عملی کا استعارہ بن کر رہ گیا ہے تو اس کی وجہ وہی تعلیم ہے جو صبر و قناعت اور استغنا کے نام پر مسلمان کو دی جاتی رہی ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہندوستان کی سرزمین پر جمہوری نظام حکومت کے استحکام کے ساتھ مدارس کے اس روایتی نظام کی اہمیت آہستہ آہستہ کم ہو جاتی اور نئی تعلیم کے دروازے سب طبقات کے لیے کھل جاتے لیکن کئی اسباب سے ایسا نہ ہو سکا۔ نام نہاد جمہوری حکومتوں نے مسلمانوں کی فلاح کے معاملات میں بے حسی کی پالیسی اختیار کی اور اس طرح اکثر مسلمان تعلیمی اور معاشی طور پر پسماندگی میں جیتے رہے۔ جاگیرداروں کے شدید احتجاج کے باوجود آزاد ہندوستان میں جس سیاسی عزم کے ساتھ زمینداری کا خاتمہ کیا گیا تھا، اگر اسی عزم کے ساتھ مسلمانوں کے درمیان نئی تعلیم کو متعارف کرانے کا کوئی منصوبہ بنایا جاتا تو شاید حالات مختلف ہوتے۔ حکومت کی بے حسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمینداری کے خاتمے کے باوجود مسلمانوں کے سماجی ڈھانچے میں اور اس طرز معاشرت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی جس پر مذہب اور مذہبی اداروں کی اجارہ داری تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ نیا جمہوری سیاسی نظام ایک ایسی موثر متبادل تعلیمی پالیسی تیار کرتا جس میں مسلمانوں میں نئی تعلیم بھی مروج ہوتی اور عام مسلمان یہ بھی محسوس نہ کرتے کہ ان کی مذہبی شناخت معدوم ہو رہی ہے۔ یہ کام ان کی تہذیبی شناخت کی حفاظت کے اقدام کر کے کیا جا سکتا تھا۔

تاریخی حالات کچھ اس طرح کے رہے ہیں کہ ہندوستان کے تقریباً سب مسلمان اردو زبان کو اپنی تہذیبی اور مذہبی شناخت کی ایک اہم علامت مانتے ہیں۔ اردو مسلمانوں تک کن حالات میں محدود ہو گئی اور صرف انھی کی شناخت کیسے بن گئی، یہ ایک علیحدہ اور پیچیدہ بحث ہے جس میں پڑنے کی گنجائش اس مضمون میں نہیں ہے، لیکن یہ بتانا ضروری ہے کہ آزادی ملنے کے ساتھ ہی تمام سرکاری اسکولوں سے اردو زبان کی تعلیم کا نظام بیک جنبش قلم ختم کر دیا گیا تھا۔ اردو کے خلاف یہ تعصب اس لیے برتا گیا تھا کہ اردو پاکستان کی سرکاری زبان بنائی گئی تھی اور مسلمان اور اردو تقسیم کے ذمے دار ٹھہرائے گئے تھے۔ مسلمانوں کے خلاف ماحول اس طرح سے بنا کہ جمہوری نظام نافذ ہونے کے باوجود مسلمان عملی طور پر دوسرے درجے کے شہری بن گئے اور ان کو اکثریتی تعصب کے عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس حقیقت کو بھلا کر کہ اردو

مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ تہذیبی وراثت ہے اور جدوجہد آزادی میں اس زبان کے ادب، صحافت اور بولنے والوں کا نمایاں کردار رہا ہے، اردو کو، اور اس کو اپنی زبان کہنے والے مسلمانوں کو، ہندوستان کی نئی جمہوری حکومت نے یہ سزا دی کہ اس زبان کے تعلیمی نظم کا یکسر خاتمہ کر دیا۔ آئندہ برسوں میں مسلمان اسی خوف میں جیتے رہے کہ آہستہ آہستہ ان کی تہذیبی اور مذہبی شناخت بھی ختم کر دی جائے گی۔ اسکولوں میں جو نظام تعلیم رائج ہوا، ایک تو وہ کافی حد تک فرقہ وارانہ خطوط پر مرتب کیا گیا تھا، دوسرے اس میں سے اردو کو جس طرح خارج کیا گیا، اس کے سبب مسلمانوں کے یہ خدشات بے جا نہ تھے کہ اس تعلیمی نظام میں ان کے بچے اپنی شناخت کھو بیٹھیں گے۔ سیکولر جمہوری حکومت کی ذمے داری تھی کہ مذہبی اور تہذیبی شناخت ختم ہونے کے اس خوف کو دور کرنے کے لیے پرائمری سطح پر اردو زبان والوں کے لیے اردو کو ذریعۂ تعلیم رکھا جاتا، مگر اس مطالبے اور اس کے نفاذ کے لیے جس سیاسی بصیرت کی ضرورت تھی، وہ یا تو ہندوستان کے مسلم سیاسی رہنماؤں میں موجود نہ تھی یا پھر وہ حالات سے مجبور تھے۔ اس بے یقینی کے ماحول میں، اور سرکار کے معاندانہ رویے کے ردعمل میں دینی مدارس کے نظام کو نئی قوت اور توانائی ملی۔

اس پس منظر کو سمجھے بغیر مدرسوں کو تنگ نظر اور کٹر ادارے کہہ دینا مسئلے کا بڑا سہل پسندانہ تجزیہ ہوگا۔ مدرسوں کی صحیح صورت حال کا اندازہ لگانے میں ان کے ساختیاتی ڈھانچے کو سمجھنے سے بھی مدد ملے گی۔ مثال کے طور پر مکتب کو لیجیے، جہاں بچے کو قرآن پڑھانے کے ساتھ مذہبی ارکان کی بھی تربیت دی جاتی ہے۔ مکتب تقریباً ہر محلے کی مسجدوں میں کل وقتی یا جز وقتی طور پر چلائے جاتے ہیں اور ان میں پڑھنے والے طالب علم بھی ہر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ عموماً اسکول میں کلاسیں کرنے کے بعد ہی طلبا جز وقتی مکتبوں یا شبینہ مکتبوں میں مذہب کی تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں۔ اصطلاحی دینی مدرسوں کا نمبر اس کے بعد آتا ہے، جہاں کل وقتی مذہبی تعلیم دی جاتی ہے۔ اصطلاحی دینی مدارس کا ایک علیحدہ اور مستقل بالذات نظام تعلیم ہے۔ گاؤں، قصبوں اور شہروں سبھی جگہ مدرسے قائم ہیں جو رہائشی اور غیر رہائشی دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ ان کے اخراجات زیادہ زکوٰۃ اور عطیات پر منحصر ہوتے ہیں۔ رہائشی مدرسوں میں عموماً بے حد غریب طبقات کے بچے آتے ہیں اور اس طرح یہ مدرسے غریب بچوں کی پرورش کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں۔ بہت سے یتیم خانے بھی اپنے یہاں اسی طرح کی مذہبی تعلیم کا اہتمام کرتے ہیں۔

مذہبی تعلیم کے اعلیٰ ترین ادارے وہ ہیں جن کو ہم مذہبی دانش گاہوں سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ تمام مسالک کے لوگوں نے ضرورت کے مطابق وقتاً فوقتاً اپنے یہ ادارے قائم کیے اور اب یہی دارالعلوم مذہبی اور نظریاتی دانشوری کے اعلیٰ ترین مراکز ہیں۔ ان بڑے مراکز سے مذہب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کو چھوٹے مدرسوں میں اور چھوٹے مدرسوں کے فارغین کو مکتبوں اور مسجدوں میں تدریس اور مذہبی ارکان ادا کرنے کی ذمے داریاں مل جاتی ہیں اور ان کے روزگار کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ اس طرح مدرسوں کا یہ نظام امداد باہمی کے اصول پر چلتا ہے اور خاصا مضبوط ہے۔ انحصار باہمی کے سبب یہ نظام مسلسل وسعت پذیر ہو رہا ہے، یہ اپنے آپ میں ایک ایسا معاشی نظام بھی ہے جس کے اردگرد بہت سے لوگوں کے معاشی مفادات

طواف کرتے ہیں۔

مدرسوں کی تعداد میں اضافے کا ایک لازمی نتیجہ مذہبی شدت پسندی میں اضافے کی صورت میں بھی سامنے آتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ مذہبی شدت پسندی کے دوسرے اسباب بھی ہیں جن کا تجزیہ ایک علیحدہ مضمون میں کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اس جانب توجہ دلانا مطلوب ہے کہ اگر علما اور مسلم رہنما غور کرتے اور اپنے سماج میں تبدیلی لانا اور اسے ترقی یافتہ بنانا انھیں مقصود ہوتا تو وہ زکوٰۃ اور وقف کے پیسے سے مذہب کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم کے ادارے قائم کرنے/کرانے کی طرف بھی توجہ دیتے لیکن وہ ایسا نہیں کرتے کیوں کہ اس سے وہ نظام درہم برہم ہو جائے گا جس پر ان کی اپنی بقا کا انحصار ہے۔ ایک جدید ریاست میں اس طرح کے ادارے عوام کی ترقی میں رکاوٹ بنتے ہیں لیکن حکومت کی طرف سے ان پر کسی قسم کی پابندی بھی نہیں لگائی جا سکتی۔ ویسے بھی مفاد پرست عناصر انھیں ہوا دیتے ہیں، اور ان عناصر کی اپنی طاقت ہوتی ہے جس کو سیاسی جماعتیں نظر انداز نہیں کر سکتیں۔

ایک مسئلہ اور بھی ہے۔ مدرسوں میں پڑھنے والے طالب علم اب عموماً ناخواندہ یا معمولی تعلیم یافتہ گھرانوں سے آتے ہیں، اور معاشی طور پر مسلمانوں کے سب سے زیادہ پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت اس نہج پر نہیں ہوتی کہ یہ اپنے نظام تعلیم کا از خود تنقیدی جائزہ لے سکیں۔ ان مدارس میں نئے مضامین اور نئے نظریات کی تدریس بھی نہیں ہوتی، تعلیم کا طریق کار بھی فرسودہ ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کئی صدیوں سے نصاب نہیں بدلا گیا ہے، اس لیے یہاں طالب علموں کی ذہنی تربیت صرف ہدایات سننے اور ان پر مشینی طریقے سے عمل کرنے تک محدود ہو جاتی ہے۔ سخت نظم وضبط میں جکڑے ان طالب علموں کو مخصوص موضوعات سے ہٹ کر کتابیں پڑھنے کی اجازت نہیں ہوتی اور نصاب کے طور پر وہاں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، وہ اسلام کے اس زاویے کو پیش کرتی ہیں جو صرف ملائیت کی توسیع میں معاون ہو سکے۔ ادب کے مطالعے، کھیل کود اور ٹیلی ویژن جیسی چیزوں پر پابندی کے سبب دینی مدارس کے فارغین زندگی کے متنوع پہلوؤں سے واقف ہی نہیں ہو پاتے۔ ایک شہری کے طور پر مخصوص حالات میں کس طرح اپنا ردعمل ظاہر کریں اور ان حالات کو کس طرح سمجھنے کی کوشش کریں جو ہندوستان جیسے تکثیریتی معاشرے کے پروردہ ہیں، یہ اور اسی قسم کے سوالات سے نبرد آزما ہونا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر دنیا کے کسی بھی کونے میں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف تو وہ اپنا جذباتی ردعمل ظاہر کرتے ہیں لیکن غیر مسلم پائمال طبقے پر ہونے والے مظالم پر وہ خاموش رہتے ہیں، جب کہ مہذب معاشرے میں اتنی تو توقع کی ہی جاتی ہے کہ آپ انسانیت کو مقدم سمجھیں اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے میں مذہبی بنیادوں پر تفریق نہ کریں۔

اس نہج پر دی جانے والی تربیت کا طالب علموں پر جس طرح کا اثر پڑتا ہے، اس کے سبب کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیاست کے داؤ پیچوں سے لاعلم یہ سادہ ذہن طالب علم ان مفاد پرست سیاسی عناصر کے شکار ہو جاتے ہیں جن کا تعلق عموماً اعلیٰ طبقے سے ہوتا ہے۔ مذہب کے نام پر ان کو گروہ بند کر لینا آسان ہوتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر اس سیاق و سباق میں اسامہ بن لادن، محمد عطا اور عمر شیخ جیسے لوگوں کی مثال دی

جاسکتی ہے، جنھوں نے مذہب کو ہتھیار بنا کر اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا اور مدرسے کے طالب علموں کو رضا کاروں اور فدائین کے طور پر بھرتی کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ القاعدہ جیسی تنظیموں کے اکثر معروف لیڈر مغربی ممالک کے سیکولر تعلیم کے اداروں کے فارغین ہیں جو ابتدا میں امریکی مفادات کی خدمت بھی انجام دے چکے ہیں۔

ہندوستان میں بھی، مذہب کے استحصال کی کئی بڑی نمایاں مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ایک مخصوص مسلم آئیڈیالوجی سیاست کے افق پر انیسویں صدی کے نصف آخر سے سامنے آنا شروع ہوئی۔ پھر بیسویں صدی کی ابتدا میں دیوبند تحریک کے اثرات نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ کچھ عرصے بعد جماعت اسلامی جیسی تنگ نظر اور احیا پرست جماعتیں مذہب کے مرکزی حوالے سے اپنے پرچم تلے مسلمانوں کو جمع کرنے کی کوششوں میں کامیاب ہونا شروع ہوئیں۔ کے ایم اشرف نے اپنی کتاب "An Overview of Muslim Politics in India" میں اس امر کی جانب اشارہ کیا ہے کہ ۱۹۱۲ اور ۱۹۲۴ کے درمیان احیا پرست قوتوں کی قیادت میں شروع ہونے والی تحریکیں (مثلاً احرار لیگ اور بعد میں علی برادران کی خلافت تحریک) اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام ہوتی رہیں۔ اپنے موقف کو مزید واضح کرتے ہوئے اشرف لکھتے ہیں؛ اس قسم کی ناکامیوں کا مسلسل منھ دیکھتے دیکھتے مسلمان عموماً بددل اور مایوس ہو چکے ہیں اور بزرگ عمائدین پر مزید بھی بھروسہ کرنے کو تیار نہیں.... مایوسی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ذہنی پراگندگی ہر سو نظر آتی ہے۔'' مایوسی اور ذہنی پراگندگی کی اسی کیفیت کا شکار مسلم نوجوان طبقہ آج بھی ہے، کیوں کہ معاشرے کے عمومی حالات آج بھی اس کے لیے اتنے ہی غیر یقینی اور مایوس کن ہیں۔ مسلم نوجوان کی عمومی پسماندگی اور مایوسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مفاد پرست قوتیں ان کو مذہب کے احیا، مسلم قوم پرستی اور برادرانہ اتحاد کے نام پر نام نہاد جہاد کی غلط راہ پر ڈال سکتی ہیں۔ عموماً غریب گھرانوں سے تعلق رکھنے والے یا بے روزگار نوجوان اس قسم کے نظریات کا شکار دو وجوہ سے بآسانی ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ ان کی اپنی مذہبی شدت پسندی کو تسکین ملے گی، اور دوسرے یہ کہ روزی روٹی کا وسیلہ بھی فراہم ہوگا۔ دیکھا جائے تو ان کا یہ رویہ ان نیم خواندہ، غریب بے روزگار ہندوؤں سے قطعی مختلف نہیں ہوگا جو کچھ پیسوں کی خاطر یا پھر مذہب کے نام پر بڑی آسانی سے ہندو فرقہ پرست تنظیموں کے چنگل میں آتے رہے ہیں، جس کی قریبی مثالیں بابری مسجد کو توڑنے والے کارسیوکوں اور ۲۰۰۲ کے گجرات کے فسادات میں شریک ہونے والے آدی واسیوں سے دی جاسکتی ہیں جن کو ہندو قوم پرستی کی تحریک میں شامل کرنے کی منظم کوششیں سنگھ پریوار عرصے سے کر رہا ہے۔

اس قسم کی صورت حال کو روکنے کا سب سے بہتر طریقہ تو یہی ہوگا کہ ان حالات کو تبدیل کر دیا جائے جن کے سبب نوجوانوں کے جہادی تنظیموں میں شامل ہونے کے امکانات رہتے ہیں، اور حالات کو اس طرح سازگار بنانے کی کوششیں کی جائیں کہ وہ نئے حالات پر اعتماد کرتے ہوئے مثبت طرز فکر اختیار کریں۔
ہندوستان میں مسلمانوں کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ان کے حقیقی مسائل کی طرف کوئی بھی توجہ دینے کو

تیار نہیں ہے؛ یہ مسائل دراصل ان کے تعلیمی اور اقتصادی مسائل ہیں۔ اس سلسلے میں بے حسی کا جو عام ماحول پایا جاتا ہے، اس کی ایک بڑی وجہ مسلمانوں کا یہ مزاج بھی ہے کہ مساوی حقوق کے حامل شہری کے طور پر وہ اپنے حقوق کا مطالبہ نہیں کرتے اور اس کے بجائے اس مایوسانہ ردعمل میں کہ حکومت ان کے لیے کوئی سہولت بھی فراہم نہیں کرے گی، وہ مدارس کے فروغ اور تحفظ کی بات کرتے ہیں۔ قومی سطح پر سیاسی جماعتیں بھی مسلمانوں کی فکر میں تبدیلی لانے کی کوئی مثبت کوشش نہیں کرتیں۔ وہ صرف سیاسی آنکھ مچولی کھیلتی ہیں۔ حمایت اور مخالفت کے تمام رشتے ووٹ بینک کی سیاست کے مطابق بنتے اور بگڑتے ہیں، اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ ووٹ بینک کی سیاست نے آج جو راستہ اختیار کیا ہے، اس میں ہمارا موجودہ سماجی و سیاسی ڈھانچہ مسلمانوں کو مزید پسماندگی کی طرف دھکیل رہا ہے۔ ورنہ ایسا کیوں ہوتا کہ کانگریس جیسی سیاسی جماعتیں جو خود کو اقلیتوں کے مفاد میں کوئی ایسا بامعنی قدم نہیں اٹھاتیں جس سے اقلیتوں کا واقعی بھلا ہو؟ تقریباً پچاس سال تک ہندوستان پر حکومت کرنے کے باوجود کانگریس نے مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر توجہ دینے کی زحمت کیوں نہیں کی؟ تعلیم کے میدان میں مسلمانوں کی ترقی کی رفتار کا گراف دوسرے فرقوں سے نیچا کیوں ہے؟ وقتاً فوقتاً سامنے آنے والی سروے رپورٹیں آخر یہ کیوں بتاتی ہیں کہ ملازمتوں کے شعبوں میں مسلمانوں کی تعداد لگاتار گھٹ رہی ہے؟ مسلم علاقوں میں سرکاری اسکولوں کی تعداد ناکافی کیوں ہے؟ کیا یہ صورت حال مسلمانوں کی اسی ناز برداری کا نتیجہ ہے جو کانگریس (سنگھ پریوار کے مطابق) مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے کرتی رہی ہے؟ اسے آپ محض بے اعتنائی کہیں گے یا پھر سوچا سمجھا تعصب؟ یہ بات سب مانتے ہیں کہ پسماندہ طبقات کی فلاح کے لیے مثبت امتیازی اقدامات کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی دور کرنے کے لیے کتنی اور کون سی بامعنی اسکیمیں جاری کی گئیں؟

حقیقت یہ ہے کہ کانگریس میں کسی دور میں کالی بھیڑوں کی کمی نہیں رہی۔ ہٹلر کے ان مداحوں اور فرقہ پرستوں کو اپنے تعصب کا زہر پھیلانے کا موقع اس وجہ سے حاصل رہا کہ کانگریس کی لیڈر شپ نے ہمیشہ ایک مجرمانہ خاموشی اختیار کر کے ان کو شہ دی۔ اکثر تعصب پرست لیڈر مسلمانوں کے خلاف متعصبانہ رویے کا یہ جواز دیتے ہیں کہ مسلمانوں نے دو قومی نظریے کو فروغ دیا اور وہ ملک کی تقسیم کے ذمے دار ہیں۔ اس الزام کو اس لیے قبول نہیں کیا جاسکتا کہ ایک تو تقسیم کا خاکہ ہرگز تیار نہیں کیا گیا تھا، دوسرے ان سیاسی لیڈروں کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہندوستان بہرحال ایک سیکولر جمہوریت ہے، مذہبی ریاست نہیں۔ ملک کو سچ مچ سیکولر اور جدید ریاست بنانے کی کوششیں اگر کی جاتیں اور آئینی ہدایات کے مطابق کمزور طبقوں کو مضبوط بنایا جاتا تو آج حالات اتنے ابتر نہ ہوتے جتنے وہ ہو چکے ہیں۔ لیکن ووٹ بینک کی سیاست نے معاشرے میں اپنی جڑیں اس طرح مضبوط کر لی ہیں کہ اس کے سبب بہت طبقات کی ترقی کی راہیں مسدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ آج کا سیاسی ڈھانچہ جس میں مسلمان مسلسل پسماندگی کی طرف جا رہا ہے، وہ دراصل کانگریسی حکمرانوں کی پالیسیوں ہی کا نتیجہ ہے۔

مثال کے طور پر مدرسوں کی جدید کاری کی معروف اسکیم کو پیش کیا جاسکتا ہے جس کی بنیاد

راجیو گاندھی کی وزارت عظمٰی کے دوران پڑی تھی اور جس کا سیاسی فائدہ مرلی منوہر جوشی نے این ڈی اے کے دور حکومت میں فروغ انسانی وسائل کے وزیر کی حیثیت سے اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ مدرسوں میں جدید کاری کی یہ اسکیم کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی، کیوں کہ مدارس کا بنیادی مقصد جدید طرز تعلیم کی فراہمی ہرگز نہیں ہے۔ ان کا رول مذہبی معاملات کے دائرے سے باہر نہیں ہے، اور اس لیے مدارس جدید تعلیم کے اسکولوں کا متبادل نہیں ہو سکتے۔ مدرسوں کے لیے معمولی رقم مختص کر کے حکومت مسلمانوں کے ایک بڑے مسئلے کے تئیں اپنی ذمے داریوں سے دامن بچا رہی ہے۔ مدارس کی جدید کاری کا جو ڈھنڈورا وہ پیٹتی ہے، وہ نہ تو حکومت کو کوئی فائدہ پہنچاتا ہے اور نہ مسلمان ہی اس سے خوش ہیں، کیوں کہ اس قسم کی سرکاری اسکیموں کو وہ اپنے مذہبی معاملات میں مداخلت سے تعبیر کرتے ہیں۔ نتیجتاً ان رقوم کا بھی وہی حشر ہوتا ہے جو دوسری فلاحی اسکیموں کا؛ یعنی اسکیم چلانے والے سرکاری افسر اور رضا کار تنظیموں کے ذمے دار مل کر انھیں ڈکار جاتے ہیں اور معمولی رقم ہی متعلقہ مقاصد پر خرچ کی جاتی ہے۔

ان حالات میں ایک مذہبی فرقے کے طور پر مسلمانوں کو یہ سوچنا ہوگا کہ آج کے دور میں ان کی ضرورت صرف روایتی دینی مدرسے نہیں ہیں بلکہ انھیں اس جدید تعلیم کی بھی ضرورت ہے جسے اختیار کر کے دوسری قومیں ترقی کی راہوں پر آگے بڑھ رہی ہیں۔ پیچھے کی طرف دیکھتے رہنے یا جدید تعلیمی نظام کے چند نقائص کی نشان دہی کر کے اسے چھوڑ دینے سے ان کا کچھ بھلا نہ ہوگا۔ مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقے اور بالخصوص روشن خیال نوجوان طبقے کو اس ضمن میں فعال کردار نبھانا ہوگا۔ سیاسی شعور کا ثبوت دیتے ہوئے انھیں کمیونٹی اسکولوں کے قیام کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے اور اس کے لیے تمام وسائل کی خبر رکھتے ہوئے سرکاری انتظامیہ کو متوجہ کرنا اور اس پر دباؤ ڈالنا چاہیے کہ وہ لوگوں کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرے۔

اس ضمن میں ایک حکمت عملی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مسلمان سیاسی اکائی کے طور پر سیاسی جماعتوں کو اپنی قوت کا احساس کرائیں اور حکومت سے تعلیمی سہولتوں کا مطالبہ کریں۔ اس طرح گو آہستہ ہی سہی، لیکن یہ سہولتیں مہیا ہو جائیں گی۔ حالات سے بھرپور استفادے کے لیے مسلمانوں کو عہد وسطیٰ کے گرد طواف کرنے والے اپنے طرز فکر سے بھی نجات حاصل کرنی ہوگی۔

حاشیہ

(۱) دُوِج: اعلیٰ ذات کے ہندو جن میں برہمن، چھتریہ، اور ویش شامل ہیں، دُوِج (dvija) کہلاتے ہیں۔ دُوِج سنسکرت کا ایک مرکب لفظ ہے جس کے معنی ہیں: دوبارہ جنم لینے والا۔ اعلیٰ ذات کے ہندو بچے کی جب باقاعدہ تعلیم شروع ہوتی ہے تو اس موقعے پر اُپ نین کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ برہمن کو پانچ سال کی عمر میں، چھتریہ کو تیرہ اور ویش کو کم از کم سترہ برس کی عمر میں برہما اُپدیش کی تعلیم دے کر یہ رسم ادا کی جاتی ہے، اس موقعے پر برہمن بچے کو جنیؤ پہنایا جاتا ہے۔ نچلی ذات کے ہندو، جو شودر کہلاتے ہیں (آج کل کی اصطلاح میں دلت طبقہ) تعلیم کا حق نہیں

رکھتے، اس لیے وہ دُوِج نہیں ہیں۔

کتابیات

(۱) سید مناظر احسن گیلانی، ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت''، ندوۃ المصنفین، جامع مسجد، دہلی، ۱۹۸۷۔

(۲) قمر الدین، ''ہندوستان کی دینی درس گاہیں''، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کا کل ہند سروے، دہلی، ۱۹۹۶۔

(۳) سلامت اللہ، ''ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم''، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۰۔

(۴) ''خطبات سرسید''، جلد اول و دوم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۲۔

(۵) کے ایم اشرف، "An Overview of Muslim Politics in India"، مانک پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۱۔

(۶) مولانا وحید الدین خاں، ''تبلیغی تحریک''، نئی دہلی، ۱۹۹۴

بچہ اور تصور خدا

عرفان شہزاد

فرائڈ کہتا ہے کہ انسان اپنے لیے خدا کا پہلا تصور اپنے والدین سے لیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بچہ پہلے پہل اپنی ماں کے تاثر سے خدا کا تصور تشکیل دیتا ہے۔ پھر کچھ عرصہ بعد اس تصور خدا میں ماں کی جگہ باپ آ جاتا ہے جو زیادہ مضبوط اور محافظ محسوس ہوتا ہے۔ باقی کی ساری عمر اپنے باپ جیسے خدا کا تصور انسان کے ذہن میں موجود رہتا ہے۔ میں اس میں اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ بچہ اپنا تصور خدا ماں باپ کے علاوہ اپنے پہلے استاد یا اساتذہ سے بھی اخذ کرتا ہے، جیسا کہ میرا تجربہ تھا اور اس کی تائید دیگر لوگوں کے تجربات سے بھی ہوتی ہے۔ ہر شخص اپنے بچپنے میں اس تجربے سے گزرتا ہے اور اس کو سمجھ سکتا ہے۔ بہت سے بچے اپنے مذہبی پیشوا سے خدا کا تصور لیتے ہیں۔

دولوگ (ناول کا ایک باب)

گلزار

تقسیم ہندار دو ہندی کے لیے پرانا موضوع ہے، اس پر بہت سی کہانیاں اور ناول لکھے جا چکے ہیں، مگر گلزار صاحب کا ناول ہمیں اس حادثے کے ستر برس گزر جانے پر بھی اس زخم کی تازگی کا احساس دلاتا ہے۔ ہم وہ بدنصیب لوگ ہیں جنہوں نے اپنی تاریخی غلطیوں سے کچھ نہیں سیکھا، بلکہ آج بھی سینہ پھلا کر اسی غلطی کو دوہرانے کا عزم رکھتے ہیں... وہ نسل جس نے آنکھ ہی آزادی کے چالیس پینتالیس سال گزر جانے کے بعد کھولی، اس کرب کا اندازہ کیسے لگا سکتی ہے جو دونوں طرف کے مہاجروں اور شرنارتھیوں نے جھیلی مگر ہمارے پاس ایک قصہ گو ایسا موجود ہے جس کی آنکھیں ابھی پتھر نہیں ہوئیں اور جو لوگوں کے زمین کی پتھریلی تختی پر لال لکیریں کھینچنے کے شوق کو ابھی بھی اسی طرح دیکھ رہا ہے۔ یہ ناول ہمیں پڑھنا چاہیے، ہم دونوں ملکوں کی عوام کو جو ایک سے دو اور دو سے سو ٹکڑوں میں تقسیم گئے۔ یہ ناول بتاتا ہے کہ بٹوارہ صرف ملکوں کا نہیں ہوتا، نسلوں کا بھی ہوتا ہے۔ (مدیر)

دو بہنیں

''لوکی جب تک ڈیڑھ دو سال کا نہیں ہو گیا، مونی نے اس کے بال نہیں کاٹنے دیے تھے۔''

سونی یہ بات تیسری بار سلام صاحب کو بتا رہی تھی۔ ''میں نے کہا بھی ایک بار تو بولی؛ لے، سکھ ہے، کیسے کاٹ دوں اس کے کیس؟''

سلام صاحب باقی ساری بات خود بھی دہرا سکتے تھے۔

اور پھر ایک دن خود ہی قینچی کنگھی لے کر مونی اس کے بال کاٹنے بیٹھ گئی۔ بار بار آڑھے ترچھے انداز سے اسے دیکھتی جا رہی تھی۔

اچانک سونی کمرے میں داخل ہوئی تو بولی؛ ''دیکھ سونی! یہ بالکل ویسا ہی نہیں لگتا جو روز ہمارے ساتھ بلاتکار کیا کرتا تھا؟''

اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کا پاگل پن تھا۔ سونی ڈر گئی۔

''دھت پاگل!'' اور لوکی کو اٹھا کر کمرے سے باہر لے گئی۔ مونی کی وہ آنکھ سونی بھول نہیں پائی۔ ایک ڈر بیٹھ گیا اس کے دل میں۔

سلام صاحب جیپ چلا رہے تھے۔ سونی چپ چاپ بیٹھی تھی۔ ڈرائیور پیچھے بیٹھا تھا۔ وہ کوٹہ سے آلفہ نگر جا رہے تھے؛ یہ پتہ لگانے کہ لوکی کسی 'مورگ' میں پڑا ہے، یا پولیس والوں نے کہیں دفنا دیا۔ سونی کی تمام زندگی کو وہ اب ایسے ہی جانتے تھے جیسے انھیں پر بیتی ہو۔

مونی سونی بارڈر پار کر کے جب امرتسر پہنچی تھیں تو وہاں رفیوجی کیمپ نہیں تھ بلکہ پورا ایک کیمپوں کا شہر بنا ہوا تھا۔ سرکاری کیمپوں کے علاوہ جہاں کہیں دیوار دِکھی، اس کے سایے میں آٹھ آٹھ دس دس خیموں کے کیمپ لگ گئے تھے۔ ملک کے بارڈر تو دور کی بات تھی، شہروں کے بارڈر ہی سمجھ نہ آتے تھے، کون کہاں پہنچا ہوا ہے؟ لوگ بچوں، بوڑھوں، بیٹے بیٹیوں کے ہاتھ پکڑے ہوئے، ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ میں یوں گھوم رہے تھے، جیسے ہوا کے ریلے سوکھے پتوں کو اڑائے پھر رہی تھی۔ بہت سے لوگ گھر خاندان سنبھالے ہوئے ہندوستان تو پہنچ گئے لیکن یہاں آ کر ایک دوسرے سے ہاتھ چھوٹے اور گُم ہو گئے؛ پتہ ہی نہیں چلا بوکھلاہٹ کس طرف اڑا کر لے گئی۔ بہت سے لوگ جو کچھ مالیت لے کر پہنچ گئے، وہ یا تو گمشدہ رشتے داروں کو ڈھونڈ رہے تھے، یا ساتھ لگے رشتے داروں سے الگ ہو کر گُم ہوتے جا رہے تھے۔ پشتوں سے ایک ہی شہر میں بسے ہوئے لوگوں کے سامنے، ہندوستان کے تمام شہروں کے نقشے کھل گئے تھے۔ جن شہروں کے بارے میں پڑھا تھا، سنا تھا، یا جہاں کسی سے کوئی خط و کتابت کی تھی، وہاں پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ راہ چلتے کوئی ہمدرد مل گیا یا ہمدرد بن گیا، اس نے ہاتھ پکڑ لیا تو اس کے ساتھ چل دیے۔

سونی، مونی کا اصلی نام سرجیت اور منجیت تھا۔ شاید جڑواں ہی تھیں۔ دونوں نے لوہے کے کڑے پہن رکھے تھے۔ سرجیت، منجیت کے ساتھ تو کوئی بھی نہیں تھا۔ جس قافلے کے ساتھ امرتسر پہنچیں تھیں، ان سے چھوٹ گئیں۔ گرودوارہ ''دربار صاحب'' کا جانتی تھیں۔ سب سے پہلے وہاں جا کر سیس نوائے، ماتھا ٹیکا، سرور میں ڈبکی لگائی اور گرودوارے کے لنگر میں بیٹھ کر کھایا تو ایک ایک روٹی کُرتی میں چھپا لی؛ پتہ نہیں شام کو ملے نہ ملے۔ وہیں ایک طرف، سیوادار ضرورتمندوں کو تن ڈھانپنے کو کپڑے، چادریں، کمبل، لوئیاں بھی بانٹ رہے تھے۔ ننگے سر بہنوں کو دوپٹے مل گئے، کچھ اوڑھنے بچھانے کو مل گیا۔

لاوارث، دو نوجوان نو عمر لڑکیوں کے لیے، کیمپوں میں رہنا اتنا آسان نہیں تھا۔ واہیگورو کے نام پر ایک سیوادار کسی سنسان سی گلی میں ایک جلی ہوئی مسلمان کی حویلی تک انھیں لے

بھی گیا، گھر دینے کا لالچ دے کر۔سیوادار نے کہا،''لوگ گھستے چلے آرہے ہیں۔ہم نے بچا کے رکھا ہے یہ مکان۔اوپر دو کمرے آپ رکھ لیجیے، نیچے ہمارا پریوار بھی آجائے گا۔''

لیکن وہ دونوں ڈر کے بھاگ آئیں۔ وہ جلی ہوئی حویلی بھی کچھ ویسی ہی تھی جیسی اس طرف کی، جہاں دنگائیوں نے انھیں لے جاکر باندھ دیا تھا۔ وہ ٹرک والا وہاں نہ پہنچتا تو؟ آج کیا وہ زندہ ہوتیں؟ کیا پتہ کہاں ہوتیں؟ کیا ہوتیں؟

اس حادثے کے بعد دونوں کچھ محتاط ہوگئیں لیکن کیا کرتیں، باہر سے لوگوں کے ریلے پر ریلے آرہے تھے۔ ہر ریلے کے ساتھ پہلے سے آئے لوگ پیچھے دھکیلے جاتے۔ رکنے ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔

یہاں پہنچنے تک ریل گاڑیوں کا ایک ہی رخ تھا؛ ایک ہی مقام تھا، امرتسر۔ امرتسر کے آگے بارڈر ہے، واپس جانے کے لیے۔امرتسر سے گاڑیاں ہر ایک طرف نکل رہی تھیں۔بسیں بھی تھیں۔ٹرک بھی تھے لیکن وہ صرف ان کے لیے جن کی جیب میں دام تھے۔ ریل گاڑیوں میں ٹکٹ نہیں تھے،اس لیے من مرضی سے چل رہی تھیں۔ بہت سے لوگ تو صرف اسی گاڑی میں سوار ہوجاتے تھے، جو جلدی چل دیتی تھی؛ کسی طرح اِس کیمپوں والے شہر سے باہر تو نکلیں۔

ہفتوں دھکے کھاتے کھاتے ایسی ہی ایک گاڑی میں سونی اور مونی بھی سوار ہوگئیں۔ پتہ نہیں کون سا اسٹیشن تھا جہاں جاکر گاڑی نے سب کو باہر انڈیل دیا۔سفر میں جو لوگ ساتھ ہوئے تھے ان لوگوں نے کہا،''یہاں نہیں۔گاڑی بدل لو۔آگے جانا ہے۔''

گاڑی بدل کے پھر چل دیے۔ کچھ روز اس پلیٹ فارم پر بھی رہ کر پھر گاڑی بدل لی۔ دونوں شہر در شہر ایسے ہی راستے بدلتی گئیں جیسے گاڑی پٹری کے کانٹے بدلتی ہے۔ ہندوستان پہنچ کر بھی کہیں ٹھکانہ نہیں بنا۔دن مہینوں میں بدلنے لگے۔

مونی بیمار رہنے لگی، چہرہ زرد پڑنے لگا، پھر الٹیاں کرنے لگی۔ پھر احساس ہوا بلاتکار پیٹ میں ٹھہر گیا ہے۔گرانے کی جگہ نہیں تھی،موقع نہیں تھا۔سفر چلتا ہی جا رہا تھا۔

مونی اپنا پیٹ پیٹتی تھی اور روتی تھی۔

''میرا دشمن پل رہا ہے پیٹ میں۔کیا کروں؟ میں مَروں تو یہ مرے۔''

☆

کون سیوک تھا، کون سوار تھی، پتہ نہیں چلتا تھا، لیکن اب لوگ آپس میں چپکنے لگ گئے تھے۔ دو چار دن ساتھ رہے اور گچھا بن گیا۔جھنڈ کے جھنڈ ہی ساتھ چلتے تھے۔

ایک اور طرح کے جھنڈ بھی گھوم رہے تھے، جو 'شرنارتھیوں' کو لوٹ رہے تھے۔ ان کی

مجبوریوں کا فائدہ اٹھا رہے تھے۔

کچھ سیوک جو بسیں بھر لیتے تھے، اڈوں اور اسٹیشنوں سے کیمپوں میں لے جانے کے لیے، آدھے راستے میں شرنارتھیوں سے کرایہ مانگ لیتے، نہ دینے پر بیچ راستے میں اتار دینے کی دھمکی دیتے۔ اکیلے کون اترتا اُجاڑے میں؟ کوئی انٹی سے کچھ نکالتا، کوئی چوڑی کنگن کھول کر دے دیتا؛ اکثر آس پاس کا کوئی مدد کر دیتا۔ بے گھروں میں بڑی مروت ہوتی ہے۔اپنے ملک میں آکر بھی مہاجر تھے، شرنارتھی تھے۔

'بوندی' کے قلعے میں شرنارتھیوں نے جگہ بنالی تھی اور راشٹریہ سیوک سنگھ والے ہر کسی کی مدد کر رہے تھے۔ قلعے پر نو سو سال کے بعد بھگوا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

قلعہ میں رفیوجیوں کے کئی پریوار تھے۔یہیں ایک پنجابی پریوار کی بڑی بے بے نے مونی کا پیٹ دیکھ لیا تھا۔مونی کا پیٹ ذرا ذرا دِکھنے لگا تھا۔ بے بے بھانپ گئی تھی مگر ان کے ساتھ کوئی مرد تو تھا نہیں۔ پوچھنے پر بڑی بے بے سے جھوٹ کہا سونی نے۔ان کا خاندان اور مونی کا خاوند مارے گئے اُس پار۔سونی پیٹ سے تھی جب ہم بچ کے نکل گئے رفیوجیوں کے ایک ٹرک میں۔ پوری بات میں صرف ٹرک کا ذکر ہی سچ تھا۔

بے بے کے نو بیٹے تھے جو اپنے پورے پریوار کے ساتھ بچ کے نکل آئے تھے اور خیر سے کافی مالیت بھی بچا کر لے آئے تھے۔ حالانکہ گھر جائیداد اور باقی ماندہ مال مویشی وہیں رہ گئے، خوش قسمت تھے کہ ان کے خاندان سے کوئی مرا نہیں۔صرف ایک دادا رہ گئے جو وقتِ آخری دم تک یہی کہتے رہے۔

''تم سب واپس آجاؤ گے۔اور دیکھ لینا اللہ نے چاہا تو یہ قیامت بھی نکل جانی ہے!''

وہ اللہ بھی اتنی ہی آسانی سے کہہ لیتے تھے جتنے سادھارن سبھاؤ میں واہیگورو کہتے تھے۔

بے بے اپنی 'سوٹی' (چھڑی) لیے قلعے میں گھومتی رہتی تھیں۔ بیٹے کبھی کبھی مذاق بھی کر لیتے تھے۔

''بے بے لگتا ہے، پچھلے کسی جنم میں یہاں کی مہارانی تھیں آپ؟ یہ قلعہ آپ ہی نے تو نہیں بنوایا تھا؟''

دوپٹہ سر پہ کھینچ کر بولتیں،''ہور کیا؟ یہ سب ہماری ہی تو پرجا ہے!''

بے بے واقعی مہارانیوں جیسی تھیں۔

ایک دن قلعے کی اس بُرجی میں چلی آئیں جس میں سونی اور مونی نے اپنی 'ہنڈ کلیہ' سجالی تھی۔

''کیسی ہو بیٹیو؟ روز دیکھتی ہوں تم دونوں کو نیچے جاتے۔اُترائی تک جاتی ہو کیا؟'' ندی پاس ہی بہتی تھی، اس کے پاس بسی بستیوں کو لوگ اُترائی کہنے لگ گئے تھے۔

''نہیں بے جی! پیچھے کے گاؤں میں کچھ کام کاج ہو تو کر لیتی ہیں۔''
مونی کنستر لے کر وہاں سے اٹھ گئی۔ سونی بات کرتی رہی۔
''کیا کام کرتی ہو؟''
''کچھ بھی ماں۔ کپڑے لتے دھونے سے لے کر برتن بھانڈے مانجھنے کا کوئی کام ہو تو''
''مل جاتا ہے کچھ؟''
''غریب لوگ ہیں بے جی، انھیں نوکروں کی کیا ضرورت؟ پر لیپ لپائی میں کوئی ہاتھ بٹوا لیتا ہے۔ کوئی ویسے ہی کچھ دے دیتا ہے۔''
''پیچھے کہاں سے ہو؟''
''خوردہ، ضلع کیمبل پور! آپ؟''
''ڈیرہ خیل خاں سے۔ اٹک سے بہت دور نہیں ہے۔ کیمبل پور کو پہلے اٹک ہی کہتے تھے۔''
مونی کنستر پانی کا بھر کے لے آئی، رکھتے ہوئے پہلو میں درد ہوا۔ بے بے فوراً بولی۔
''وکھی میں بل پڑ گیا کیا؟'' پھر کہا، ''ادھر آ بیٹی۔ وکھی مل دوں۔ اتنا بوجھ نہ اٹھایا کر۔''
پھر سونی کو دیکھ کر بولیں، ''اتنے دن سے اس کی چال دیکھ رہی ہوں۔ جانتی تھی پیٹ سے ہے، اسی لئے پوچھنے چلی آئی۔ اور کوئی نہیں ہے تمہارے ساتھ؟''
دونوں پر ایک چپ کی چھاپ لگ گئی۔ مونی کا چہرہ زرد تو تھا ہی اور پیلا پڑ گیا۔ بے بے سمجھ گئیں۔
''نو بیٹے جنے ہیں میں نے بیٹی۔ عورت کا انگ انگ جانتی ہوں۔ بڑا موہ تھا ایک بیٹی کا۔ پر، واہیگورو کی مرضی نہیں تھی۔''
دبی سی آواز میں سونی نے کہا؛ ''آپ کے بیٹے ساتھ ہیں؟ سب؟''
''تین ساتھ ہیں یہاں۔ دو آگے گئے ہیں۔ بارہ، چودہ میل آگے کوٹہ میں ایک گاؤں ہے، آلفہ نام کا۔ جانے گاؤں ہے کہ قصبہ ہے؟ کسی انگریز کے نام پر ہے۔ وہاں زمین دیکھنے گئے ہیں۔ پیچھے بھی ہم لوگ کھیتیاں ہی کرتے تھے۔''
مونی کا پیٹ سہلاتے ہوئے انھوں نے پوچھ لیا؛ ''باپ کہاں سے ہے اِس کا؟''
مونی کا گلا رندھ گیا، بول نہ سکی۔ پر، سونی نے جھوٹ بول دیا؛ ''خوردہ میں قتل ہو گئے۔ سب مارے گئے۔ ہمیں بچا لیا ایک... ایک ٹرک والے نے، جو رفیوجیوں کو لے کر جا رہا تھا۔''
سونی کا گلا بھی بھر گیا۔
سوٹی ٹیکتی ہوئی بے بے، بُرجی اتر کے قلعے میں گُم ہو گئیں۔
دوپہر بعد ایک بار پھر لوٹ کر آئیں۔ مونی سے کہا، ''دیکھ دھیئے، کوکھ میں اولاد ہو خصم

کی، تو اس کے بعد بھی عورت سہاگن ہی رہتی ہے۔ یہ کالا دھاگا پہن لے۔ گلے میں سونا چڑھی کوڑی ہے۔ اسی کو منگل سمجھ کے پہن لے۔ تو سہاگن ہے، وِدھوا نہیں ہے!'' اور ایک کنواری کو سُہاگن بنا کر چلی گئیں۔
بے بے اور مونی کے بیچ ایک عجیب سی آنکھ مچولی شروع ہو گئی۔ مونی بُرجی سے اترنے سے پہلے دیکھ لیتی، باہر کہیں بے بے تو نہیں ٹہل رہی ہے۔ اور بے بے تھی کہ جب بھی پچھی برآمدے سے نکلتیں، سیدھی بُرجی پہ نظر پڑتی۔ اِس آنکھ مچولی میں کوئی نہ کوئی تو ایک دوسرے کو دیکھ ہی لیتا۔ بے بے جب ملتیں، بڑی بوڑھیوں کی طرح زچگی کے بارے میں کوئی نہ کوئی ہدایت ضرور دے دیتیں۔ چھوٹی موٹی گھریلو دوائیاں بتا دیتیں۔ نُسخے بتا دیتی، اور یہ ضرور پوچھتیں، ''کھٹا کھانے کو جی کرتا ہے پُتر!؟ اِملی منگا دوں بیٹے سے کہہ کے؟''
مونی نہ ہاں کہتی، نہ 'نہ' کہتی، بس ٹال جاتی۔
ایک دوپہر کو بُرجی میں بیٹھی تھیں تو سونی نے پوچھ لیا؛ ''یہ آپ کھٹے کا کیوں پوچھتی ہیں ہمیشہ؟''
''کھٹے کو زیادہ جی کرے تو کہتے ہیں، بیٹی ہوتی ہے۔ میرا تو کبھی جی نہیں کیا۔ زبردستی ہی کھٹے کمرخ اور املی منگا کے کھاتی رہتی تھی۔''
''وہ کیوں بے بے؟''
''دیکھ ناں! نو بیٹے جنے۔ آگے بیٹوں کے ہاں بھی بیٹے ہوئے۔ بیٹی کو خاندان ترس گیا ہمارا؛ نہ ہوئی!''
ہلکا سا گلا رُندھ گیا بے بے کا۔ مونی کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے بولی۔
''دیکھ موہیئے! جے تو ہوئی کُڑی تو میری! میں پالوں گی۔ چھینوں گی نہیں تجھ سے، پر اس کی نانی دادی میں۔ تو جو کہہ لے۔ اور مُنڈا ہوا تو تیرا، میرے بہت ہیں۔ تو اپنے لاڈ پورے کرنا!''
کہتے کہتے بے بے کی آنکھیں نم ہو گئیں اور وہ اٹھ کر چل دی۔ مونی کا جی بھیگ گیا۔ پہلی بار اس نے پیٹ پہ ہاتھ پھیرا اور مسکرا دی۔
سونی کو بہت اچھا لگا۔
بے بے جس انگریز کی بات کر رہی تھیں، وہ بھی بارہ چودہ میل ہی دور تھا بُوندی سے۔ تقسیم کے دنگوں میں اس کی کوٹھی بھی جلا دی گئی۔ سنا گیا تھا، وہی لوگ تھے جنھوں نے بُوندی کے قلعے پر بھگوا جھنڈا لہرایا تھا۔ انگریز کوئی بڑا کاشتکار تھا؛ آلفہ نام کے اس گاؤں میں کوئی سو بیگھہ زمین تھی اس کی۔ اس کے مزارعے اور کسان اس کی زمینوں کے حصّے دار تھے۔ یہ قانون اور قاعدہ اس نے خود ہی بنایا تھا اور خود ہی اس پر عمل کر رہا تھا؛ لیکن جب انگریزوں کی حکومت ختم ہو رہی تھی تو اس نے اپنے آپ کو ہندوستانی ہونے کا اعلان کر دیا اور ہندوستانی شہری ہونے کا حق مانگا۔ لوگ کہتے ہیں

رات کو اٹھ کر، گھوڑے پر سوار ہو کر کھیتوں کا دورہ کیا کرتا تھا جیسے راجا پرانے زمانے میں اپنے شہروں میں پرجا کی خبر لیا کرتے تھے۔ بہت محبت کرتا تھا اپنی فصلوں سے!

مگر جب بلوؤں کی آندھی آئی تو اس کے کارندے اسے بچا نہ سکے۔ گھر بار مال مویشی سب لٹ گئے۔ فصلوں میں لگی آگ اس سے برداشت نہ ہوئی۔ پاگلوں کی طرح ان میں دوڑتا بھاگتا جل کر راکھ ہو گیا۔

اس کے بعد زمینیں تو آزاد ہو گئیں لیکن مزارعوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ جس کو جو حصہ ہاتھ آیا، بیچا اور بھاگ گیا۔ پنجاب بہت دور نہیں تھا۔ رفیوجیوں میں آئے پنجاب کے کسان اور زمینداروں نے زمینیں سمیٹنا شروع کر دیں۔

انھیں میں بے بے کے دو بیٹوں نے ایک بہت بڑا حصہ زمین کا وہاں سے خرید کے اپنا زمیندارانہ سے گھرانہ قائم کر لیا۔ پرانی وضع کی ایک ٹوٹی پھوٹی حویلی تھی بیچ کھیتوں کے، وہ بھی لے لی اور بُوندی قلعے سے بے بے کو یہاں بلوا لیا۔

بے بے کو جب خبر ملی تو سب سے پہلے بُرجی میں پہنچی۔ فرش پر اپنی سوٹی بجا کر بولیں؛ ''بس تم دونوں کو میرے ساتھ چلنا ہوگا!''

'پگڑی' دے کر مکان لینا ایک نئی روایت آئی تھی تقسیم کے ساتھ۔ جو لوگ کچھ پونجی لے کر بچ کے نکل آئے تھے اپنے گھروں سے؛ وہ لوگ اب کچھ رقم نقد دے کر کرایے کے مکان لے رہے تھے۔ کرایہ داروں سے گھر خالی بھی کرا لیتے تھے۔ اسی رقم کا نام 'پگڑی' دینا تھا۔

بے بے سچ مچ ایک بہت بڑے پریوار کی بے بے تھیں۔ پگڑیاں دے دے کر ان کا پریوار کھیتوں کے پاس کے گاؤں میں بسنے لگا۔ وہ ٹھکرائن تھیں پریوار کی۔ اجڑے کھیتوں کو پھر سے بیجنے کے لیے کام بھی بہت تھے۔ سب کو کام مل رہا تھا۔ بے بے کے بیٹوں نے گاؤں میں ایک مکان سونی مونی کو بھی لے دیا اور اپنا کرایے دار بنا لیا۔

مونی، دن بھر کچھ بھی کرے کہیں بھی رہے، ایک بار بے بے کو ملنا ضروری تھا۔ وہ نہ جائے تو بے بے اپنی سوٹی ٹیکتی ہوئی اس کے گھر تک آ جاتی تھیں۔

''تیرے تو لڑکی ہی ہونی ہے، جیسے بایاں پیر پٹک کے چلتی ہے ناں تو!''

بے بے کو یقین تھا، لڑکی ہی ہوگی۔ اِنچ اِنچ مونی کی کوکھ بھر رہی تھی۔ کبھی چڑ جاتی تو کہتی سونی سے؛ ''کسی دلّے کے ہاتھ بیچ دوں گی اسے!''

''تو بے بے کو ہی دے دے ناں، نہیں پالنا ہے تو!''

سچ تو یہ ہے بُوندی سے بے بے کے ساتھ چلے آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ یہ بات انھیں ہضم ہو گئی تھی کہ کوکھ میں اس کے شہید شوہر کی اولاد ہے۔ اب جو بھی شکل صورت نکلے اس کی۔ کسی نے دیکھا تھوڑا ہی تھا۔ لیکن بے بے کا کہنا تھا، ''لڑکی کی شکل بھی ماں پر ہی جائے گی۔ تجھ سے زیادہ

حسین نکلے گی۔''

بے بے نے لفظ 'حسین' ایسے کہا جیسے کسی 'پوتھی' سے نکال کے لائی ہو۔ ''سیاپے ڈالے گی میرے پوتڑوں دھوتڑوں کے لیے!'' اور ہنس دیتیں۔

جس رات درد اٹھے تھے مونی کے، بے بے ساری رات بیٹھی رہی مونی کے پاس۔ چھٹی پرانی ایک دائی کو گاؤں سے پکڑ کے لائے تھے۔ بڑی ضعیف تھی۔ نظر کم آتا تھا لیکن ہاتھ بڑے سڈول تھے۔ انگلیوں میں تجربے چڑھے ہوئے تھے۔

مونی کو لڑکا ہوا۔

بے بے کا دل بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں نمی آ گئی۔ بولیں؛ ''واہیگورو ابھی تک ناراض ہے مجھ سے۔''

مونی کی چھاتیاں ایسی بھریں کہ بھول ہی گئی کہ وہ کنواری تھی۔ ایسی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی تھی بیٹے کو، جیسے کوئی کرشمہ ہو گیا ہو۔ وہ غصہ، نفرت جس سے وہ پیٹ پیٹا کرتی تھی، پتہ ہی نہیں کہاں گھل گئی۔ وہ سارا زہر جیسے تھنوں میں گھل کے امرت ہو گیا تھا، یا وہ نیل کنٹھ شِو پی گیا جسے اس نے جنم دیا تھا۔

بے بے آیا جایا کرتی تھیں۔ بے بے کا موہ پھر بھی کم نہ ہوا۔ حالات ویسے تو نہیں تھے ان کے، جیسے کبھی رہے ہوں گے؛ لیکن ایک چاندی کا چمچ پھر بھی لے آئیں لڑکے کے لیے؛ ''جب پہلا بیج پڑے گا کھیتوں میں، تو ترے بیٹے کا 'نام کرن' گرودوارے میں کرواؤں گی۔''

نام کا تذکرہ روز رہنے لگا۔ ایک دن اچانک ہی بے بے نے پوچھ لیا؛ ''تیرے خصم کا نام کیا تھا رے؟'' مونی پہلے ہی سے پھڑک رہی تھی، اس نے آنکھ پہ ہاتھ رکھ کے چہرہ گھما لیا سونی کی طرف، اور سونی بول پڑی؛ ''ترلوک سنگھ!''

بے بے بیساختہ بولی، ''بس وہی رکھ لے۔ تیرے تو تین لوک مل گئے۔''

مطلب کسی کی سمجھ نہیں آیا پر دونوں نے ہاں میں منڈی ضرور ہلا دی۔

''لوکی! لوکی!'' سب پکارنے لگے اسے۔ بڑے گھنے بال تھے۔ آنکھیں کچھ سلیٹی رنگ کی۔ ناک نقشہ مونی پر تو نہیں تھا۔ گھنے بالوں سے تو ترلوک سنگھ ہی لگتا تھا۔

لوکی بڑا ہونے لگا تو سب کا موہ بڑھنے لگا۔ مونی، سونی کھیتوں میں کام کرتیں۔ لوکی، بے بے کے پاس کھیلتا۔

اس کے کیس بھی بڑے ہونے لگے۔ بے بے کو بڑا شوق تھا، اس کے بالوں کی چوٹی بنا کر سر پہ جوڑے کی طرح باندھنے کا۔ جب ڈگمگاتا ہوا چلنے لگا تو گردوارے بھی لے جاتیں اور دِکھاتیں اپنے دو بیٹوں کو جنھوں نے بال کٹوا دیے تھے۔ سونی نے ایک بار ہنس کے مونی کے کان میں پھسپھسایا تھا۔

''بال کٹوا دے اس کے۔ جوئیں پڑ جائیں گی۔سب سِکھوں کے پڑ جاتی ہیں۔''

تب ہنس کے بولی تھی،''گورسِکھ ہے۔کیوں کٹوا دوں؟ اور میں نے کاٹ دیے تو بے بے تو میری گردن ہی کاٹ دے گی۔''

لیکن ایک عجیب حرکت کی اس نے۔ایک دن خود ہی قینچی کنگھی لے کر بال کاٹ دیے اس کے۔اُلٹ پلٹ کر کنگھی کرتی جا رہی تھی اور گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔اچانک سونی کمرے میں داخل ہوئی تو بولی؛''سونی دیکھ۔اس کی شکل اسی پر گئی ہے۔بالکل وہی نہیں لگتا جو روز ہمارے ساتھ بلاتکار کیا کرتا تھا؟''

اس کی آنکھوں میں عجیب ایک وحشت تھی۔سونی ڈر گئی۔

''پاگل ہے تو! ہٹ یہاں سے!'' اور لوکی کو اٹھا کر باہر لے گئی۔

بے بے نے بال کٹے دیکھے تو منہ ہی موڑ لیا۔بہت روئیں۔سونی نے سمجھایا۔

''پتہ نہیں کیا دورہ پڑا تھا مونی پر۔پھر آ جائیں گے بے بے۔رو نہیں!''

بے بے نے اتنا ہی کہا؛''کچھ نہیں سونیئے۔میرا واہگیورو ناراض ہے مجھ سے۔''

مونی اس کے بعد بے بے کے سامنے نہیں گئی لیکن سونی نے دیکھا، اس کی آنکھوں کی وحشت بڑھنے لگی تھی۔

وہ گھور گھور کے دیکھتی تھی لوکی کو اور وہ معصوم بار بار''ماں... ماں'' کہہ کے دوڑتا تھا اس کی طرف۔

اور پھر ایک دن قہر ٹوٹ پڑا خدا کا!

پچھلی کھیت والے کنوئیں میں 'لوکی' کی لاش ملی اور مونی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

پولیس آ گئی، سونی کو بھی پکڑ کر لے گئے۔بڑے تھانیدار صاحب نے رپورٹ تو لکھ لی لیکن سونی کو گھر واپس نہیں جانے دیا۔انھیں یقین تھا اس کی بہن اسے ڈھونڈتی ہوئی وہیں آئے گی، وہ فرار نہیں ہو سکتی۔بالکل وہی ہوا!

تین چار روز بعد ہی بھوکی سوکھی اجڑی ہوئی مونی کو چند سپاہی پکڑ کے تھانے میں لے آئے۔اس کی آنکھوں میں وہی پاگلوں سی وحشت تھی۔

سونی ملنے کے لیے پاس آئی تو اسے دھکا دے دیا۔سپاہی فوراً کھینچ کے حوالات کی طرف لے گئے۔سونی صرف روتی رہی۔

تھانیدار نے سونی کو چھوڑ دیا مگر جاتی کہاں؟ ایک بار گھر لوٹی تو پورا آلفہ نگر بیگانہ لگا۔کوئی پاس آنے کو تیار نہ تھا۔بے بے نے ملنے سے اِنکار کر دیا۔دو دن بعد تھانے لوٹی تو تھانیدار نے بتایا، مونی کو کوٹہ سینٹرل جیل میں بھیج دیا گیا ہے۔اس میں پاگل پن کے آثار نظر آ رہے تھے۔

سر پہ ایک دوپٹہ اور پاؤں میں ایک جوتی لے کر، پتہ نہیں وہ کیسے کوٹہ پہنچی۔

ایک دیو قامت دروازے میں ایک کھڑکی جیسا دروازہ کھلتا تھا جس پر دونوں طرف ایک سپاہی کھڑا رہتا تھا۔

''مجھے جیلر صاحب سے ملنا ہے!''

''کیا کام ہے؟''

''اپنی بہن سے ملنا ہے۔''

''کوئی آرڈر، پرمٹ ہے تیرے پاس؟''

کسی نے اندر جانے نہیں دیا۔جیلر صاحب کی جیپ کبھی کبھی باہر نکلتی تھی اور لوٹ جاتی۔وہ اندازہ ہی لگا سکی بس، کہ وہی جیلر ہیں۔پاس آ کر ہاتھ جوڑ کے''سلام صاحب'' کہتی اور وہ اندر چلے جاتے، کچھ دن جیلر صاحب نے اسے وہیں دیکھا۔دیوار سے پیٹھ لگائے نڈھال بیٹھی رہتی تھی۔ایک سپاہی سے کہہ کے اندر بلایا۔جیلر صاحب کا کواٹر اندر ہی تھا جیل میں۔گھر پہ ایک نوکر تھا۔یوسف! ان کی بیوی بچے علی گڑھ میں رہتے تھے۔جب آئی اور پوچھا، تب پتہ چلا، وہ جب بھی ''سلام صاحب'' کہتی تھی، جیلر صاحب سمجھتے تھے انھیں نام سے بُلا رہی ہے؛ ہنس پڑے۔ان کا نام عبدالسلام قریشی تھا۔

بہت نڈھال تھی۔یوسف سے کہہ کے پہلے پانی پلایا۔پھر کچھ کھانے کو دیا۔اس شام لان میں بیٹھ کر اس کی پوری کہانی سنی تو دِل پسیج گیا۔

مونی خونی تھی، اسے ملانے کے لیے اوپر سے آرڈر لینا ضروری تھا لیکن سلام صاحب نے ایک دن کے تامل کے بعد یہ ذمہ داری اپنے آپ پر لے لی اور جیپ میں بٹھا کر اسے مونی سے ملانے لے گئے۔اپنی جیپ وہ خود ہی چلایا کرتے تھے۔

مونی کو ایک اکیلی سَیل میں رکھا گیا تھا۔اس سیل کے باہر ایک برآمدہ تھا۔ایک عورت کانسٹبل نے اندر جا کر اسے خبر دی کہ اس کی بہن اس سے ملنے آئی ہے لیکن اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔

''مجھے نہیں ملنا۔''

''وہ باہر کھڑی ہے۔''

''کھڑی رہنے دے۔''

سونی سن رہی تھی۔

کانسٹبل باہر آ گئی۔سونی سلاخوں والے دروازے پر جا کر کھڑی ہو گئی۔اندر جھانکا۔دیوار سے لگی بیٹھی تھی مونی۔اس نے مڑ کر دیکھا اسے، پھر دھیرے دھیرے اٹھ کر دروازے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔اس کی آنکھوں کی وحشت ابھی تک گئی نہیں تھی۔سونی نے بڑے دھیرج سے پوچھا۔

''مونی تجھے معلوم ہے تونے کیا کیا ہے؟''
بڑی ترشی سے بولی؛ ''ہاں!'' پھر جملے میں اضافہ کیا؛ ''کیمبل پور میں اس نے اتنے ہندو مارے تھے۔ میں نے ایک چھوٹا سا مسلمان مار دیا تو کیا ہوا؟''

سلام صاحب جیپ چلا رہے تھے؛ کوئٹہ سے آلفہ نگر جا رہے تھے سونی کے ساتھ۔ یہ پتہ لگانے کہ 'لوکی' ابھی تک کسی مورگ میں پڑا ہے یا کسی نے دفنا دیا ہے۔

فکشن بطور متبادل تاریخ

ناصر عباس نیر

یہ مختصر تحریر راقم کے اس انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے جو 'دی نیوز'، لاہور کے ۱۱ مارچ ۲۰۱۸ بروز اتوار کے شمارے میں شائع ہوا۔ اخبار کے لیے الفاظ کی تعداد کو محدود رکھنا پڑتا ہے، اس لیے کئی باتوں کو نہایت اختصار سے پیش کرنا پڑتا ہے اور موضوع سے متعلق بعض نکات سرے سے زیر بحث ہی نہیں آسکتے۔ یہ دونوں طرح کی باتیں زیر نظر تحریر میں بھی ہیں۔ تاریخ اور فکشن کے تعلق پر پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے، لیکن یہاں دونوں کے تعلق کے سلسلے میں بس چند اشارات ہیں۔ انھیں تفصیلی مضمون کی شکل آئندہ کسی وقت دی جائے گی۔ یہ ترجمہ جناب اشعر نجمی کی فرمائش پر خود مصنف نے کیا ہے، اور خاصی عجلت میں کیا ہے۔ ترجمے کے دوران میں یہ احساس بار بار ہوا کہ جیسے میں کسی اور کی تحریر کا ترجمہ کر رہا ہوں۔ زبان کی تبدیلی سے اظہار کا پیرایہ، استدلال کا طریقہ، چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے اسالیب اور کہیں کہیں تو خود مصنف کا اپنے بارے میں تصور تک بدل جاتا ہے۔
(ناصر عباس نیر)

پہلی نظر میں ادبی فکشن اور تاریخ ایک دوسرے کے مخالف محسوس ہوتے ہیں۔ خود فکشن کا لفظ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس سے مراد ایک تخیلی متن ہے، یعنی ایک غیر حقیقی اور گھڑی گئی کہانی۔ دوسری طرف ایک شعبۂ علم کے طور پر تاریخ کا تصور اس وقت تک کیا ہی نہیں جا سکتا، جب تک وہ ان حقائق کی حامل نہ ہو جن کی مستند ذرائع سے تصدیق نہ کی جا سکتی ہو اور جنھیں پیش کرتے ہوئے سبب و علت کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو۔ تاہم فکشن اور تاریخ دونوں، غالب کے لفظوں میں 'ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ'۔ یعنی پہلی نظر میں جتنے ایک دوسرے سے فاصلے پر دکھائی دیتے ہیں، اتنے ہیں نہیں۔ دونوں کو جو چیز ایک دوسرے کے قریب لے آتی ہے، وہ ہے 'حقیقت'۔ تاریخ اور فکشن دونوں 'حقیقت' کی آرزو کرتے ہیں اور اس تک رسائی کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔ تاریخ مختلف ذرائع سے قابل تصدیق واقعات اخذ کر کے، 'حقیقت' تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے، جب کہ فکشن تخیلی واقعات کی مدد سے حقیقت تک پہنچنے کی سعی کرتا ہے۔ قابل تصدیق واقعہ وہی ہو سکتا ہے جو ماضی میں واقعی رونما ہو چکا اور محفوظ کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا تاریخ صرف اسی نوع کے واقعے کو اپنا مواد بناتی ہے، مگر فکشن

کے لیے لازم نہیں کہ وہ ان واقعات تک محدود رہے؛ وہ خود واقعات گھڑ سکتا ہے۔ اس اعتبار سے فکشن کو حقیقت تک پہنچنے کے لیے زیادہ وسیع میدان میسر آتا ہے۔ حقیقت پیچیدہ، گریز پا، کثیر پرتی اور ناقابل بیان ہے۔ پس یہ عین ممکن ہے کہ کسی ایک عہد کی سیاسی وسماجی حقیقت، جسے تاریخ پیش کرتی ہے، وہ فکشن کے ہاتھوں اس وقت بالکل 'سادہ ومعصومانہ' دکھائی دے، یا سرے سے رد کردی جائے، جب کوئی فکشنی متن اسی عہد کی تاریخ کو موضوع بنائے۔

جیسا کہ جدید معاشروں کی تاریخ سے ظاہر ہے، غیر جانب دار اور محنتی مؤرخوں کے پیش کیے گئے تاریخ حقائق سیاسی طاقتوں کے لیے پریشان کن ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ تاریخ کو اپنے اختیار اور قابو میں لانے کے لیے کئی حربے اور طریقے آزماتے ہیں: مثلاً وہ حقائق کو چھپاتے یا مسخ کرتے ہیں، واقعات کی تعبیر میں چالاکی سے کام لیتے ہیں، اور اس سے بھی ایک قدم آگے جاکر تاریخ کے نام پر واقعات اختراع کرسکتے ہیں۔ بجا کہ اس صورت حال میں کچھ باضمیر مؤرخ آگے بڑھتے ہیں اور تاریخ کے جوابی متن کی مدد سے سرکاری طور پر 'قابو میں لائی گئی حقیقت' کو چیلنج کرتے ہیں۔

ہر سچا مؤرخ، خواہ وہ مطابقت پسند ہو یا غیر مطابقت پسند، وہ اس بات پر مجبور ہے کہ وہ حقیقت کا 'وحدانی مگر درست اور مستند' تصور سامنے لائے۔ اس بنا پر ایک عہد کی 'انسانی حقیقت' کی متعدد تہیں اس عہد کی تاریخ میں گم شدہ ہوتی ہیں۔ دوسری طرف فکشن کا مقصود 'ناقابل بیان، کثیر پرتی، پیچیدہ انسانی حقیقت' کو گرفت میں لانے اور بیان کرنا ہے؛ اس کے لیے فکشن تاریخی اور تخیلی دونوں طرح کے واقعات، کرداروں اور ان کے جذباتی ونفسیاتی ردِ اعمال سے مدد لیتا ہے۔ 'انسانی حقیقت' چونکہ پیچیدہ اور گہری ہے، اس لیے اسے تخیلی طور پر ہی گرفت میں لیا جاسکتا ہے، نہ کہ تاریخ کے عقلی، تعبیری، تجزیاتی طریق کار سے۔

جہاں فکشن کی بنیاد کسی بعض تاریخی بیانیوں پر ہوتی ہے وہاں وہ تاریخ کے متبادل کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اس مقام پر تاریخ کے جوابی اور متبادل بیانیے کا فرق پیش کرنا ضروری ہے۔ جوابی بیانیہ، پہلے سے موجود کسی بیانیے کے مرکزی دعوے کے رد سے وجود میں آتا ہے، اور تحقیق وتجزیے کے انھی طریقوں سے کام لیتا ہے، جنھیں پہلے سے موجود بیانیے میں برتا گیا ہوتا ہے۔ دوسری طرف متبادل بیانیہ یا ورژن، پہلے سے موجود بیانیوں کو چیلنج کیے بغیر کچھ بالکل نیا پیش کرتا ہے۔ مابعد نوآبادیاتی مؤرخوں، خصوصاً رانا جیت گوہا، رومیلا تھاپر، ہربنس مکھیا، عرفان حبیب، مشیر الحسن، عائشہ جلال اور دوسروں نے نوآبادیاتی آقاؤں اور ان کے معاونین کی لکھی گئی تاریخوں کے جوابی تاریخی بیانیے پیش کیے ہیں۔ ادھر اردو کے مابعد نوآبادیاتی فکشن نگاروں نے نوآبادیاتی تاریخ کے متبادل تخلیق کیے ہیں۔ ان میں سب سے اہم شمس الرحمن فاروقی کا ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' ہے۔ اس ناول میں وزیر خانم کا تاریخی کردار، ہندوستانی عورت کا متبادل تصور سامنے لاتا ہے جو فعالیت، جرأت مندی اور خود آگاہی کی صفات کی حامل ہے۔ نوآبادیاتی تاریخوں میں کیا عورت، کیا مرد سب ہندوستانیوں کو انسانی صفات سے محروم دکھایا گیا ہے؛ وہ تہذیب، جرأت، عزت نفس، خودشناسی سے محروم ہیں۔ فاروقی کا یہ ناول حاشیے پر پڑے ایک تاریخی کردار کی مدد سے ہندوستانی قومی تشخص

سے متعلق نوآبادیاتی کبیری بیانیے کو تہ وبالا کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فکشن ہی میں متنوع اور پیچیدہ انسانی صفات کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا ''بہاؤ'' بھی [پاکستان] کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کا متبادل تجویز کرتا محسوس ہوتا ہے؛ اس میں سرسوتی دریا کے کنارے میں مسلسل موت کی طرف بڑھتی ہوئی تہذیب کی کہانی بیان کرکے دراصل 'ثقافتی حافظے کی گم شدگی' کے خلاف جدوجہد دکھائی گئی ہے۔ اسی طرح مسعود اشعر اور زاہدہ حنا کی کہانیاں المیہ مشرقی پاکستان سے متعلق سرکاری تاریخوں کا متبادل پیش کرتی ہیں۔

اکرام اللہ کا ناولٹ ''پشیمانی'' پنجاب کی تقسیم سے متعلق متبادل ورژن کا حامل ہے۔ بٹوارے سے متعلق تاریخیں یہ بتاتی ہیں کہ ڈیڑھ کروڑ کے قریب انسانوں کو وحشیانہ انداز میں قتل یا بے گھر کردیا گیا، لیکن ان تاریخی کتب میں یہ بات نہیں آسکی کہ اس المیے کا تجربہ 'انسانی وجود' نے کیسے کیا؟ اکرام اللہ کے اس ناولٹ میں فنی ہنرمندی سے بیان کیا گیا ہے کہ عمر بھر کے دوستوں احسان اور سعید نے بٹوارے کے خوف، اضطراب، جبری بے دخلی اور ہر طرح کے مصائب کو کیسے جھیلا۔ منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ اس امر کی کلاسیکی مثال ہے کہ پنجاب کے بٹوارے نے کس طرح یہاں کے لوگوں کی پوری ہستی اور وجود کو ادھیڑ کے رکھ دیا۔ فکشن صرف 'انسانی وجود' کے اس مجموعی تجربے کو سامنے نہیں لاتا، جو تاریخ میں پوری طرح ظاہر ہونے سے قاصر ہوتا ہے، بلکہ اس 'خلا' کو بھی پُر کرتا ہے جو تاریخ میں رہ جاتے ہیں۔ اس کی مثال منٹو کا طنزیہ افسانہ 'اللہ کا بڑا فضل ہے'' جو 'اردو ادب' کے دوسرے شمارے میں ۱۹۴۹ میں شائع ہوا تھا جسے منٹو اور حسن عسکری نے مرتب کیا تھا۔ اس وقت پاکستان کس سمت میں بڑھ رہا تھا، یہ بات اس زمانے کی تاریخوں میں نہیں ملتی، مگر منٹو کا افسانوی تخیل اس سمت کا پیمبرانہ ادراک کرلیتا ہے۔

> اللہ کا بڑا فضل ہے صاحبان۔ ایک وہ زمانہ جہالت تھا کہ جگہ جگہ ناچ گھر تھے، سینما تھے، آرٹ گیلریاں تھیں اور کیا کیا خرافات نہ تھی۔ اب تو اللہ کا بڑا فضل ہے صاحبان کہ کوئی شاعر دیکھنے میں آتا ہے نہ موسیقار۔ موسیقی کے علاوہ جتنی لعنتیں تھیں، اب ان کا نام ونشان تک نہیں۔ اب آپ اس کونے سے اس کونے تک چلے جایئے، ساری دکانیں چھان ماریئے، ایک استرا بھی نہیں ملے گا۔ البتہ حلوہ جو کہ ہمارے رہنما ملاؤں کی مذہبی خوراک ہے، آپ کو ہر جگہ اور ہر مقدار میں دستیاب ہے۔

بعد میں ساٹھ کی دہائی کے اواخر میں اسی موضوع کو غلام عباس نے اپنے طویل افسانے ''دھنک'' میں اختیار کیا۔ ''دھنک'' میں اس خیالی مگر تاریخی طور پر قابل یقین کہانی کو لکھا گیا ہے جو بتاتی ہے کہ پاکستان میں مذہبی انقلاب آگیا ہے اور ملک کی باگ ڈور مذہبی رہنماؤں کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ نتیجہ ملک کی مکمل تباہی کی صورت دکھایا گیا ہے۔

مابعد جدیدیت اور اردو ناول میں کہانی کا مسئلہ

صلاح الدین درویش

ناول کے بارے میں درست کہا جاتا ہے کہ یہ صنف دراصل تہذیبی بیانیہ ہے کہ جس میں زبان زندگی آمیز مکالمے میں ڈھل کر افراد کی ذہنی نفسیاتی، سماجی اور نظریاتی سطحوں کو اجاگر کرتی ہے۔ ناول کا فن اجتماعی زندگی اور اس کے مسائل کو قدرے مربوط انداز میں ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ ناول کے مخصوص کردار مل جل کر ایک کہانی کی تشکیل کرنے میں مدد دیتے ہیں، یہ کہانی ناول نگار کی فکری اور نظریاتی وابستگیوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس کہانی کا ہر کردار ایک مخصوص سیاق وسباق رکھتا ہے جو اس کی معنوی تشکیل میں اس کے شخصی اور ثقافتی رجحانات یا انحرافات کو منظر عام پر لانے میں معاونت کرتا ہے۔

کہانی بنیادی طور پر ناول نگار کا کھیل ہے، ناول نگار کا شخصی اظہار، وہ پلاٹ کی ترتیب وتزئین میں کہانی کے مرکز کو اطراف میں پھیلاتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ کہانی اطراف کی گلیوں سے ہوتی ہواتی اپنے مرکز تک دوبارہ پہنچ جاتی ہے۔ اس کہانی کے کچھ کردار ایسے ہوتے ہیں، جن کو ناول نگار ضرورت سے زیادہ توجہ دیتا ہے، یہی کردار دراصل ناول نگار کی پسند اور ناپسند کا میزان بنتے ہیں۔ کہانی کی ضرورت انھی کرداروں کی مرہون منت ہوتی ہے۔ ایسے کردار عموماً بڑے نیک سیرت اور بھاشن پسند ہوتے ہیں، چنانچہ ان کی نمائش پر ناول نگار خاص اہتمام کرتا ہے۔ ''مراۃ العروس'' کی اکبری اصغری پر ہم لاکھ ٹائپ ہونے کا الزام دھرتے پھریں، حقیقت یہ ہے کہ ماڈرن ناول مشرقی ہو یا مغربی کہانی میں اسی روش کا پابند رہا ہے، دراصل ناول نگار کو کہانی سے زیادہ زندگی کے بارے میں اپنے چند نظریات عزیز ہوتے ہیں، جن کی ترسیل کے لیے ناول کا وسیع دامن ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ اس کا یہ فائدہ ضرور ہے کہ ناول نگار کا نظریہ انسانی کرداروں کے روپ میں زندگی میں کچھ ڈھلا دکھائی دینے لگتا ہے اور یوں ناول نگار کے نظریے کی امکانی سطح کہانی کا جز بن کر قابل قبول صورت اختیار کر لیتی ہے لیکن نقصان یہ ہے کہ ناول کی ایسی کہانی کسی مخصوص سیاسی، سماجی، ثقافتی، نسلی یا لسانی گروہ کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ناول کے آرٹ میں ایسی اپیل خود ناول نگار کی عصبیت کا پتہ دیتی ہے، گویا ایسے ہر ناول کی بنیاد کوئی نہ کوئی عصبیت ہوتی ہے، ایسی عصبیت میں

کوئی قباحت نہیں ہے جو ایک خاص مکتبِ فکر، گروہ، جماعت یا قومیت کے مسائل اور پریشانیوں کا احاطہ خود اس مکتب فکر، گروہ، جماعت یا قومیت کے افراد کے درمیان کرے اور ذمہ داران کو دوسروں میں ڈھونڈنے کی بجائے خود اپنے احاطے میں تلاش کرے، کیونکہ بیشتر سنگینیوں کا مرکز خود کوئی گروہ یا جماعت ہوتی ہے، جس کی اسٹیبلشمنٹ کو چیلنج کرنا گناہِ کبیرہ خیال کر لیا گیا ہوتا ہے، ناول کی ایسی تمام کہانیاں اسی مقتدرہ کی ردِ تشکیل نہ ہونے کے باعث بہت کمزور رہ جاتی ہیں۔

ناول نگار کی بڑی پناہ گاہ کوئی نہ کوئی بڑا بیانیہ ہوتا ہے، جس کی پزیرائی تاریخی اور تہذیبی حوالوں سے مسلم الثبوت ہوتی ہے کہ جس کی سچائیوں پر لوگوں کا بعض صورتوں میں اندھا اور بعض صورتوں میں شعوری اعتقاد ہوتی ہے اور خود ناول نگار کی زبان، اس کے محاورے، ضرب الامثال، کہاوتیں، روزمرہ، تشبیہات، استعارے، الفاظ اور ان کی تراکیب بڑے بیانیے کی صورت گری بھی کرتی ہیں اور اس کی معنوی جہات کو منظر عام پر لانے کا باعث ہوتی ہیں، قاری کی تہذیبی، ثقافتی، مذہبی یا نسلی دانست تک رسائی کے لیے ناول نگار کی یہ زبان، زبان کی معنوی بنیادوں کو کھولتی چلی جاتی ہے اور قاری بڑی سہولت کے ساتھ ناول نگار کی منشا اور مراد کو پا لیتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ناول نگار اپنی کہانی میں کسی تہذیب وثقافت یا مذہب وملت میں پائے جانے والے طبقاتی، گروہی، مسلکی، لسانی یا قومی تضادات سے آگاہ نہیں ہوتا یا ان کے ذکر سے گریز کرتا ہے، وہ اپنی کہانی میں ان تضادات کی بھی نشاندہی کرتا ہے لیکن اس نشاندہی کا مقصد خود بڑے بیانیے کے اندرونی تضادات کو واضح کرنا نہیں ہوتا بلکہ مقصود یہ ہوتا ہے کہ بڑے بیانیے سے گریز کے باعث کچھ کردار منفی یا گمراہ یا سیرت میں کجی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر نذیر احمد کے ناول ''توبتہ النصوح'' کا کلیم اگرچہ ایک آوارہ، چھیل چھبیلا، بناؤ سنگھار کو پسند کرنے والا ہے اور اس کی ان تمام حرکات یا سرگرمیوں کو نذیر احمد نے اس کے اطوار بد کا ذمہ دار قرار دیا ہے لیکن اس کی نفاست پسندی، حسن ذوق، سلیقہ، مطالعہ کتب، شعر وشاعری میں دلچسپی، فنون لطیفہ میں رغبت اور اساتذہ فن کی قدر دانی کو بھی حقارت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، کلیم ظاہری دین داری، سر منڈانے اور صالحین کی نمائشی وضع قطع اختیار کرنے کے بھی خلاف ہے لیکن اس کی شخصیت کی یہ ساری خوبیاں مسلم اشرافیہ کے بڑے بیانیے سے کیونکہ میل نہیں کھاتیں، یہی وجہ ہے کہ اس کی اچھی شخصی خصوصیات بھی گویا عیب بن گئیں۔ ناول کی یہ کہانی اپنے مرکز سے ہوتی ہوئی جب اطراف میں پھیلتی ہے تو نذیر احمد کا بڑا بیانیہ بے شمار مسائل میں گھر جاتا ہے۔ نذیر احمد کے ذہن میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ جس کلیم نامی کردار کی تخفیف کی گئی ہے اور اسے معتوب بنایا گیا ہے، اسی کردار کے بڑے بیانیے کے پاس ان سوالات کے معقول جوابات موجود نہیں ہیں۔ وہ یہ بات نہیں سمجھ سکے کہ سلیم اور حضرت بی کے گنجے فرشتے بڑے بیانیے کی عظمت کے نیچے دب کر بہت چھوٹے اور سماجی اور اخلاقی اعتبار سے بری طرح کچلے گئے ہیں۔ جس کردار کو گمراہ یا منفی قرار دیا گیا ہے، وہ گھوم پھر کر کوچۂ قاتل سے نکلنے والا کردار ہے اور بڑی زندگی کا بڑا تجربہ رکھتا ہے۔ ویسے تو ہر متن کے دو مخاطب ہوتے ہیں؛ ایک وہ جو متن میں پائے جانے والے بیانیے کی تائید اور حمایت کرنے والے ہوتے ہیں، ناول کی کہانی میں ایسے کردار بیانیے سے جب ہم رنگ ہو جاتے ہیں تو

دوسری طرف ان کرداروں کے وہ مخاطب سر اٹھاتے ہیں، جو اپنے معاملات میں بیانیے سے ہم رنگ کرداروں سے ٹکراؤ کی مختلف صورتوں کو سامنے لے آتے ہیں۔ ناول نگار کا بیانیہ کہانی کاری میں ایسے کرداروں پر سخت گرفت رکھتا ہے اور ان کی بھول چوک، گناہ، جرم یا برائی کے حوالے سے ان کرداروں کی زندگیوں کو مصیبت اور پریشانی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ بنا دیتا ہے۔ یہ دراصل ناول نگار کے بیانیے کے خلاف چھوٹے چھوٹے انفرادی یا شخصی بیانیوں کی لڑائی ہوتی ہے، کیونکہ بڑے بیانیے سے لڑنا ایک ایسے دشمن سے لڑنا ہوتا ہے جو کسی بھی چھوٹے سے گروہی بیانیے کو گھیر کر اسے ڈھیر کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناول نگار برے بیانیے سے انحراف کرنے والی کسی کمیونٹی یا گروہ کو لینے کی بجائے کوئی ایسا کردار منتخب کر لیتا ہے جسے کہانی میں سبق سکھا کر اس کی پوری کمیونٹی کو آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ ایسا ایک کے ساتھ نہیں کیا گیا بلکہ یہ کردار ایک ایسی مثال ہے جو پوری کمیونٹی کو خبردار کر دیتی ہے کہ معاملات کی نزاکت کو سمجھیں اور محتاط رویہ اختیار کریں۔ مثال کے طور پر قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' میں ابوالمنصور کمال الدین جس کا تعلق بغداد سے تھا، محقق اور ماہر اثریات تھا، جونپور کے حسین شرقی کا پترنویس بنا، سکندر لودھی کی شکست اور خون خرابے کے بعد دنیا سے تائب ہوا، ایک شودر لڑکی سے شادی کی، کھیتی باڑی کو اپنایا اور بنگال کو اپنا دیس کہا، لیکن مرنے سے پہلے اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ جنگیں دو مذہبوں کے درمیان نہیں بلکہ دو سیاسی قوتوں کے درمیان لڑی جاتی ہیں۔ یہاں دراصل ناول نگار نے اپنی کہانی میں اسلام اور ہندومت جیسے بڑے بیانیوں کے درمیان پائے جانے والے مذہبی تضادات اور ان کے ہند مسلم تہذیب پر پڑنے والے ہمہ گیر اور ہمہ جہت مسائل، پریشانیوں اور نتائج سے پہلوتہی کی ہے۔ اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ تقسیم کے بعد جن کرداروں کو پاکستان ہجرت نہیں کرنا تھی، ان کے لیے گنجائش کی ایک صورت پیدا کی جا سکے۔ قرۃ العین حیدر کے یہ پڑھے لکھے دانا اور بینا کردار انجام کار ملول اور دل گرفتہ کیوں تھے؟ ناول نگار کا نقطۂ نظر اس حوالے سے جھاگ کی طرح بیٹھتا دکھائی دیتا ہے۔ مذہبی شناخت جس عصبیت کو پیدا کرتی ہے اور وہ جن متشدد رجحانات کو انسانی سماج میں ہوا دیتی ہے، وہ محض سیاسی مسئلہ نہیں ہے بلکہ خود مذہبی تعلیمات ایسے رجحانات کے فروغ کا باعث بنتی ہیں۔ گویا قرۃ العین حیدر نے مسلمان اقلیت کو ہندوستان میں محتاط زندگی بسر کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات شخصی آزادیوں کے صریح منافی ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ناول میں ہر دو بڑے بیانیوں میں پائے جانے والے متشدد رجحانات کو اجاگر کیا جاتا، کیونکہ شناخت کی لڑائی محض سیاسی نہیں ہوتی۔ سیاسی بیانیے خواہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں، ہوا کے رخ پر بدلتے رہتے ہیں، جبکہ مذہبی بیانیے میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان پر راسخ العقیدگی کا عنصر مزید گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔

اسی طرح قومی اور نسلی شناخت ایک ایسا بڑا بیانیہ ہے جو اپنے احیا اور قیام کے لیے مقابل اقوام اور نسلوں کے لیے شدید نفرت اور حقارت کا جذبہ رکھتا ہے، ایسی شناخت اس وقت تک سیاسی طور پر نہیں ابھرتی جب تک دوسری اقوام کی توہین، ذلت اور پسپائی کو تاریخ کا حصہ نہ بنا دے۔ ایسی شناخت خود اپنی قوم، نسل میں جن اقدار، اخلاق اور حسن سلوک کی توقع رکھتی ہے، کسی دوسری قوم یا نسل کے لیے ایسے تمام انسان

دوست پیمانے الٹ جاتے ہیں۔ اپنی قوم اور نسل میں جو افراد محبت، امن اور اخلاص کے پیکر ہوتے ہیں ان کا سامنا جب مقابل قوم اور نسل سے ہوتا ہے تو انسان کے اندر کا سارا وحشی پن باہر آ جاتا ہے، ان کے لیے دوسری قوم اور نسل بھیڑ بکریوں سے بھی ارذل قرار پاتی ہے۔ مثال کے طور پر مستنصر حسین تارڑ کے ناول ''راکھ'' کا فوجی افسر مردان جب اپنے نوجوان افسروں کو بیرک میں نہیں پاتا تو وہ ان کی تلاش میں ایک جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں انھی نوجوان افسروں کے سامنے غلیظ اور چیتھڑوں میں ملبوس بنگالی قطار بنائے کھڑے ہوتے ہیں۔ ان افسروں کے درمیان یہ دلچسپ کھیل جاری ہے کہ زنگ آلود تلوار کے ایک ہی وار میں کون کتنے بنگالیوں کی گردنیں کاٹتا ہے۔ اگلے کا حکم ملتے ہی اگلا بنگالی اپنا سر جھکا دیتا ہے۔ ایک نوجوان افسر مردان کو بھی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتے قسمت آزمائی کی دعوت دیتا ہے۔ یہ محض کسی عسکری انتقام کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفرت نہیں ہے، بلکہ اس کی بنیاد میں اپنی قومی اور نسلی شناخت کے احساس تفاخر اور برتری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ نسلی اور قومی عظمت کا بیانیہ اس وقت تک بھائی چارے اور رواداری کے حوالے سے ڈینگیں مارنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا، جب تک کہ نسلی اور قومی شناخت اور اس کا مکروہ بیانیہ خود ناول نگار کو اپنی نسلی اور قومی شناخت سے الگ اور آزاد نہ کر دے۔ تارڑ نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے اس حوالے سے اپنی مکمل بے بسی کا اظہار کیا ہے کہ دو نسلوں یا قوموں کے درمیان محبت کے نمائشی مظاہر کچھ نہیں کر سکتے، محبت کچھ نہیں بدل سکتی۔

برصغیر پاک و ہند کا ایک اور بڑا بیانیہ اشتراکیت ہے، جسے چند ایک اردو ناولوں کی کہانیوں میں انقلاب پسند کرداروں کی صورت میں پیش کیا گیا، لیکن ایسے تمام کردار ہند و پاک کی سیاسی، ثقافتی اور مذہبی روایات و اقدار سے بالآخر سر ٹکرا کر فنا کی گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ ان میں ایک بھی ناول ایسا نہیں ہے جو اشتراکی بیانیے کی عظمت اور ہمہ گیری کے ذریعے یہاں کی مخصوص تمدنی اور تہذیبی ساخت میں بڑی یا چھوٹی دراڑ ڈالنے میں کامیاب ہوا ہو۔ ترقی پسند اشتراکی بیانیے کی انقلابیت ایک ایسا پودا ثابت ہوتی ہے، جس کے لیے یہاں کی زمین، ہوا اور موسم انتہائی ناسازگار تھا، نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ایسے ناولوں کے تمام اشتراکی ہیرو شکست، ملال اور موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عجیب معاملہ ہے کہ اس نظریے کی رجائیت ناولوں میں انجام کار سخت مایوسی سے دوچار ہو جاتی ہے۔ اشتراکیت پسند خیالات کے حامل ناول گویا اپنی تکنیک میں اشتراکیت کو ذلت اور پسپائی کی بھینٹ چڑھانے کے لیے لکھے گئے۔ مثال کے طور پر کرشن چندر کے ناول ''جب کھیت جاگے'' کا ہیرو راگھوراؤ کمیونسٹ تحریک کے ایک رکن مقبول سے متاثر ہو کر پہلے ٹریڈ یونین کی سیاست میں سرمایہ داروں کے خلاف جدوجہد کرتا ہے اور مل مالکان کے خلاف ہڑتال کرانے کے جرم میں جیل چلا جاتا ہے، جیل سے رہا ہوتے ہی اپنے علاقے کے بے زمین کسانوں کو منظّم کرتا ہے اور علاقے کے جاگیرداروں کی ساری زمینیں، انھیں بے دخل کرنے کے بعد کسانوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اور پھر ایک روز بغاوت کے جرم میں ریاستی قانون اسے پھانسی پر چڑھا دیتا ہے۔ اس ناول کی کہانی کا مسئلہ بھی یہی ہے کہ سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل جن کا رونا ناول نگار نے رویا ہے، ناول کے پلاٹ میں ان مسائل اور ان سے

پیدا شدہ صورتِ حال کا تجزیہ خود اشتراکیت کے بیانیے میں موجود ہندوستان کے تاریخی، مذہبی، ثقافتی اور جغرافیائی تضادات کے ساتھ نہیں کیا گیا۔ اشتراکیت کے بیانیے کی عظمت گوئی ایسی الوہی سچائی رکھتی تھی جس کی طرف رجوع کرنا گویا عوام کا ایسا لازمی فریضہ تھا جس کے لیے پھانسیوں کو چومنا پڑتا ہے، گویا مذہب کی قربانی اور شہادت والے بیانیے کو اشتراکیت کے مقاصد کے حصول کے لیے کرشن چندر نے بھی عوام کے جذباتی اکساؤ کے لیے استعمال کیا ہے۔

مندرجہ بالا ناولوں کا ذکر محض اسے لیے کیا گیا ہے کہ ایسے تمام ناول اپنی کہانیوں میں حق اور صداقت پر مبنی کسی نہ کسی بڑے بیانیے کی عظمت کی دھاک بٹھانے کے لیے لکھے گئے۔ یہ بات درست ہے کہ ہم اپنی اجتماعی زندگی میں قومی، مذہبی، نسلی، ثقافتی یا نظریاتی بیانیوں کے تائید کنندگان ہوتے ہیں اور ہمیں دوسری اقوام، مذاہب، نسلوں، ثقافتوں اور نظریات سے دشمنی، حقارت، عصبیت اور متشدد ذہنیت رکھنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی اور ہم برملا اپنی اجتماعی زندگی میں سیاسی اور سماجی تحفظ کے حوالے سے ہماری انفرادی نفسیات ان بیانیوں کو قبول کرنے کا شدید رجحان بھی رکھتی ہے۔ ناول نگار کے پاس سہولت ہوتی ہے کہ ایک بڑے بیانیے کو لے اور اپنی کہانی کو چند کرداروں کے ذریعے اس بیانیے کی اعلیٰ تعلیمات اور اس کے آدرشوں کی سچائی کو ثابت کردے، کیونکہ قارئین کا ایک بڑا یا قدرے چھوٹا حلقہ ایسے بیانیوں کو اپنا دین دھرم سمجھتا ہے۔ گویا ناول کی کہانی بڑے بیانیوں کے کرداروں کے ذریعے عملی تشکیل کی ایک مؤثر صورت بن جاتی ہے۔ وہ بڑا بیانیہ جو ایک ناول کی کہانی میں تشکیل پاتا ہے، وہ اپنے باطن میں جو نسلی، قومی، مذہبی یا ثقافتی زعم رکھتا ہے، اسے اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ دوسری نسلوں، اقوام، مذاہب یا ثقافتوں کے بارے میں اس کی دشمنی کس حد تک دریدہ دہن ہے۔ ایسا ہر بیانیہ ایک خونی جتھا تیار کرتا ہے جو اپنے ماننے اور چاہنے والوں کو تحفظ اور امان کی ضمانت دیتا ہے اور انکار کرنے والوں کو موت کے علاوہ کوئی سہولت دینے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ ناول نگار اپنے بڑے بیانیے کے دفاع میں جو کردار کہانی میں متعارف کراتا ہے، اس کی شخصی خصوصیات کو کچھ ایسے انداز میں ترتیب دیتا ہے کہ وہ کردار بظاہر خیرِ کل کا نمائندہ بنا دکھائی دینے لگتا ہے، اس کا سبب وہ قاری ہوتا ہے جو اس بیانیے سے رغبت رکھتا ہے۔ کوئی دوسرا قاری جسے اس بیانیے میں دبایا گیا ہو یا اس کے قومی و ثقافتی پہلوؤں کو خیرِ کل کے حصول میں رکاوٹ اور گمراہی قرار دیا گیا ہو، ایسا قاری یا ناول کا مقہور کردار جن بنیادی نوعیت کے سوالات کو ناول میں پیش کیے گئے بڑے بیانیے پر اٹھانا چاہتا ہے، ناول نگار اسے یکسر نظر انداز کر دیتا ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر سے لے کر بیسویں صدی کے پورے دورانیے میں اردو میں جو ناول لکھے گئے، وہ کسی نہ کسی بڑے بیانیے کے ثقافتی، تہذیبی یا تاریخی پس منظر میں تحریر کیے گئے۔ یہ بیانیے تاریخی اعتبار سے سماجی اور سیاسی سطح پر عملی صورتوں میں بھی، کیونکہ معاشروں کا حصہ تھے، اسی لیے ان بیانیوں سے رجوع کرنا ناول نگاروں کے لیے ضروری بھی تھا۔ چنانچہ ان بیانیوں کے دوسرے (The Others) کے ساتھ جو سلوک ان بیانیوں میں بنتا تھا، اسے روا رکھا گیا۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ خود ہندوستان

اور پھر عالمی سطح پر بھی قومی آزادی کی جن تحریکوں نے سر اٹھایا، وہ معاملہ پھر قومی آزادی کے حوالے سے قومی شناختوں تک محدود نہ رہا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مذہبی، ثقافتی، نسلی، لسانی اور تہذیبی شناختوں کے سیاسی قیام کے لیے بھی جدوجہد کے راستے کھلتے چلے گئے۔ اس جدوجہد میں اکثریت کے ساتھ اقلیتوں کے مذہبی، نسلی، قومی اور لسانی بیانیوں کی سیاسی ساکھ کے حوالے سے آوازیں بلند ہونا شروع ہوگئیں، تاہم اقلیتوں کے چھوٹے بیانیوں کو زیادہ پزیرائی حاصل نہ ہو پائی اور آزادیوں کے بعد یہ اقلیتیں جمہوری قوانین میں بلاتفریق رنگ، نسل، زبان اور مذہب و مسلک کے ریاست کے برابر شہری قرار دیے جانے کے باوجود سیاسی، سماجی اور معاشی میدانوں میں دوسرے اور تیسرے درجے کے شہری ہی بنے رہے۔ اکثریت کے غالب بیانیے نے انھیں مسلسل دبائے رکھا اور ناول نگاروں نے اپنی کہانیوں میں ان اقلیتوں کی کمتری اور کہتری کی وجوہات کو بڑے بیانیوں میں موجود انتہاہی بیانیات میں تلاش کر کے ان کے مقدر کی پستی پر مہریں ثبت کر دیں۔

جب کوئی ناول نگار اپنی کہانی میں کسی بڑے بیانیے کی حقانیت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے کرداروں کے ذریعے پلاٹ کو ترتیب دیتا ہے تو وہ مضحکہ خیز اور غیر منطقی استدلال کو بڑے بیانیے کی عظمت ثابت کرنے کے لیے ناول کے خاتمے تک پیش کرتا چلا جاتا ہے، اسے ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہیں آتا کہ بیانیے کی عظمت کے متاثرین بھی انسان ہیں۔ مثال کے طور پر نشاط فاطمہ کے ناول ''زمین کے رشتے'' کا ہیرو نعمان رشید جو خود جاگیرداری نظام کے بڑے بیانیے کا زندہ کردار ہے، ایک اور جاگیردار سردار جہانگیر کے ساتھ مل کر کھیتوں میں کام کرنے والے بے زمین کمی کمینوں اور مصلیوں کے اصلاحِ احوال کے لیے ہر سال ایک کلہ زمین ان میں بانٹنے کا پروگرام بناتے ہیں، چنانچہ علاقے کے دیگر زمیندار اس ''انقلابی اقدام'' کے خلاف ہو جاتے ہیں اور ایک مولوی کی وساطت سے اس پروگرام کو غیر اسلامی اور ہیرو صاحبان کو ملحد قرار دلوا دیتے ہیں، جس کا توڑ ایک اور مولوی کو ڈھونڈا جاتا ہے اور وہ اسے قرآن و حدیث کی روشنی میں عین اسلام قرار دے دیتا ہے۔ شورش دبتی ہے تو اس کے ساتھ ہی اصلاحِ احوال کا پروگرام بھی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ اس ناول کی حوصلہ شکن غایت یہ تھی کہ جاگیرداروں کے ظلم و ستم، ناانصافی اور سنگدلی کے باوجود نمک حلال مزارعے، کمی اور مصلی زمین کے ساتھ اپنے رشتے کو ہمیشہ استوار رکھتے ہیں۔ اسی طرح ارشد چہال کے ناول ''دھندلے کوس'' کا جاگیردار شہباز خان ایک اصول پسند اور صوم و صلوٰۃ کا پابند آدمی ہے جو عورت اور شراب سے دور رہتا ہے۔ ایم این اے ہے اور وزیر ثقافت بھی ہے۔ اس کے من میں جب غریبوں کی مدد کا مروڑ اٹھتا ہے تو وہ اپنے علاقے کے صدیوں کے غلام مزارعوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر سینکڑوں میل دور چولستان کے صحرا میں مردار اور کرلوں کا گوشت کھانے والوں کے سماج سدھار کے لیے نکل پڑتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی نیکی کے طفیل یہ لوگ اس کی زمینوں کے پاس آباد ہو جائیں تاکہ وہ بھی متمدن دنیا سے اپنا تعلق قائم کر سکیں۔ ظاہر ہے وہ انکار کر دیتے ہیں اور جاگیردار صاحب ان سب کے منہ پر تھوک کر واپس اپنے ڈیرے پر آ جاتے ہیں۔ اس ناول میں جاگیرداری نظام کے بڑے بیانیے کو ناول نگار نے بڑی 'ہمدردی' کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک جاگیردار بھی نیکی اور خیر کا علمبردار ہو سکتا ہے لیکن مقدر کی سیاہی والے اس سے فیض یاب نہیں ہو

سکتے۔ ناول نگار نے ہر دو کے ثقافتی فرق کو قدرت کا لکھا کھیل قرار دے کر اپنی مجبوری کے تحت جاگیرداری نظام کے بیانیے کو پورا پورا سپورٹ کیا ہے۔

غرض جدیدیت کے ساتھ کہنے کو تو لفظ جدید لگا ہوا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جدیدیت کے نام پر اردو ناول میں جن بڑے بیانیوں کو کہانیوں میں تشکیل دیا گیا، وہ سب کے سب اپنی اساس میں کہنہ روایات کے امین تھے۔ زمانہ اور زمانے کے انداز بیسویں صدی میں ضرور بدلے لیکن جدید اذہان کے پاس تمدن جدید کے فہم کے لیے جو وسیع تر بنیادوں پر انسان دوست افکار و نظریات کی ترویج درکار تھی، وہ اس سے محروم رہے۔ ناول کی کہانیوں میں حیرت انگیز طور پر ساری معروضی صورتحال بدلی ہوئی ہے لیکن اس تبدیل شدہ صورتحال کو پرکھنے اور نتائج کو مرتب کرنے کے لیے ان بڑے بیانیوں سے رجوع کیا گیا، جو بدلتے ہوئے سماج کی مادی اور حقیقی ضرورتوں کے فکری و معنوی احاطے کی بہت کم کم اہلیت رکھتے تھے۔ وہ مذہب تھا، قومیت تھی، نسل پرستی تھی، جاگیرداریت تھی، یا تہذیب و ثقافت تھی، ان تمام بڑے بیانیوں میں عصبیت کی بنیاد پر جس اجتماعیت کے حصول کا دعویٰ موجود تھا، اس کی ردتشکیل کے لیے خود ان بیانیوں میں جن نسلوں، گروہوں، قوموں اور ثقافتوں کو مقہور ٹھہرایا گیا تھا، انھیں اس بات کا حق نہیں دیا جا سکا کہ وہ کسی بڑے بیانیے کے نتیجے میں ابھرنے والی اجتماعیت کو چیلنج کرنے کی طاقت حاصل کر پائیں۔ گویا بڑے بیانیے کی تشکیل کرنے والی کہانیوں میں جدیدیت کے نام پر قدیمیت ہی کو فروغ دیا گیا۔

جدیدیت جسے بدلتے ہوئے نئے صنعتی سماج میں نئی جمہوری اقدار کو فروغ دینا تھا اور صنعت سے لے کر منڈی تک کے نئے پیداواری اصولوں کے پیشِ نظر سیاسی، مذہبی، قومی، ثقافتی اور نسلی بنیادوں پر استوار بڑے بیانیوں کی شناختوں پر اصرار کو کم کرتے کرتے ختم کرنا تھا، اسی جدیدیت نے ان کے احیا کے لیے ناول کی کہانیوں میں انھیں از سر نو جنم دے دیا اور عصبیت کی بنیاد پر عالمی اور مقامی سطح پر معاشروں کو عصبیت کے جنگل میں ایک مرتبہ پھر لا پھینکا۔ یعنی تمدن جدید میں صنعت سے لے کر پیداوار اور منڈی تک کے سارے عمل میں کسی بھی نوع کے بڑے بیانیے کی شرکت تو صفر رہی اور نہ ہی کوئی بڑا بیانیہ اس پورے معیشت کے نئے سماجی عمل کو اپنی نسلی، گروہی، مذہبی یا ثقافتی شناخت دے پایا لیکن بڑے بیانیوں کی شناخت نے انسانوں کو دوسرے انسانوں کے خلاف نفرت، دشمنی اور تعصب پر اکسائے رکھنے میں کوئی کوتاہی نہ برتی۔ انسان اپنی نسل، رنگ، ثقافت، بود و باش، مذہب اور زبان جیسے بڑے بیانیوں سے ضرور پہچانا جاتا ہے لیکن اس پہچان کی قیمت عصبیت کے اضافی بوجھ کو اٹھا کر چکانی پڑتی ہے۔ گورے کالے، عربی عجمی، ہندو مسلمان یا جرمن روسی شناختوں کے حامل ہونا نہ پیداواری عمل میں رکاوٹ کا باعث بنتا ہے اور نہ ہی فروغ پذیر معاشی رشتوں میں کسی نمایاں خلل کا باعث بنتا ہے لیکن جیسے ہی پیداواری اور معاشی عمل کا نظام ہماری سیاسی اور سماجی حدود میں داخل ہوتا ہے، بڑے بیانیوں کی تمام عصبیتیں جاگ اٹھتی ہیں جو اپنی اپنی شناخت کی بنیاد پر قائم شدہ حق کو سیاسی اور سماجی سطح پر حاصل کرنے کے لیے دست و گریبان ہو جاتی ہیں۔ ناول کی کہانی جب کسی بڑے بیانیے کی کوکھ سے جنم لیتی ہے، تو وہ دراصل اپنے عصبیتی حق کی جنگ لڑتی ہے۔ جدیدیت کا تجربہ

ہمیں بتاتا ہے کہ ثقافت جن پیداواری رشتوں سے متشکل ہوتی ہے، اس کی بنیاد میں ذرائع پیداوار کی تبدیلی نے اہم کردار ضرور ادا کیا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم کردار ان بڑے بیانیوں نے ادا کیا ہے جن کے زیر اثر طبقاتی تفریق ذرائع پیداوار کے تبدیل ہو جانے کے باوجود برقرار رہتی ہے۔ لہٰذا ان بیانیوں کی ردتشکیل ہی وہ ذریعہ ہے جس سے طبقات میں موجود تفریق کی جبریت کو توڑا جا سکتا ہے یہ ردتشکیل نچلے اور کمزور طبقات کو ان کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی مقام سے آگاہ کر سکتی ہے اور جن چھوٹے بیانیوں پر وہ اپنی قومی، نسلی اور ثقافتی شناخت کے حق کی حفاظت کے لیے وہ جدوجہد کرتے ہیں، وہ خود اس شناخت کی بھی ردتشکیل کر سکتی ہے کیونکہ بڑے بیانیوں کی تشکیل کے زیر اثر چھوٹے بیانیے بھی عصبیت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں۔ یار دوستوں کو تکلیف اس بات پر ہوتی ہے کہ ایسا کرنے سے سماجی تفاعل سے ترتیب پانے والی زبان کی وہ ہمہ گیر تفہیم جسے بڑے یا چھوٹے بیانیوں میں تشکیل دیا ہوتا ہے، معاشروں میں انارکی کی صورت پیدا کر دے گی اور یہ نراجیت کسی بھی معاشرے کی بقا کے لیے مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ کہنا وہ یہ چاہتے ہیں کہ یہ ڈی کنسٹرکشن پوسٹ ڈی کنسٹرکشن فیز میں ری کنسٹرکشن کا کوئی پروگرام نہیں رکھتی۔ زبانی عصبیت پسند ہی سہی جب اس کی معنوی جبریت کو توڑ دیا جائے گا تو پھر کیا ہوگا؟ وہ بھول جاتے ہیں کہ جب بڑے بیانیوں کی قومی، نسلی، مذہبی یا ثقافتی معنوں پر استوار زبان کی سیاسی اجارہ داری کو توڑا جاتا ہے تو سماجی فرد بڑے اور چھوٹے بیانیے کی اجتماعیت پسند عصبیتوں سے بھی آزاد ہو جاتا ہے۔ وہ ہجوم کی پسند اور ناپسند کے نفسیاتی دباؤ سے آزاد ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی اپنے ذاتی، شخصی اور نجی معاملات کے فکری، تخلیقی اور پیداواری حوالوں میں بھی آزاد ہو جاتا ہے۔ ریاست کسی گروہ، قوم، نسل، ثقافت یا مذہب کو تحفظ دینے کی بجائے فرد کی فکری، تخلیقی اور پیداواری صلاحیتوں کو تحفظ اور فروغ دینے کے قابل ہو جاتی ہے۔ ریاست کا یہ عمل غیر ثقافتی، غیر نسلی، غیر قومی اور غیر مذہبی قرار پائے گا۔ دنیا بھر کی لبرل اور سیکولر جمہوری ریاستیں اپنے قوانین کے ذریعے بتدریج اجتماعیت پسند نسلی، قومی، ثقافتی اور مذہبی شناختوں کے زور اور شدت کو کم کر کے زیادہ سے زیادہ شخصی آزادیوں کو تحفظ فراہم کرنے میں اب دلچسپی بھی لے رہی ہیں کیونکہ انڈسٹریل اور ٹیکنالوجیکل میدان میں فرد کی قومی، نسلی، مذہبی یا ثقافتی زبان کی جگہ علم و ہنر کی اس زبان نے لے لی ہے، جس کی کوئی شناخت نہیں ہے یہ زبان لباس، مذہب، قوم اور ثقافت پر کوئی سوال نہیں اٹھاتی کیونکہ وہ اس کا سرے سے موضوع ہی نہیں ہے۔ یہ ڈی کلچرائزیشن کا عمل ہے جو مابعد جدید بلڈنگ سٹرکچرز، مصوری، موسیقی اور دیگر فنون میں جس آرٹ کے نام پر فروغ پذیر ہے، اسے ڈی آرٹ کہا جا سکتا ہے، جس پر ابھی بہت کچھ لکھا پڑھی کی ضرورت ہے۔ خمار رسوم و قیود والوں کو ابھی اس کی فرصت نہیں ہے۔ ڈی آرٹ، آرٹ سے متعلق اس کی نسلی، قومی، ثقافتی یا مذہبی شناختوں کی جبریت کو توڑ دیتا ہے اور ایک ایسی فارمیشن کو سامنے لاتا ہے جسے کسی خاص قوم، ثقافت یا نسل سے وابستہ آرٹ کے نمونوں کی نقل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اس کی تفصیل کا محل یہ مضمون نہیں ہے۔ احباب پوسٹ ماڈرن/ ڈی آرٹ کے نمونے مختلف فنون کے حوالے سے انٹرنیٹ پر دیکھ سکتے ہیں۔

اردو ناول کی کہانیوں میں ہمیں متعدد ایسے ناول مل جاتے ہیں جن میں بڑے بیانیوں کی ردتشکیل

کوموضوع بنایا گیا ہے۔اس کی پہلی مثال پریم چند کا ناول ''بیوہ'' ہے۔ہم جانتے ہیں کہ ہندودھرم میں بیوہ اگر ستی نہیں بھی ہوتی تو اس کا سر منڈا دیا جاتا ہے، میلے کپڑے پہننے رہنے کی تلقین کی جاتی ہے، جس کے سائے کو بھی نحس قرار دیا جاتا ہے اور پریم چند کے بقول کجروی ہی بیوگی کی قدرتی معاش ٹھہرتی ہے۔ ناول میں اس بڑے بیانیے کی ستم ظریفی کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے وہ ایک کردار لالہ امرت رائے متعارف کراتے ہیں جو ایسی عورتوں کے لیے ودھوا آشرم بنواتے ہیں، جہاں ان کی عزت و آبرو کی حفاظت ہوتی ہے اور وہ ایک محفوظ زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ظاہر ہے کہ ہندو دھرم کے بڑے بیانیے میں ایسے ودھوا آشرم کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔یہی وجہ ہے کہ پروفیسر دان ناتھ جیسے لوگ اس آشرم کی سخت مخالفت کرتے ہیں اور اس عمل کو دھرم کے بھرشٹ کرنے کی کھلی اجازت سمجھتے ہیں۔اسی طرح خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن'' میں آل انڈیا مسلم لیگ کے مذہبی بیانیے کی ردتشکیل ہے کہ کس طرح مذہبی بنیادوں پر استوار سیاست کے بڑے بیانیوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہاتھوں میں خنجر تھما دیے، حالانکہ پیشتر ان میں ایسا بھائی چارہ تھا گویا ایک ماں کے پیٹ سے جنے ہوں۔

کرشن چندر کے ناول ''پہلا پتھر'' میں گورے اور رنگ دار کے نسلی بیانیے کی ردتشکیل کی گئی ہے۔ اس میں ایک انگریز ماڈل گرل جولی کا ذکر ہے جس کی محبت میں ایک ہندوستانی سرجن ڈاکٹر کنول پرساد مبتلا ہو جاتا ہے لیکن وہ صاف بتا دیتی ہے کہ اس کے خون میں یہ بات شامل ہے کہ وہ رنگ دار لوگوں سے کراہت کرے۔نسل پرستی کا زہر کس طرح انسان کی انسانیت، نیکی، حسن سلوک اور احسان کو کھا جاتا ہے، کرشن چندر نے اپنے اس ناول میں اس بات کو موضوع بنایا ہے۔ جولی ایک حادثے میں شدید زخمی ہوتی ہے، اس کی شکل شباہت بگڑ جاتی ہے اور ایک ٹانگ سے تقریباً معذور ہو جاتی ہے۔ایسے میں ڈاکٹر اس کی مہینوں سرجری کرتا ہے اور ایک مرتبہ پھر پلاسٹک سرجری کر کے اسے ایک اطالوی عورت کے روپ میں جیتا جاگتا بھاگتا دوڑتا انسان بنا دیتا ہے لیکن نسلی تفاخر کے باعث جولی ہمارے پیارے ڈاکٹر کے علم، ہنر، ثقافت، مذہب اور رنگ پر انجام کار لعنت بھیج کر ہندوستان سے واپس لندن چلی جاتی ہے۔اسی طرح قرۃ العین حیدر کے ناول ''گردشِ رنگ چمن'' میں دلنواز بیگم، ماہرو بیگم، عندلیب بیگم، عنبر بیگم اور نواب بیگم نامی طوائفوں کے ذریعے مردانہ برتری کے حامل مسلم کلچر کے بڑے بیانیے کی ردتشکیل کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلم کلچر میں مردانہ عزت اور غیرت کے اضافی تصور نے عورت کی حیثیت اور مقام کو بہت پست درجے تک رہنے پر مجبور کر دیا ہے اور یہ کہ عورت کے مساوی درجے کی خواہش کم از کم مسلم کلچر کی موجودگی میں ناممکن ہے۔

منظر عام پر آنے والے نئے ناولوں میں مستنصر حسین تارڑ کا ناول ''خس و خاشاک زمانے'' سب سے زیادہ مؤثر مابعد جدید ناول ہے کہ جس میں بیک وقت ذات برادری، قومیت، وطنیت، نسلیت، مذہب اور ثقافت کے تمام بڑے بیانیوں کی ردتشکیل کی گئی ہے اور عالم انسانی کے مستقبل کے لیے اپنے دو کرداروں کو زندہ رہنے دیا ہے؛ ان میں ایک حرام کا نطفہ ایک مرد ہے جو خاندان، نسل، مذہب اور قومیت کا کوئی پس منظر نہیں رکھتا اور ایک لڑکی ہے جس کا تعلق سانسی قبیلے سے ہے، جس کی مہذب اور متمدن دنیا میں

شناخت کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔اس ناول میں تارڑ نے بڑے بیانیوں کے تمام بتوں کی عصبیت، ظلم اور سفاکی کو توڑ دیا ہے اور ان بیانیوں کی ردتشکیل کے ذریعے انسانیت کے ایک نئے امکان کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔یہ ایک اور طرح کی ری کنسٹرکشن ہے جس پر اردو ناول کی کہانی نے ابھی کام کرنا ہے۔ایسے کرداروں کی تشکیل جن کے نام تو ہوں لیکن وہ اپنی شناخت بڑے بیانیوں کی اجتماعیت پسند فسطائیت کی بجائے فرد کی ذات اور اس کی آزادی کے سوال کو موضوع بناتے ہوئے نسلی، گروہی، قومی، مذہبی اور ثقافتی شناخت کو تحلیل کر دیں، ہم سردست ایسے کرداروں کو ضرور ایلین قرار دے دیں گے لیکن ایسے کردار جب ناول کی کہانیوں میں جنم لینا شروع ہوں گے تو ہماری ان کرداروں کے ساتھ انسیت بیدار ہونا شروع ہو جائے گی۔ان کرداروں کی تنہائی کے روگ اور اس کی وجوہات پر جب ہمارا تفکر کارگر ہونے لگے گا تو ہم بڑے بیانیوں کی نمائشی اقدار سے باہر نکلنے کے راستے بھی تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو یہ کہنے کی جرأت رکھتے ہوں کہ ہم اپنی قومی، نسلی یا مذہبی عصبیت کی بنیاد پر دوسری قوموں، نسلوں یا مذاہب کے ماننے والوں کو ذلت کی آخری کھائی میں دھکیلنے کو مبنی بر انصاف سمجھتے ہیں! اگر ایسی جرأت کم ہے تو پھر بڑے بیانیوں کی ردتشکیل کے بعد کے عہد پر بھی ناول کی کہانی تخلیق کی جا سکتی ہے۔

بیرون ممالک میں رہنے والے قارئین کے لیے ایک اہم اطلاع

'اثبات' کے پڑھنے والوں کا ایک بڑا حلقہ بیرون ممالک بطور خاص پاکستان میں موجود ہے۔ان کے پیہم اصرار کے باوجود ہم ان تک پرچہ نہیں پہنچا پا رہے ہیں چونکہ ڈاک خرچ میں اتنا اضافہ ہو چکا ہے کہ رسالہ کی قیمت وہاں پہنچ کر تین یا چار گنی زیادہ ہو جاتی ہے۔

چنانچہ، اب اپنی ویب سائٹ پر 'اثبات' کا ہر شمارہ e-book کی شکل میں بھی دستیاب ہوگا۔آپ دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہوں، ایک نہایت ہی معمولی سی قیمت انٹرنیٹ پر ہی ادا کر کے اسے آن لائن پڑھ سکتے ہیں۔یہ سلسلہ آئندہ شمارے سے جاری کر دیا جائے گا، لیکن اب تک کے تمام شمارے (بشمول زیر نظر شمارہ) آپ 'اثبات' کی ویب سائٹ پر مفت پڑھ سکتے ہیں۔پرانے شماروں کو ویب سائٹ پر دھیرے دھیرے اپ لوڈ کیا جا رہا ہے۔درج ذیل لنک پر کلک کریں اور اسے سبسکرائب کر لیں تا کہ اس کی اپ ڈیٹ آپ کو باقاعدہ موصول ہوتی رہے۔

www.esbaat.com

انتظامیہ

آرٹ کا بنیادی مزاج

شویندر
ہندی سے ترجمہ: صدف فاطمہ

شویندر اپنی کہانیوں اور تخلیقی نثر سے کے حوالے سے ہندی ادب میں نو وارد ہیں، لیکن بہت جلد انھوں نے اپنی ایک علیحدہ شناخت بنالی ہے۔ یہیں ممبئی میں رہتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے پہلے مجموعہ ''چاکلیٹ فرینڈس'' میں شامل کہانیوں اور ان کی گفتگو سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ نرے تخلیق کار نہیں ہیں، بلکہ ادب اور آرٹ کے تعلق سے ایک واضع موقف بھی رکھتے ہیں۔ زیر نظر تحریر میں شویندر نے ایک پرانے لیکن بنیادی موضوع کو بالکل نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے، جو ہمیں چونکا تا ہے کہ اچھا! ادب اور فن کو یوں بھی دیکھا جاسکتا ہے؟

اس مضمون سے کئی سوال پیدا ہوتے ہیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اردو تنقید کا کاسہ ایسے اوریجنل افکار سے خالی ہے؟ ہماری تنقید تھیوری اور تعین قدر تک سمٹ کر ختم ہوچکی ہے۔ رسمی اور مکتبی تنقید نے کچھ ایسی فضا بنائی ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں اور سیمیناروں کے ہال ابن رشد، فارابی، ابن عربی اور رازی جیسے 'علاماؤں' سے بھرے پڑے ہیں، لیکن آپ کو ان میں ایک بھی شویندر جیسا نوجوان نہیں ملے گا جو ایک باصلاحیت اور صاحب اسلوب فن کار ہونے کے ساتھ ساتھ صاف و شفاف اور غیر آلودہ فکر کا بھی مالک ہو۔ جو اتنا گستاخ اور ناعاقبت اندیش ہو کہ جس شاخ پر اس کا آشیانہ ہے، اس پر بھی وار کرنے میں نہ جھجکتا ہو اور اپنے ہی وجود پر سوالیہ نشان ثبت کرنے کی جرأت رکھتا ہو۔

اس تحریر کی تازگی اور خلاقانہ پیشکش قارئین کے ذوق بصارت کے حوالے ہے، امید ہے پڑھ کر اپنے تاثرات سے آگاہ کریں گے۔ (مدیر)

میں نے گپھائیں صرف کتابوں اور فلموں میں دیکھیں اور محض تصورات کی دنیا میں ان کی سیر کی ہے۔ پھر بھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میری تخلیقات میں ان کا بہت بڑا کردار رہا ہے۔ میں جنگل میں

جما اور کھلے میدانوں میں پرورش پائی، میں نے دریا دیکھا، دریا کی سرکش لہریں دیکھیں، دریا کا وہ پیکر دیکھا جس میں وہ ایک ماں ہے اور میں نے دریا کا غیظ وغضب بھی دیکھا۔ لیکن عمر کا بڑا حصہ گزر جانے تک میں نے پہاڑ نہیں دیکھے یا پھر راستوں سے گزرتے ہوئے انھیں بس ایک نظر دیکھ لیا۔ انھیں جانا نہیں، کبھی چھوا نہیں۔ پھر بھی مجھے اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اس کی گہرائی میں اترا ہوں اور ان غاروں میں صدیاں گزاری ہیں اور ان کے سنگ بستہ سینوں پر اپنے ناخنوں سے خراشیں لگائی ہیں۔ ان چٹانوں پر تصویریں بنائی ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ آپ مجھ پر اعتبار نہیں کر رہے ہیں، مجھے خود پر بھی یقین کہاں ہے، اس کے باوجود مجھے یہ کہہ لینے دیجیے کہ چالیس ہزار برس پہلے انڈونیشیا کے Sulawesi غاروں میں تصویریں میں نے ہی بنائی ہیں، فرانس کے Chauvet Cave میں میری ہی یادیں درج ہیں اور Cave of the hands(Argentina) میں منقش پنجوں کے نشان میرے ہی ہیں۔ بھیم بیٹکا، اجنتا الورا اور ایلیفنٹا سب میری ہی تخلیقیت کے ثبوت ہیں۔

...اور پھر بھی آج میرے سامنے یہ سوال ہے کہ تخلیقیت کیا ہے؟

بہت عرصہ گزر چکا، لہٰذا اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ ان تنگ وتاریک اور کئی مرتبہ زہریلی گیسوں اور کمر تک پانی سے بھرے غاروں میں جا کر میں نے وہ تصاویر کیوں بنائیں؟ ایسی کون سی چھٹپٹاہٹ تھی جس کی وجہ سے میں اپنے ناخن ان پتھروں پر گھس رہا تھا؟ کیا میں صرف اپنی یاداشتوں کو منعکس کرنا چاہتا تھا؟ یا پھر آنے والی نسلوں کو اپنے ہونے کا ثبوت دینا چاہتا تھا؟ کیا میں یہ چاہتا تھا کہ لوگ میرے فن کو سراہیں؟ کیا میں کسی کا دل جیتنا چاہتا تھا؟ یا پھر محض کسی بوڑھے کے کہنے پر، میں ان غاروں میں اپنے قبیلے کی زندگی اکٹھی کر رہا تھا؛ کہ ہم شکار کیسے کرتے تھے، کیسے عبادت کرتے تھے، کیسے ناچتے تھے، اور ایک بار کیسے ایک موٹے سور کا پیچھا کرتے ہوئے ہم راستہ بھٹک گئے تھے اور اپنے جنگل سے دور کسی شہر میں جا پہنچے تھے۔

نہیں نہیں، اس وقت تک شہر نہیں تھے، پر تب لفظ بھی کہاں تھے، دونوں ہی کو بننے میں ہزاروں سال لگ گئے۔ جب ہمارے آبا واجداد چلتے چلتے اور اشاروں میں گپیں مارتے تھک گئے، تو وہ ایک ندی کے کنارے ٹھہر گئے، انھوں نے جنگلوں کو صاف کیا، بستیاں بسائیں، جانور پالے، مٹی کی کوکھ میں بیج بویا اور اپنے بارے میں اور اپنے آس پاس جو بھی نظر آیا، سب کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا اور اچانک انھیں محسوس ہوا کہ وہ چاروں طرف سے سوالوں میں گھر چکے ہیں، پھر انھوں نے اپنے تخیل کے گھوڑے دوڑائے اور انھیں جن سوالوں کے جواب نہیں ملے، ان کی کہانیاں بنائیں۔

مثلاً یہ کہ زمین شیش ناگ کے پھن پر ٹکی ہے، ہم مر کر سورگ (جنت) جاتے ہیں اور پتہ ہے جانور بھی پچھلے جنم میں آدمی تھے، اور اگر تم نے اِس جنم میں اچھے 'کرم' نہیں کیے ناں تو تم بھی جانور بنا دیے جاؤ گے۔ ان کہانیوں کی حمایت اور تائید کے لیے انھوں نے بھگوان بنائے اور چونکہ اس وقت تک یہ جاننے کا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ زمین پر زندگی ایک خلوی جاندار کی شکل میں پانی میں پنپنی ہے اور آج جو کچھ بھی ہے، اسی کا مسلسل ارتقا ہے؛ انسان بھی، اس لیے انھوں نے یہ قصہ گڑھ لیا کہ انسان کو بھی بھگوان نے ہی بنایا ہے، وہ بھی

بالکل اسی طرح، جس طرح وہ آج نظر آتا ہے۔

قصے ہر شخص نہیں گڑھ سکتا، جنھوں نے ایسا پہلی بار سوچا، وہ اس وقت کے کہانی کار تھے۔

میں جو کہنا چاہ رہا ہوں، وہ یہ ہے کہ مزاحمت نہ آرٹ کی بنیاد ہے، نہ اس کا اصل مزاج۔ ماقبل تاریخ کے غاروں میں ملی تصویروں سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ آرٹ سب سے پہلے خود کو ظاہر کرنے کی خواہش ہے۔ جو ہم دیکھتے ہیں، جو ہم سنتے ہیں، جو غور وفکر کرتے ہیں، جن کے درمیان رہتے ہیں، جن کے ساتھ رہتے ہیں، جن سے جنگ کرتے ہیں، جن سے محبت کرتے ہیں؛ ان کے ساتھ پھر سے جینے کی طرح ہے۔ ان یادوں کو من چاہے پھیر بدل کے ساتھ پھر سے سنجونا ہے۔ اگر 'اورہان پامک' کے ایک ناول کا نام بدل کر کہیں تو 'یادوں کا میوزیم' بنانا ہے۔

اس کے بعد جیسا کہ انسان نے ترقی کی، مثلاً وہ Homohavilis سے Homosapiens بنا (ہاتھ کے استعمال سے لے کر دماغ کے استعمال تک)؛ ویسے ہی آرٹ کا بھی ارتقا ہوا۔ وہ یادوں کا مقبرہ بنانے کے بجائے زندگی اور فطرت کے تعلقات پر غور کرنے لگا؛ ان سوالوں کے بارے میں، جو ہمارے بے حد قریب موجود تھے اور ہم سے اتنے شیر وشکر تھے کہ ہماری نظر ان تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

چنانچہ، تخلیقیت اپنی ارتقائی شکل میں سوال ہے اور ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی کوشش ہے، جن سے ہم گھرے ہوئے ہیں اور جو ہم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ آرٹ ان تین نکتوں کو بنیاد بنا کر اپنا کام کرتا ہے؛ یادداشت، اظہار اور مقصدیت۔

یادداشت کے تحت تجربات آتے ہیں، ذاتی، نسلی سماجی، بنیادی اور روحانی سے لے کر 'لفظ ہی حقیقت ہے' تک والے تجربات۔ جب کہ اظہار میں چھپا ہے تخیل اور کہنے کا فن۔ ہمارے تخیل کی بنیاد کیا ہے، یہ بہت واضح نہیں ہے، مگر مجھے لگتا ہے کہ کہیں نہ کہیں یہ ہمارے تجربات کا ہی تخلیقی روپ ہے۔ تیسرا نکتہ زاویہ نظر کا ہے اور سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی حقیقت کو (جہاں تک ممکن ہو پائے)، اس کی مکمل شکل میں دیکھنا، کسی بھی کام کے سبب کا پتہ لگانا اور اس کی اصل تک پہنچنا۔

اکثر لوگ یہ مان کر چلتے ہیں کہ آرٹ ہے تو حقیقت سے دور ہی ہوگا۔ صحافی بہت آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ تمھیں کیا، تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو، کہانی کار جو ٹھہرے، آخر تمھیں کچھ کہنے کے لیے ثبوتوں کی ضرورت تھوڑی نہ پڑتی ہے۔

ہاں، یہ سچ ہے کہ ہم سچ کہنے کے لیے ثبوتوں اور اعداد وشمار کے محتاج نہیں، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آرٹ سچائی سے ناواقف ہے، اس کے برعکس وہ حقیقت اور تجربوں کو نہ صرف اس کے حال بلکہ اس کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے مستقبل پر اثر انداز ہونے والے پہلوؤں کی جانچ کرتے ہوئے، سب سے زیادہ انسانی پہلوؤں کو دھیان میں رکھتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کرتا ہے۔ (اتنا کچھ کرنے میں کبھی کبھی کافی وقت لگ جاتا ہے اور ہمارے صحافی بھائی یہ سمجھ لیتے ہیں کہ کہانی کار کو آج کی کوئی فکر نہیں۔)

شاید اسی لیے پریم چند نے ایک جگہ لکھا ہے کہ تاریخ میں سب کچھ حقیقی ہونے کے باوجود وہ جھوٹ ہے

اور فکشن میں سب کچھ تخیلی ہونے کے باوجود بھی حقیقت۔

اس بات کو ایک مثال کے ذریعہ اور بہتر طریقہ سے واضح کیا جاسکتا ہے؛ برہمنی حکایتوں میں راجہ ہریش چندر کے متعلق ایک حکایت ہے کہ ایک دفعہ وہ اپنے فوجیوں کے ساتھ شکار پر گئے۔ دفعتاً انھیں ایک ہرن نظر آیا، انھوں نے اس کا پیچھا کیا۔ ہرن اس برق رفتاری سے بھاگا کہ مہاراج اپنے فوجیوں سے بچھڑ گئے۔ وہ ہرن کا پیچھا کرتے ہوئے ایک تنگ راستے پر جاپہونچے، جہاں انھیں کچھ عورتوں کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہریش چندر بہت حیران ہوئے کہ آخر اس بیابان جنگل میں عورتیں کیسے؟ اچانک وہ اس تنگ راستے کو پار کر کے ایک خوبصورت باغیچہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں جو واقعہ پیش آتا ہے، اس سے قطع نظر میں صرف یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ایسی ہی ایک حکایت رامائن میں بھی ہے جس میں راون اپنے سابقہ جنم میں کسی جنگلی سور کا پیچھا کرتے ہوئے ایسے ہی ایک تنگ راستے پر پہونچ جاتا ہے، جس کے اُس پار نظارہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

سوم دیو کی تخلیق ''کتھا سرت ساگر'' میں بھی ایسی کئی کہانیاں ہیں جس میں راجہ کسی جنگل میں سور کا پیچھا کرتے ہوئے ایک تنگ راستے کے ذریعہ ایک ایسی جگہ پر پہونچ جاتے ہیں جہاں پورا کا پورا شہر آباد ہے۔ وہاں اکثر ایک شہزادی غسل فرمارہی ہوتی ہے، وہ یا تو وہاں قیدی ہوتی ہے یا پھر کسی ایسے شخص کی بیٹی ہوتی ہے جو کسی 'شراپ' کے سبب راکشش بن گیا ہے۔ بادشاہ یا شہزادہ اس راکشش کو مارتا ہے اور اس کی بیٹی کے ساتھ شادی کر کے ہنسی خوشی رہنے لگتا ہے۔

یہاں جو چیز اہم ہے، وہ یہ کہ ایک راجا کا شکار کرتے ہوئے اس تنگ راستے پر پہونچنا اور جنگل کے عین وسط میں ایک نئی دنیا کا نظر آنا ہے، پہلی نظر میں یہ ایک جادو سا لگتا ہے؛ ناممکنات سے پُر اور حقیقت سے پرے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا بالکل ممکن ہے۔ ہمیں کرنا بس اتنا ہے کہ اس تنگ راستے کے دونوں کناروں پر آباد جگہوں کو، یعنی جنگل اور شہر کو دو الگ الگ وقت میں دیکھنا ہے۔ دونوں جگہوں میں دراصل ہزاروں سال کا فرق ہے۔ ایک طرف وقت کا وہ رخ ہے، جب انسان جنگلوں میں رہتا تھا اور شکار پر اس کی زندگی کا انحصار ہوتا تھا۔ دوسری طرف وقت کا وہ پہلو ہے، جب تہذیبیں متشکل ہوئیں اور آدمی شہروں میں رہنے لگا۔ بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ کہانیوں کا وہ تنگ راستہ ہزاروں سال کی درمیانی مدت کی علامت بن گیا۔

غیر حقیقی لگتے ہوئے بھی یہ کہانی کتنی حقیقی ہے؛ انسان کی ہزار ہا سال کی تاریخ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اسی سچائی کو جب 'مارکیز' بیان کرتا ہے تو اسے 'جادوئی حقیقت پسندی' کا نام دے دیا جاتا ہے۔ جبکہ یہ 'جادوئی حقیقت پسندی' دنیا بھر کی لوک کتھاؤں میں بہت پہلے سے ہی موجود ہے، انھیں لوک کتھاؤں کو مذہب نے اپنے حق میں استعمال کیا ہے؛ اپنی خود غرضی کے وسائل میں اضافے اور لوگوں کو اپنا غلام بنانے کے لیے۔

یہ آرٹ کا سب سے تاریک پہلو ہے کہ اس کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر چہ ہم ابھی تک

آرٹ کا مزاحمت سے تعلق استوار کرنے سے قاصر رہے ہیں، لیکن مذہب نے بہت پہلے ہی اس کا استعمال کرنا سیکھ لیا تھا، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ آج مذہب جو کچھ بھی ہے، اس کی ترقی آرٹ کی دین ہے۔ آرٹ یادوں کا ذخیرہ ہے، اظہار ہے، انداز ہے، تخیل ہے اور سوال ہے۔ ان سوالوں کے جوابات ہی کی تلاش میں انسان نے مذہب کی تخلیق کی۔

بات اس وقت کی ہے، جب انسان نے غاروں کو چھوڑ دیا تھا اور وہ جنگل کو صاف کرتے ہوئے دریاؤں کے کنارے بسنے لگا تھا، یہ زمانہ تقریباً ۳ سے ۴ ہزار سال قبل مسیح کا ہے۔ میرے سامنے دنیا کی قدیم ترین تہذیبیں مجسم ہو رہی ہیں؛ دریائے نیل کے ساحل پر آباد مصر کی تہذیب، ٹگرس کے ساحلوں پر میسوپوٹامیا، دریائے سندھ کے کنارے ہڑپا اور موہن جوداڑو کی تہذیب اور دریائے یلو کے پہلو میں آباد شانگ سلطنت۔

انھیں شہری تہذیبوں میں سے کسی ایک میں یا شاید تھوڑا تھوڑا کر کے ہر جگہ میں جنما۔ میں جو کہ آج کا انسان ہوں؛ روم و یونان اور میسوپوٹامیا، موہن جوداڑو سب ایک ایک کر کے مٹ گئے، پر میں آج بھی بچا ہوا ہوں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ روم و یونان، مسوپوٹامیا اور موہن جوداڑو بھی باقی ہیں۔

میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ آریہ کون تھے اور کہاں سے آئے؟ اگر وہ وادیٔ سندھ سے نہیں آئے تھے اور انھوں نے ہی وادیٔ سندھ والوں کا نام ونشان مٹایا تھا، تب بھی ہڑپا والوں نے مرتے مرتے بھی انھیں بہت کچھ دے دیا تھا؛ سواستک سے لے کر پشوپتی ناتھ تک، دونوں تہذیبوں میں بہت کچھ مشترک ہے۔ تو کیا ہوا، اگر ہڑپا والوں کے پاس گھوڑے نہیں تھے، تب بھی انھوں نے آریوں کے رتھ پر سواری کی اور سندھو میں آئی قیامت کے باوجود بچ گئے اور ہندو ہو گئے۔

ان کے ہندو ہونے میں آرٹ کا بہت اہم رول رہا ہے۔ دنیا کے کسی بھی مذہب کی ترویج وتشکیل میں آرٹ ایک اہم کردار ہے۔ ابتدا میں جب ہم نے غاروں میں تصویریں بنائی تھیں، اس وقت ہمارے پاس زیادہ تر شکار کرنے ہی کی یادیں تھیں تب بھی اپنی ہتھیلیوں کو پتھروں پر چھاپ کر ہم نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ ہم کون ہیں؟ یہی سوال آگے جا کر آرٹ کا ایک شعبہ روحانیت کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا جس پر مذہب کی بنیاد رکھی گئی۔

ابتدا میں دنیا بھر کے سبھی مذاہب نسبتاً زیادہ کشادہ قلب تھے۔ ان کے خدا ہوائی ہونے کے بجائے زمینی تھے، کیونکہ ان کی تخلیق کرنے والے صحیح معنوں میں اپنے زمانے کے شاعر یا فنکار تھے۔ اسی لیے عیسیٰ خدا کے بیٹے ہوتے ہوئے بھی مریم سے محبت کرتے ہیں اور اِندر دیوتاؤں کے راجا ہونے کے باوجود بھی مزے میں شراب پیتے ہیں۔

اصل مسئلہ وہاں سے شروع ہوا، جب انسانوں کے ایک طبقے کو یہ احساس ہوا کہ اپنے بارے میں اب تک کی ہوئی تمام ایجادات اور تصورات کو وہ اپنے فائدہ کے لیے استعمال کر سکتا ہے، اس کے بعد ہی وہ مذہبی گروؤں، ملاؤں، پروہتوں اور پنڈتوں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بن گیا، تبھی پرانے عہد نامے کی جگہ ایک نئے

عہد نامے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اِندر کی تمام طاقتیں وشنو کو دے کر ایک زیادہ اخلاقی دیوتا کی تخلیق ہوئی۔

رِگ وید کے دسویں باب میں، جس میں ذات پات کے نظام کا تصور ہے، بہت سے علما نے اسے بہت بعد کا تسلیم کیا ہے۔ خود امبیڈکر نے یہ ثابت کیا ہے کہ شودر، چھتریوں کی ہی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ جن عورتوں نے رگ وید کے منتر کبھی لکھے تھے، ان ہی سے ان کے سارے حقوق چھین لیے گئے اور جن لوگوں نے برہمنوں کا کہنا ماننے سے انکار کر دیا، انھیں اچھوت بنا کر استحصال کے ایسے چکر میں پھنسا دیا گیا کہ دنیا کے کئی ملک کئی بار غلام ہو کر آزاد بھی ہو گئے، لیکن ان کی آزادی اب تک گروی رکھی ہوئی ہے۔

یہ سب ہتھیاروں کے زور پر نہیں ہوا بلکہ یہ سب کیا گیا آرٹ کو ایک ہتھیار بنا کر۔ اس لیے آرٹ کی بنیاد اور اس کے مزاج پر بات کرنے سے پہلے ہمیں آرٹ کی دین پر گفتگو کرنی چاہیے۔

یہ ٹھیک ہے کہ آرٹ کی بنیاد تخلیق ہے اور اس کے دو اہم شعبے ادب اور سائنس کی بنیاد پر ہی ہم نے یہاں تک کا سفر طے کیا ہے، مگر ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ آرٹ ہی نے جنم دیا ہے استحصال کو، اونچ نیچ کو، غریبی اور بھک مری کو، جھوٹ، فریب اور دھوکے کو۔ آرٹ نے چھینا ہے ہم سے ہماری آزادی، بھائی چارگی اور مساوات کے جذبے۔ راجاؤں کے انصاف کی کہانیوں نے اقتدار کی ناانصافیوں کو ڈھانپے رکھا۔ ساوتری، انوسویا اور اہلیا جیسی ستی ہونے والی عورتوں کی داستانیں سنا سنا کر عورتوں کو زندہ جلایا جاتا رہا اور دیوتاؤں کے سارے دھندوں کو آج بھی جنت اور دوزخ کی کہانیوں ہی نے سنبھال رکھا ہے۔

اشتہار کے آرٹ پر تو پوری کی پوری صارفیت پھل پھول رہی ہے اور اسی کے بل پر ہمیں گائے کے گوبر سے لے کر فسادی وزیراعظم تک؛ سب کچھ بیچا جا رہا ہے۔

بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ انسان نے اپنے اس ارتقائی سفر میں تقریباً ایک کلو عقل کمائی ہے۔ ابتدا میں انسان کا دماغ ۴۰۰ گرام کا ہوا کرتا تھا، جب کہ اب ہمارے دماغ کا وزن ۱۴۰۰ سے ۱۵۰۰ گرام تک ہوتا ہے، لیکن سماج نے، مذہب نے اور سیاست کے آرٹ نے ہمیں آگاہ کیا ہے کہ ۴۰۰ گرام سے زیادہ نہ سوچیں۔ ہمارے ڈیڑھ کلو کے دماغ کو ۴۰۰ گرام کے عقائد میں قید کرنے کی سازش رچی گئی ہے اور اگر یہ سازشی کامیاب ہوئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم لاکھ مزاحمت مزاحمت چلائیں لیکن وہ آرٹ کا ہم سے بہتر ناجائز استعمال کرنا جانتے ہیں۔

بچپن میں پڑھا تھا اور اس پر ہنسا بھی تھا، لیکن آج سمجھ میں آ رہا ہے کہ کیوں افلاطون نے کہا تھا کہ اگر میرا بس چلے تو میں سبھی شاعروں کو اپنی ریاست سے باہر نکال دوں؛ کیونکہ شاید ہمیشہ یہ ڈر بنا رہتا ہے کہ شاعر کب اپنے فن کی طاقت کا استعمال اقتدار کے لیے کرنے لگے۔ جس 'منوسمرتی' کی نقلیں بابا صاحب امبیڈکر نے جلائی تھیں، اس استحصالی چکر کو تخلیق کرنے والا 'منو' ایک شاعر ہی تو تھا۔ 'ڈھور، گنوار شودر، پشو ناری وغیرہ جیسی ذہنیت کو عوام کے دلوں میں بٹھانے والا تلسی داس ایک شاعر ہی تھا۔ کیا آپ نے اٹل بہاری باجپائی کی ''میری اکیاون کویتائیں'' نہیں پڑھیں؟ کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ نریندر مودی نے تین کتابیں بھی لکھی ہیں؟

اس ضمن میں، میں بھاجپا کے شری شری منوج تیواری کا نام بھی لینا چاہتا ہوں جو بنیادی طور پر ایک شاعر اور نغمہ نگار ہیں اور جنھیں میں نے اپنے اسکول کے دنوں میں اپنے اسکول میں ہی براہ راست سنا تھا۔شری منوج تیواری مانتے ہیں کہ کشمیر میں امن وامان قائم کرنے کے لیے پاکستان کے ساتھ نیوکلیر جنگ بے حد ضروری ہے۔اپنے اس جذبے کو جب وہ 'جمہوری' نغمے میں ڈھالتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ ''ایک ٹھے اوہر سے پھینکا ایگو، ایہرو سے پھینکائی، اہرتا چھلائی اوہر صاف ہو جائی'' تو لوگ جھوم اٹھتے ہیں اور اپنی سارے مسائل بھول جاتے ہیں۔ڈیڑھ کلو عقل رکھنے والا جدید معاشرہ ۴۰۰ گرام کا دماغ رکھنے والی متعصب بھیڑ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

میں اس حادثے کو کبھی بھول نہیں پاتا ہوں، کیونکہ قریب قریب ایسے ہی دقیانوسی جذبوں کی پرورش کرنے والی اور ترقی یافتہ ذہنوں کو ہزاروں سال پیچھے دھکیلنے والی سوچ پر ہر روز کتنے ہی ٹی وی شو اور فلمیں بن رہی ہیں۔ہم اور آپ مانیں یا نہ مانیں، کیوں کہ ہم ترقی مخالف لوگ ہیں، لیکن ایسے ہنگاموں کو پیش کرنے والے لوگ بھی خود کو فن کار مانتے ہیں۔

اگر ہم آرٹ کے اس پہلو پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہم نے اس کو حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ کھویا ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ آرٹ ہی ہے جس کے ذریعہ ہم نے اپنی تہذیب کی اتنی بلندیاں حاصل کی ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کتنے لوگوں نے؟ ہم کہتے ہیں کہ ہم انسان ہیں اور اشرف المخلوقات ہیں، مگر کتنے لوگ سچ مچ سوچ سکتے ہیں؟ اور ہمیں سوچنے کی کتنی آزادی ہے؟ جو بھی سوچنا شروع کرتا ہے، وہ خرید لیا جاتا ہے یا پھر مارا جاتا ہے۔سقراط، کلبرگی سے لے کر گوری لنکیش تک اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

اس لیے مجھے لگتا ہے کہ مزاحمت آرٹ کا بنیادی مزاج نہیں ہے، وہ تو صرف ہتھیار ہے، جسے لے کر ایک لڑائی لڑی جا سکتی ہے۔ہم بار بار تخلیقیت کی سگائی مزاحمت کرتے رہتے ہیں، اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم اپوزیشن میں ہیں۔سوچیے، اگر ہم ایسا سماج کو حاصل کر لیں، جس کا ہم آج خواب دیکھتے ہیں، جس میں آزادی، برابری اور بھائی چارگی ہو تو کیا تب بھی ہماری مٹّھیاں بھنچی ہوئی ہوں گی؟ کیا تب بھی ہم تیوریاں چڑھائے ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے؟ کیا تب بھی ہمارا آرٹ مزاحمت کا علم بلند کر کے محض نعرہ بازی کرتا پھرے گا؟

اس وقت اگر ہم ایک ساتھ اکٹھا بھی ہوں گے تو صرف جشن منانے کے لیے، پیار کے نغمے گانے کے لیے، اس بات کا چرچا کرنے کے لیے کہ دیکھو یہ دنیا کتنی خوبصورت ہے۔

لہٰذا، مزاحمت آرٹ کا اصل مزاج نہیں بلکہ یہ ہمارے وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور یہ ضرورت تب تک بنی رہے گی جب تک ہم اس دنیا کو حاصل نہیں کر لیتے جس کی تلاش میں ہم درختوں سے نیچے اتر کر اس زمین تک آئے ہیں۔

سید کاشف رضا کی نظمیں

سید کاشف رضا کی نظموں کے دو مجموعے ''محبت کا محل وقوع'' اور ''ممنوع موسموں کی کتاب'' شائع ہو چکے ہیں۔ وہ غزل بھی کہتے ہیں۔نوم چومسکی، میلان کنڈیرا اور بورخیس جیسے مایہ ناز لکھنے والوں کے تراجم انھوں نے کیے ہیں۔ پاکستان کے مشہور معاصر صحافی و ادیب محمد حنیف کا ناول ''دی کیس آف اکسپلوڈنگ منگوز'' بھی انھوں نے ''پھٹتے آموں کا کیس'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ان کے سفرنامے بھی بے حد دلچسپ ہیں۔ کاشف رضا نے حال ہی میں ایک ناول بھی لکھا ہے، جس کا عنوان ''ایک کچھوا اور چار درویش'' ہے۔ان کے تخلیقی عمل کی کامیابی کی ضمانت یہی بات ہے کہ ان کا پہلا ناول شائع ہوتے ہی ادبی حلقوں میں ایک اہم موضوع کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔کاشف رضا کی اتنی ساری شناختوں میں سے بحیثیت نظم نگار ان کی پہچان بے حد اہمیت رکھتی ہے۔آپ ان کے شعری مزاج کو ان کی نظم کے اس ایک چھوٹے ٹکڑے سے سمجھ سکتے ہیں، جو کہ مجھے بے حد پسند ہیں۔

اپنی زندگی کے لیے ہم
ایک قتل کے شکر گزار ہیں
جسے مؤخر کر دیا گیا
ورنہ ہمیں صرف
ایک خودکشی کا ممنون رہنا پڑتا
جو ہم نے ملتوی کر رکھی تھی

(مدیر)

ایک عشق کی نسلی تاریخ

میں اس کی سانسیں سونگھتا ہوا
دریاؤں اور میدانوں میں داخل ہوا تھا
اور وہ مجھے زرخیز زمینوں کی طرح ملی تھی
میں تاریک رات میں جما ہوا مہتاب تھا
اور وہ شریانوں سے خون اچھال دینے والی
تمازت تھی
میں ریت کی کشادہ دامنی تھا
اور اس کی پشت سرما کے سورج کی طرح تھی
میں ایڑھ لگائے ہوئے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر
کودنے والے کا بیٹا تھا
اور اس کی آنکھوں میں
جاٹوں کی خوں ریز صدیاں چنوتی دیتی تھیں
وہ گناہ کی طرح نمکین تھی
اور وہ ذائقہ تھی جو چکھے بغیر زبان پر پھر جاتا تھا
اور میں اس کی گدی میں دانت گاڑ دینے کی
حسرت تھا
وہ دھرتی پر پھیلا ہوا سرسوں کا کھیت تھی
اور اس کے ہاتھ گندم کاٹنے والی
ماں نے بنائے تھے
اور اس کی ناف کے گرد بھرا پرا شکم تھا
اور اس کی گھنڈی میں ایسی جان تھی
کہ اس کا باپ موریہ عہد میں
پتھر چمکانے کا کاریگر معلوم ہوتا تھا
اور اس کے جسم میں توے سے سرخ کی ہوئی
روٹی کی خوشبو تھی
اور میں آنتوں سے اُگی ہوئی آرزو تھا
اور میں تلواروں کی موسیقی پر پڑھا ہوا رجز تھا
اور میں تیر کھائے ہوئے گھوڑے سے
گری ہار تھا
اور وہ طعنے سے دہکی ہوئی ونگار تھی
اور وہ ایسی جیت تھی
جس کی یاد میں
زمین پر کوئی لاٹھ گاڑی جاسکتی تھی

تم موت اور محبت کی خوشبو سے بنی ہو

تم موت اور محبت کی خوشبو سے بنی ہو
میں
تمھاری خوشبو کو
ریزہ ریزہ سمیٹتی سانسوں سے

سایہ دار جگہوں میں جمع ہو جانے والی
موت کی خوشبو کو
تم اپنے شانوں پر کھلا چھوڑ دیتی ہو
اور محبت کی خوشبو کو
اپنے چہرے پر مسکراتا رہنے دیتی ہو

موت کی خوشبو تمھاری آنکھوں میں جمع ہو جاتی ہے
اور تم مجھے دیکھتے ہوئے
اپنی پلکوں کے سائے گہرے کر دیتی ہو
محبت کی خوشبو ان آنکھوں میں پھیلنے لگتی ہے
جو پلکوں کو جھپک لینے کے بعد
کشادہ ہونے لگتی ہیں

میں تمھیں ایک
سیاہ لباس میں دیکھنا چاہتا ہوں
جس میں سے تم
فجر کی طرح طلوع ہو سکو
میں تمھیں ایک
سفید لباس میں دیکھنا چاہتا ہوں
جس میں میں
موت کی طرح غروب ہو سکوں

میں، وہ اور اس کا خدا

عبادت کرتے ہوئے
وہ یکسو نہ ہو سکی
اس کے دھیان کے اس حصے میں
جہاں خدا کو ہونا چاہیے تھا
میں موجود تھا

پھر بھی کچھ جگہ بچ رہی تھی
جہاں خدا موجود رہا
میں نے اپنے ساتھ اس کی قربت کو
بڑی دلچسپی سے محسوس کیا

بچ رہنے والی جگہ میں
خدا
بوڑھے آدمی کی خشونت کے ساتھ
موجود رہا

عبادت کرتے ہوئے
اس نے جو دعائیں مانگی تھیں
خدا کی بارگاہ میں مسترد کر دی گئیں

مجھے ایک کشتی بنانے کی اجازت دو

اگر تم میری دھرتی کو
اپنے گھوڑوں کی چراگاہ
اپنے کتوں کی شکارگاہ بنانا چاہتے ہو
تو مجھے بھی ایک کشتی بنانے کی اجازت دو
جس میں میں لاد کر لے جاسکوں
اپنا کنبہ
خوابوں کی گٹھڑیاں
اور ایک عورت
جو میرے ساتھ چلنا پسند کرتی تھی
مجھے نکال کر لے جانے دو
گلیاں جن کی
دھول میرے پیروں نے چاٹی
شہر جن کی
خاک میری آنکھوں نے پھانکی
لوگ جو تم سے
اجازت لے کر پیدا نہیں ہوئے
لوگ جو تم کو
اطلاع دیے بغیر مر گئے
مجھے نکال کر لے جانے دو
ٹوٹے ہوئے چولھے
بکھری ہوئی تختیاں
بچے جن کی
قمیصوں میں بٹن نہیں ہوتے
مجھے نکال کر لے جانے دو
میری ماں کی قبر
جسے میں تمھارے گھوڑوں
تمھارے کتوں کے لیے نہیں چھوڑ سکتا

اجتماعی مباشرت

تاریخ سے اجتماعی مباشرت
ہم نے کھیل سمجھ کر شروع کی
پھر شور بڑھتا گیا
اور ہمارا شوق دیکھ کر
ہماری بریدہ تاریخ
ہماری زوجیت میں دی گئی
اب اس کے بچے کتوں سے زیادہ ہیں

مارے جانے والوں کے لیے

یہ سال
ان مارے جانے والوں کے لیے
دعاوں کے سال کے طور پر منایا جا رہا ہے
جو پچھلے برس مارے گئے

اگلے سال
یہ تمام دن منانے کے لیے
نئے لوگ اور سانحے تلاش کیے جائیں گے

جب ہمارے مارے جانے والوں کے دن
تین سو پینسٹھ سے زیادہ ہو گئے تھے
ہم نے انھیں ایک سفاک لکیر سے تقسیم
کر دیا تھا

اب ان مارے جانے والوں کے لیے
ایک علاقے میں سوگ
اور دوسرے میں جشن منایا جاتا ہے

ہم اپنی زندگی کے لیے شکرگذار ہیں

اپنی زندگی کے لیے
ہم ایک قتل کے شکرگذار ہیں
جسے موخر کر دیا گیا

ورنہ ایک محبت تھی
جو ہم نے دل میں چھپا کر رکھی ہوئی تھی
اور ایک نفرت تھی
جس کا پتہ ہم کسی کو نہیں لگنے دیتے تھے

ورنہ ہم نے
وہی قصور کیے تھے جو
مارے جانے والوں نے کیے تھے
ورنہ ہمارے باپوں نے
ہمارے مارے جانے کی وجہ
ہمارے برتھ سرٹیفکیٹس میں درج کرا دی تھی

اپنی زندگی کے لیے، ہم
ایک قتل کے شکرگزار ہیں
جسے موخر کر دیا گیا
ورنہ ہمیں صرف
ایک خودکشی کا ممنون رہنا پڑتا
جو ہم نے ملتوی کر رکھی تھی

قلم اور کالم

حسنین جمال

ابتدائی اردو کالم نگاری چاہے وہ مولانا ظفر علی خان ہوں ، چراغ حسن حسرت ہوں، شورش کاشمیری ہوں یا بعد کے ادوار میں انتظار حسین وغیرہ، ؛ان حضرات کے کالم ادبی بھی تھے اور فکری بھی۔ بیشتر جدید اردو کالم نگاری صرف اور صرف چند اخباری خبروں کا مجموعہ ہی باقی رہ گئی ہے اور اگر کبھی اس میں ادبی رنگ پیدا کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے تو مزاح کا رنگ ڈال دیا جاتا ہے لیکن وہ بھی پھکڑ بازی کا انداز لیے ہوتا ہے۔ آج کے کچھ چنندہ صاحب اسلوب کالم نگاروں میں حسنین جمال کے کالم مجھے کافی پسند ہیں۔

حسنین جمال پاکستان میں رہتے ہیں اور ان کے کالم وہیں کے اخباروں اور کئی انٹرنیٹ میگزین میں چھپتے رہتے ہیں۔ ان کے کالم کی جو سب سے بڑی خصوصیت مجھے نظر آئی وہ یہ کہ گہرا سماجی شعور رکھنے کے باوجود وہ ناصحانہ انداز اختیار نہیں کرتے اور نہ بھاری بھرکم موضوع کا انتخاب کرتے ہیں بلکہ اپنے آس پاس کی گری پڑی کوئی چیز اٹھاتے ہیں، اسے جھاڑ پونچھ کر اپنے کالم کے شوکیس میں کچھ اس طرح سجا دیتے ہیں کہ جب قارئین کی نظر اس پر پڑتی ہے تو وہ رشک وحسد سے سوچنے لگتا ہے کہ اس کے قریب ہو کر بھی اس کی نظر اس چیز پر کیوں نہ پڑی۔ یقین نہ آئے تو آپ ہی ان کے کالم پڑھ کر فیصلہ کریں اور مجھے اپنے تجربے سے آگاہ کریں۔ (مدیر)

یہ شہر چائے نہیں پینے دیتا

حسنین جمال

جب میں یہاں آیا تھا تو میرے پاس بہت سا وقت تھا۔ میں کسی بھی درخت کے نیچے گھنٹوں بیٹھ سکتا تھا۔ میں دور دور تک پھیلا آسمان محسوس کر سکتا تھا، مجھے ہوا کی سرسراہٹ اپنے کانوں کو تھپکتی محسوس ہوتی

تھی۔ دھوپ اچھی لگتی تھی۔ گرمیوں کی دھوپ بھی مجھے باغوں سے دور نہیں بھگاتی تھی۔ میں حبس میں سانس لے سکتا تھا۔ میں گھاس سے اٹھنے والی مہک سونگھ سکتا تھا۔ میں سبزے کے چھ شیڈز گنوا سکتا تھا، ان کے نام بتا سکتا تھا۔ مجھے بارش میں نہانا پسند تھا۔ جتنی مرضی تیز بارش ہو جاتی میں نہاتا رہتا۔ مجھے بارش میں چلنے والی ہوا سے ٹھنڈ نہیں لگتی تھی۔ میں ننگے پاؤں پینتیس گلیوں میں بھاگتے بھاگتے پورے شہر پہ بارش کے گندے پانی کی چھینٹیں اڑا سکتا تھا۔ جراثیم میرے دوست تھے۔ مجھے پرنالوں کے نیچے کھڑے ہو کے ان کا پریشر اپنے سر پہ محسوس کرنے میں مزہ آتا تھا۔ بارش کے بعد دھلا آسمان، چمکتی دھوپ اور گہرے سبز درخت کسی تصویر کی طرح میرے دماغ میں ہیں۔

وہ ادھر، اس گلی کے آخری کونے سے ایک گاڑی نمودار ہوئی تھی۔ وہ گاڑی ایک مہربان چہرہ چلا رہا تھا۔ وہ میرے باپ کا دوست تھا۔ اس نے مجھے پلاسٹک کی ایک گیند تحفے میں دی۔ اس گیند کے اندر نامعلوم کیا چیز بھری تھی۔ اسے جتنا زور سے زمین پہ مارا جاتا وہ اتنی ہی تیزی سے واپس آتی اور اندر موجود لیکوئیڈ میں ستارے جھلملانے لگتے۔ وہ گیند میں نے کبھی پہلے نہیں دیکھی تھی۔ وہ ٹھپا کھا کے اس تیزی سے نکلتی کہ اس کے پیچھے آنکھیں دوڑانا مشکل ہو جاتا۔ ایک دفعہ اسے کھینچ کے زمین پر جو مارا تو وہ واپس نہیں آئی۔ کسی چیز کے واپس نہ آنے سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔

موت سے میرا دوسرا تعارف اس وقت ہوا جب میں گلابی قمیص اور نیلی پتلون پہن کر اسکول جاتا تھا۔ سردیاں آ چکی تھیں۔ موٹی سی ایک جیکٹ پہنے ہوئے میں اسکول گیا تھا۔ وہاں کلاس کے بیچ میں آ کر کسی نے بتایا تھا کہ اس کو چھٹی دے دی جائے، اس کے دادا کی وفات ہو چکی ہے۔

وفات؟ اچھلتے کودتے گھر واپس آیا تو صحن میں ایک چارپائی تھی اور اس پہ دادا سفید چادر اوڑھے لیٹے تھے۔ وہ ہلتے جلتے بھی نہیں تھے اور ان کی آنکھیں بھی بند تھیں اور وہ سو بھی نہیں رہے تھے۔ کہیں کچھ غلط تھا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ اسے وفات کہتے تھے۔ یہ موت تھی۔ تو میری گیند بھی شاید وفات پا گئی تھی۔ یہ میں نے اس وقت سوچا تھا لیکن تب ہر شخص غمزدہ تھا، میں کسی سے غیر ضروری سوالات پوچھنے میں بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے بعد میرے باپ کو ایک لمبی سی چادر، جو سفید رنگ کی تھی، وہ سر پہ باندھی گئی۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ اب ان کی جگہ پر خاندان کے سردار ہیں۔ لیکن ان سے بڑی دادا کی ایک بیٹی تھیں۔ انھیں کیوں نہیں باندھی گئی، یہ بھی میں اس وقت نہیں پوچھ سکا۔ گیند کی وفات اور مرد کی سرداری اس دن میرے دماغ میں جا کے ٹھپے کھاتے اچھلتے رہے تھے۔

دو تین دن بعد جب دادا زمین میں دفن ہو چکے تھے اور ان کی آرام گاہ سیمنٹ سے پکی کی جا چکی تھی اور ایک پتھر کے ٹکڑے پر ان کا نام لکھوا کر ان کے سرہانے لگایا گیا تو مجھے موت سے مکمل تعارف حاصل ہوا۔ میری گیند مری نہیں تھی۔ اس سوال کا جواب مجھے مل گیا۔ پگڑی کیوں باندھی گئی اس کا جواب بعد میں وقت نے دیا۔

تو اس وقت میں یہ سب کچھ سوچتا تھا۔ مجھے وہ گلیاں بہت طویل لگتی تھیں جہاں میں کھیلتا تھا۔

وہاں کی ایک ایک اینٹ میں پڑا ہر گڑھا مجھے یاد تھا۔ کس مکان کے دروازے کا رنگ کیسا ہے، کس دیوار پہ کس رنگ کا چونا ہے، کس کے یہاں ڈور بیل ہے، کہاں کنڈی کھڑکانی ہے، مجھے سب معلوم تھا۔ مجھے یہ تک یاد ہے کہ میں اپنی اسکول کی رف کاپی میں کس رنگ کے اسٹیکر لگانا پسند کرتا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت تھا جیسے ہر نیا دن سو گھنٹوں کا ہو اور ہر اگلی رات پچھلی سے دو گھنٹے زیادہ طویل ہو۔ مجھے خوراک کے ذائقے ناک اور زبان دونوں سے محسوس ہوتے تھے۔ میں صرف ہری مرچوں یا دہی کے زور پہ روٹی نہیں کھاتا تھا۔ ہر چیز کا الگ الگ ذائقہ، الگ الگ خوشبو، سب کچھ میرے دماغ پر نقش تھا۔ میری دنیا میں ابھی سوڈے کی بوتلوں کا اضافہ نہیں ہوا تھا۔ چائے لیکن مجھے پسند تھی۔ چائے بڑوں کا مشروب تھا مگر میں ضد کرتا تو مل جاتی تھی۔

ایک کپ چائے کتنے مزے سے اور کتنی دیر تک میں پیتا رہتا، یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ پہلے میں اس کے اوپر پلیٹ رکھ کے بھاپ سے جو پانی بنتا ہے، وہ سونگھتا تھا، اسے ایک ایک قطرہ پیتا تھا۔ پھر چائے کے اوپر بن جانے والی جھلی چمچ سے اٹھا کے دور کہیں پھینک دیتا تھا۔ چائے والا کپ ناک کے پاس کرتا تو اس میں ایک جانی پہچانی سی خوشبو آتی تھی۔ دودھ ابالتے ہوئے گھر کی عورتیں اس میں الائچی ضرور ڈالتی تھیں۔ تو وہی خوشبو چائے میں موجود ہوتی تھی۔ وہ اتنی دبی ہوئی خوشبو ہوتی کہ اب شاید اسے سونگھنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پھر میں پہلا گھونٹ بھرتا تھا۔ ڈرتے ڈرتے گھونٹ لینے کے دوران جس ہاتھ سے کپ تھاما ہوتا اس کی تیسری انگلی خواہ مخواہ کھڑی ہو جاتی۔ یہ آج بھی ہوتا ہے۔ تو پہلے گھونٹ سے جیسے اندر تک چائے اترتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ دوسرا گھونٹ میں تب لیتا جب مجھے اچھی طرح معلوم ہو جاتا کہ اب انگلی کھڑی کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ مجھے اپنی اس عادت سے چڑ تھی لیکن وہ ہوتا تھا اور مجھے بعد میں انگلی اٹھنے پر ہمیشہ یاد آتا تھا۔ جب تک نیچے پتی نظر نہیں آتی تھی تب تک میں چائے پیتا رہتا تھا۔ آخری گھونٹ آدھا تھوکنا پڑتا، کیوں کہ اس میں ہمیشہ پتی آجاتی تھی۔

ابھی دیکھو میں تمہیں کتنی تفصیل سے یہ سب کچھ بتا رہا ہوں۔ اب بھی یہ سب کچھ میرے پاس ہے۔ میں یہ سب کام کر سکتا ہوں۔ میں شاور کے نیچے وہ سب مزے لے سکتا ہوں جو بارش میں لیا کرتا تھا۔ میں گھر کے لان میں لوٹیاں لگا سکتا ہوں۔ میں ٹیرس پہ دھوپ سینکنے جا سکتا ہوں۔ میں اس گیند جیسی ہزاروں گیندوں سے اپنا گھر بھر سکتا ہوں۔ وہ ٹھپے کھاتی میرے اردگرد اچھلتی رہیں اور میں ان کو پکڑتا رہوں، یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ میں سالم درخت خرید کے سامنے سڑک میں گڑوا سکتا ہوں لیکن اب ... اب وقت میرے پاس نہیں ہے۔ اب تو چائے بھی میں اپنے اندر اس وقت انڈیلتا ہوں جب وہ یخ ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ شہر مجھے پیسے دے کر مجھ سے وقت خرید چکا ہے۔ میرا آسمان اب سفید چھت ہے، میری گھاس اب بوٹی سینا ماربل ہے، میری بارش ... سنو اصلی بارش میں اب مجھے ٹھنڈ لگتی ہے، اب وہ مجھے پسند بھی نہیں رہی۔ اب میں ننگے پاؤں گھومتا ہوں تو گھر والے سمجھتے ہیں بوڑھا پاگل ہو گیا ہے۔ اب مجھے یہ شہر چائے بھی نہیں پینے دیتا۔ میں نہیں جانتا اب چائے سے کوئی خوشبو آتی بھی ہے یا نہیں، وہ جھلی اب چائے پر کیوں نہیں بنتی۔ گھاس اب ایک ہی رنگ کی باقی رہ گئی ہے یا واقعی کوئی ہوگا جو اس کے شیڈز گنوا سکے۔

جب میرا تعارف موت سے ہوا تھا، شاید وہی وقت تھا جس کے بعد آہستہ آہستہ دن اور رات بھی مختصر ہونے لگے تھے۔ اب میری گھڑی صبح دس بجے شام کے پانچ بجا دیتی ہے۔ تمہارے ساتھ ایسا ہوتا ہے؟ شہر تمہیں چائے پینے دیتا ہے؟ جی بھر کے پی لو، کچھ ہی وقت ہے، تمہیں اندازہ ہوگا کہ بوڑھا پاگل نہیں تھا۔

☆

اخباروں سے سجی دیواریں

حسنین جمال

میں ایک ایسے کمرے میں رہتا ہوں جس کا سائز دس ضرب دس فٹ ہے۔ میرے پانچ بچے ہیں۔ میرے بھائی اور بہن بھی میری طرف ہی کھانا کھاتے ہیں۔ آپ ذرا میرے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائیں۔ دیواروں کو ہی دیکھ لیں۔ آپ کو بعض جگہ بہت سے اخبار چپکے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہ ہمارے گھر کی واحد سجاوٹ ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ معلوم ہے کیا ہوتا ہے؟ دیواروں پہ چلنے والے کیڑے مکوڑے، چھپکلیاں، لال بیگ، کچھ بھی ہو سامنے نظر آجاتا ہے۔ آپ کم از کم اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں۔ پھر یہی اخبار دیواروں کے وہ نشان بھی چھپا دیتا ہے جو برسوں سے وہیں جمے ہوئے ہیں۔ میں کچھ عرصے بعد انھی پہ نئے اخبار چپکا دیتا ہوں، میرا کمرہ پھر سے نیا ہو جاتا ہے۔ پھر یہاں دل بھی لگا رہتا ہے۔ میں دو تین جماعتیں پڑھ گیا تھا تو میں تھوڑے بہت حرف جوڑ لیتا ہوں۔ فارغ وقت میں دیواریں پڑھنے کا مزہ آتا ہے۔

اس گھر میں ایک گڑبڑ ہے۔ ہم کل ملا کے دس لوگ اس ایک کمرے میں رہتے ہیں اور پلنگ ہمارے پاس ایک ہی ہے۔ ہم میں سے کچھ تو جیسے تیسے اسی بیڈ پہ لیٹ جاتے ہیں، کچھ اس پلنگ کے نیچے ٹانگیں سیدھی کر لیتے ہیں۔ تین لوگ ٹانگیں موڑ کے اس میز پہ سو جاتے ہیں، جو ہم نے اسی مقصد کے لیے رکھی ہوئی ہے۔ میز کے نیچے بھی ہم نے بستر بچھایا ہوا ہے۔ باقی وہاں لیٹ جاتے ہیں۔ ہمارے پاس فوم بھی نہیں ہے۔ بس یہ تکیے ہیں اور دو تین چادریں ہیں۔ اسی سامان کو سوتے جاگتے استعمال کرتے ہیں۔ جیسا بھی ہے گزارہ مزارہ ہو جاتا ہے۔ بس ایک چیز مجھے بہت پریشان کرتی ہے۔ میرے کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں ہے۔ ویسے تو ہم آرام سے رہ ہی لیتے ہیں لیکن اگر ایک کھڑکی ہوتی تو کم از کم بچوں کو تازی ہوا مل جاتی، ادھر وہ بڑی مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔ میں اس وجہ سے بہت ڈرتا ہوں کہ بچوں کو یہاں رہتے رہتے کوئی بیماری نہ ہو جائے یا کسی رات وہ گھٹن کا شکار نہ ہو جائیں۔ پرانا پنکھا خراب ہو چکا ہے اور گرمیاں آنے پہ سب سے بڑا خرچہ میرے لیے ایک پنکھا خریدنا ہوگا۔ چار سو روپے دیہاڑی میں آپ کتنا پنکھے کے لیے کتنے پیسے بچا سکتے ہیں؟ لیکن خدا کا شکر ہے بھائی، میں بہت سے لوگوں کے مقابلے میں عزت سے رہتا ہوں۔ مجھے کسی اور سے

کچھ مانگنا نہیں پڑتا۔ میرے گھر میں اکثر صبح ناشتہ اور رات کو کھانا بھی نصیب ہو جاتا ہے۔ برابر والے بے چارے تو یہ بھی نہیں کر پاتے۔ میرے پاس یہ موبائل بھی ہے۔ فارغ وقت میں اس پہ ریڈیو سنتا رہتا ہوں، مجھے پتہ لگتا رہتا ہے کہ ملک میں کیا چل رہا ہے۔ اس علاقے میں دو وقت کی روٹی اور موبائل جسے مل جائے، وہ خوش نصیب سمجھا جاتا ہے۔

یہ نذیراں کا گھر ہے۔ اس کا باپ دس سال پہلے مر گیا تھا۔ ماں کے ساتھ وہ اس جگہ آئی تھی۔ وہ چار بہن بھائی تھے۔ یہ سب میرے کمرے سے آگے چوتھے کمرے میں رہتے ہیں۔ یہاں آنے کے بعد نذیراں کی ماں نے اس کی شادی ایک کوڑا چننے والے سے کر دی تھی۔ وہ بھی اسی کمرے میں آ کے رہنے لگ گیا تھا۔ شادی کے چند ماہ بعد ہی وہ بیمار پڑ گیا۔ وہ ہر وقت کھانستا رہتا تھا۔ جو دوائیں ہسپتال سے ملتی تھیں وہ ساری کھانے کے بعد بھی اس کی کھانسی نہیں جاتی تھی۔ وہ دوبارہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکا۔ لوگ اسے دور سے دیکھ کے ہی بھاگ جاتے تھے۔ سب جان چکے تھے کہ اسے ٹی بی ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ اس کمرے کی بجائے اسے کسی کھلی جگہ پہ رہنے دو تو شاید یہ بہتر ہو جائے۔ سامنے گلی کافی کھلی تھی۔ چوتھی صبح سردی لگنے سے وہ مر چکا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد لوگ نذیراں کو ملنے سے بھی گھبراتے تھے۔ ٹی بی ان کمروں کی سب سے بدنام بیماری ہے۔ وہ جن گھروں میں کام کرتی تھی آہستہ آہستہ اسے وہاں سے بھی نکال دیا گیا۔ باقی بہن بھائی جو کما کے لاتے تھے، اس میں جیسے تیسے نذیراں اور اس کے دو بچوں کا گزارہ چلتا رہا لیکن وہ غیر محسوس طریقے سے کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر کہتے تھے خوراک پہ دھیان دو، پھل فروٹ کھاؤ، ادھر مفت کا کھانا مل جائے بڑی بات ہوتی ہے، پھل فروٹ کدھر سے آتے۔ دو برس پہلے اسے بھی وہی مرض ہو گیا جس میں اس کا شوہر گیا تھا۔ اس کے بچے اب اسکول جانے کی عمر میں ہیں۔ حکومت کہتی ہے کہ بچوں کو اسکول بھیجو، وہ اسکول جائیں گے تو کوڑا کون چنے گا؟ وہ آج کل اپنے باپ والا کام سیکھ رہے ہیں۔ ان کے کمرے میں بھی دیواروں پہ اخبار ہی لگے ہوتے ہیں۔ یہ سجاوٹ ہمارے یہاں سب لوگ کرتے ہیں۔ اس سے سستا اور صاف ستھرا کام کوئی نہیں ہو سکتا۔

نذیراں کے بچوں کا ہاتھ دیوار پہ اوپر نہیں جا رہا تھا۔ وہ چند نئے اخبار لے کے آئے تھے اور انھیں پوری دیوار پہ چپکانا چاہتے تھے۔ گھر میں کوئی اور بڑا نہیں تھا تو وہ مجھے بلا کے لے آئے۔ میں بہت کاہلی سے اٹھا لیکن یہ سوچا کہ شاید کچھ اخبار بچ جائیں گے تو میں اپنے کمرے کے لیے اٹھا لاؤں گا۔ اس خیال سے میرے قدم تیز ہو گئے۔ آٹے سے تیار لئی میں لتھڑے ہوئے ہاتھ لے کے میں تقریباً سارا کام مکمل کر چکا تھا۔ نکلنے سے پہلے میں نے ایک آخری نظر ان دیواروں پہ ڈالی تو ایک تصویر نے مجھے چونکا دیا۔ وہ کسی شادی کی تصویر تھی اور ساتھ امریکی ڈالر کا نوٹ بنا ہوا تھا۔ میں تھوڑا قریب ہو کے دیوار پڑھنے لگا۔ اس میں لکھا تھا کہ میرے علاقے کے نزدیک ہی ایک جگہ ایسی بھی تھی جہاں بارات میں شریک لوگوں نے ڈالر، ریال اور موبائل فون دولہا دلہن پہ نچھاور کیے۔ مجھے اپنی شادی یاد آ گئی۔ اس کمرے میں جہاں اب میں رہتا ہوں، اس وقت بھی وہیں رہتا تھا۔ میرے بہن بھائیوں کو اس رات باہر گلی میں سونا پڑا تھا۔ ایک ڈالر کا نوٹ کیسا ہوتا ہے،

میں نے کبھی ہاتھ میں لے کر نہیں دیکھا۔ ریال میں جانتا ہوں کیسے ہوتے ہیں، وہ ایک مرتبہ سامنے والوں کے بیٹے نے مجھے دکھائے تھے۔ اسے پتہ نہیں کس نے دیے تھے۔

میں اپنے کمرے میں آ چکا ہوں۔ میں بہت شکر ادا کر رہا ہوں کہ قسمت نے یہ اخبار میری دیوار پہ نہیں چپکایا۔ میں نے جب سے وہ خبر پڑھی ہے، میرے دماغ میں ایک عجیب سی پریشانی آ گئی ہے۔ اگر وہ دیوار پہ میرے سامنے چپکی ہوتی تو میں شاید سو بھی نہ سکتا۔ میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر وہ سارے ڈالر اور ریال جو وہاں بارات میں پھینکے گئے، ان میں سے آدھے بھی مجھے اور نذیراں کو مل جاتے تو ہم لوگ آج کس حال میں ہوتے۔ میرے گھر میں گوشت پک جاتا، نذیراں کا شوہر شاید کچھ عرصے اور زندہ رہ جاتا، اس کے بچے پڑھ رہے ہوتے، میرے کمرے کی دیواروں پہ چونا ہوا ہوتا، ہم سب فوم کے گدے خرید لیتے، شاید میں کچھ پیسے بچا کے اپنا پنکھا بھی خرید لیتا۔ اگر یہ پیسے پھر بھی بچ جاتے تو میں کھڑکی کے بجائے چھت کی طرف کوئی روشن دان نکالنے پہ بھی غور کر سکتا تھا۔ لوگوں کے پاس اس سے بھی زیادہ پیسے واقعی ہوتے ہیں کہ وہ فوم خرید لیں، کھڑکی بنا لیں، چونا کروا لیں، گوشت پکا لیں، دوائیں خرید لیں، بچے پڑھا لیں اور پھر بھی پیسے بچ جائیں؟ ایسا کس طرح ہو سکتا ہے؟ کوئی اتنا زیادہ کیسے کما سکتا ہے؟ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو میں ان آدمیوں میں کیوں نہیں تھا؟ قسمت میری طرف آ کے ہی خراب کیوں ہو گئی؟

جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا، میں شکر ادا کر رہا ہوں کہ وہ اخبار میری دیوار پہ نہیں لگا ہوا، وہ ادھر نذیراں والے کمرے میں ہے اور اس کی طرف پڑھنا کوئی نہیں جانتا۔ وہ اخبار اگر مستقل یہاں ہوتا تو میں پتہ نہیں ناشکری میں کیا کیا بات کر جاتا۔ حافظ جی کہتے ہیں انسان کو اپنے حال پہ خوش رہنا چاہیے۔ دو وقت کا کھانا مل جائے اور گھر والی ساتھ ہو تو بس شکر کرو، ورنہ یہ سب بھی چھن سکتا ہے۔ میں اپنے حال پہ دوبارہ خوش ہونے جا رہا ہوں لیکن نذیراں کے کمرے سے وہ اخبار کل میں پھاڑ کے پھینک دوں گا۔ کیا خبر کوئی اور حرف جوڑنے والا ادھر آ پہنچا تو اس کی ناشکری کا گناہ بھی میرے سر ہو گا۔ توبہ توبہ۔ انسان بھی کس قدر ناشکرا ہے!

☆

جب بچے درختوں پر اُگا کرتے تھے

حسنین جمال

اس زمانے میں بچے درختوں پہ اُگا کرتے تھے۔ قبیلے کا سربراہ ڈھول والے کو حکم دیتا کہ چاند کی فلانی تاریخ سب لوگوں کے لیے مقدس ہے تو اعلان کرتے رہو، اس وقت تک کہ سب لوگ اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں اور بڑے میدان میں جمع ہونا نہ بھولیں۔ پھر جب وہ لوگ چاند کی بتائی گئی تاریخ پہ اکٹھے ہو جاتے تو انھیں الگ الگ ٹکڑیوں میں بانٹ دیا جاتا۔ ان میں تفریق صرف چہرے کے بالوں سے ہوتی تھی۔

جس کے چہرے پہ بال ہوتے وہ داہنی طرف کھڑا کر دیا جاتا اور جو بغیر بالوں کے چہرے ہوتے وہ بائیں طرف سرک جاتے۔ تب سربراہ اس قبیلے کا، ان کے بیچ آن کر بیٹھ جاتا اور دھیمی آواز میں اپنا جاپ شروع کر دیتا۔ اس کی آواز ایک مخصوص لَے میں اونچی ہونے لگتی۔ جب اونچی ہوتے ہوتے وہ آواز کانوں کو چیرتی محسوس ہوتی، بس عین اسی وقت دائیں اور بائیں طرف کی قطار سے ایک ایک ذی روح آگے بڑھتا اور ایک دوسرے کو چھوئے بغیر وہ دونوں اکٹھے کھڑے ہو جاتے۔ اس طرح دونوں قطاروں میں سے جب ساری عورتیں اور مرد نکل کر جوڑے بنا لیتے اور ایک قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے کھڑے ہو جاتے تو وہ سربراہ اپنے سُر مدھم کرتا جاتا، یہاں تک کہ اس کا جاپ مکمل ہو چکا ہوتا۔

اب وہ آگے بڑھتا اور پہلے جوڑے کے ہاتھ میں دو نازک سے پھول تھما دیتا۔ یہ دو پھول قطار کے پہلے جوڑے سے لے کے آخری جوڑے تک سفر کرتے۔ اس رسم کا اصول یہ تھا کہ دونوں پھول باری باری آگے والا جوڑا قطار میں موجود خود سے پیچھے والے جوڑے کو تھماتا جائے گا اور قطار کے آخری سرے تک یہ دونوں پھول صحیح سلامت، بغیر مڑے تڑے پہنچیں گے۔ اگر ہاتھ در ہاتھ کا یہ سفر کرتے ہوئے کسی پھول کی ایک پتی بھی ٹوٹ جاتی تو جس جوڑے کے ہاتھوں یہ سانحہ ہوا ہوتا وہ، اور اس کے پیچھے والے تمام جوڑے بدبخت قرار پاتے۔ وہ ایک سال کے لیے درختوں سے بچے توڑنے کے لیے نااہل قرار پاتے۔ وجہ اس کی یہ روایت ہے کہ جو کم نصیب جوڑا دو پھولوں کو نہیں سنبھال سکا وہ نازک سے ایک بچے کو کیسے سنبھالے گا۔ اور بدنصیبی کی یہ چھاؤں اس کے پیچھے موجود سارے جوڑوں پہ اپنا اثر کر چکی ہوتی۔

پھر یہ کیا جاتا کہ پھول بچا لے جانے والے تمام جوڑے الگ ہو جاتے۔ انھیں ازدواج قرار دیا جاتا اور سربراہ کی نیک دعاؤں کے ساتھ وہ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے۔ وہ الگ الگ کمروں میں رہا کرتے۔ دن بھر کھیتی باڑی کرنے کے بعد سورج ڈھلنے سے تھوڑا پہلے واپسی ان کے لیے لازم ہوتی اور اپنے علیحدہ کمروں میں بند ہو کے وہ سو جاتے۔ پھر چاند کی چودھویں تاریخ آتی تو انھیں حکم ہوتا کہ بچے والے درخت کے گرد سورج ڈھلنے کے بعد سب نے اکٹھے ہو جانا ہے۔ وہ سب بڑے شوق سے اس درخت کے آس پاس جمع ہو جاتے۔ تھوڑی دیر میں ان کا سربراہ بھی پہنچ جاتا۔ اس رات سربراہ کالے بھالو کی کھال میں آتا تھا۔ وہ اس کا تقریباتی لباس تھا۔ شام کی سیاہی گاڑھی ہوتے ہی سربراہ اونچی آواز میں اپنی مناجات شروع کر دیتا۔ اس بار تمام جوڑے تالیاں بجا بجا کے اس کا ساتھ دیتے۔

آدھی رات تک جب گا گا کر سب کے گلے دکھ جاتے اور تالیاں بجا بجا کے سب کے ہاتھ سرخ ہو چکے ہوتے تو پھر سربراہ بچوں والے درخت کے سامنے جا کھڑا ہوتا۔ وہ تمام جوڑوں کو حکم دیتا کہ ایک ایک کر کے اس کے نیچے سے گزرو۔ ایک بڑا سا گول دائرہ بنا کے باری باری وہ سب اس درخت کے نیچے سے ہو کے گزرتے جاتے۔ دائرہ درخت سے اتنا پرے ہوتا کہ ایک وقت میں ایک ہی جوڑا درخت کے نیچے سے گزر پاتا۔ وہ لوگ گھومتے رہتے گھومتے رہتے یہاں تک کہ درخت سے ایک پتا گرتا اور جس جوڑے کے سروں پہ وہ پتا آن گرتا، سربراہ چیخ کے اعلان کر دیتا کہ آج درخت سے جو بھی بچہ توڑا جائے گا وہ اس جوڑے کا ہوگا۔

تب سربراہ اس جوڑے کے کندھوں پہ چڑھ کے اس گھنے درخت کے اندر کہیں کھو جاتا۔ باقی سب جوڑے نیچے کھڑے ہاؤ ہو کر رہے ہوتے اور کچھ دیر بعد والدین بننے کا شرف حاصل کرنے والا خوش نصیب جوڑا ایک دوسرے سے دور کھڑا اپنی اپنی سوچوں میں گم ہوتا۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ضرور لیکن دور کہیں سوچ رہے ہوتے کہ آئندہ زندگی میں ہم نے کیا کرنا ہے۔ ایک آدھ گھنٹے بعد جب سربراہ درخت پہ سے نیچے اترتا تو اس کے ہاتھ میں ایک دو یا تین بچے ہوتے اور وہ سب کے سب اس قسمت والے جوڑے کے حوالے کر دیے جاتے۔ یوں ناچتے گاتے سب اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے۔

کیا خیال ہے؟ کہانی چلے گی ناں؟ نہ پیار ہے، نہ محبت ہے، نہ کہیں ساتھ رہنے کا ذکر آیا، نہ کوئی لَو افیئر ہوا، نہ سنسنی جگائی گئی، نہ دو دھڑکتے دلوں کا ذکر ہوا، نہ کیمرے نے دو اُڑتے ہوئے کبوتر دکھائے، نہ دھندلے شیشوں والا کوئی سین ہوا، کچھ بھی نہیں، سیدھے سبھاؤ شادی ہوگئی، بچے مالک نے درختوں سے اتار دیے، آگے وہ جوڑا جانے اور اس کا کام!

روز اخبار میں لَو میرج پہ قتل ہونے والے کسی جوڑے کی خبر لگتی ہے، روز میں سوچتا ہوں کہ ایسی لَو سٹوری کیسے لکھی جائے جس میں قابل گرفت کوئی چیز نہ ہو۔ اگر ہم اس کہانی کو سچ مان لیں تو ہمیں یقین ہو جائے کہ ہمارے بزرگوں کے زمانے میں بھی کوئی 'ریپروڈکٹیو سسٹم' نہیں ہوتا تھا۔ وہ بھی اسی طرح درختوں سے اتارے گئے اور پاک صاف محبت سے ان کے ظاہر و باطن معمور تھے۔ انھیں دنیاوی آلائشوں سے کوئی مطلب نہیں تھا اور یہ تمام مکروہات از قسم لَو میرج وغیرہ ابھی ہمارے زمانے میں شروع ہونے والے برے کام ہیں۔

پھر مجھے دنیا بھر کی اساطیر اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ کیا یونان، کیا ایران قدیم، کیا عرب، کیا ولندیزی، کیا ہندوستان ہر جگہ یہی معاملات چل رہے تھے۔ اس وقت بھی ایسے ہی پیار محبت کے اظہار کیے جاتے تھے، ایسی ہی بندشیں ہوتی تھیں، آخر کسی طرح دونوں پارٹیاں مل جاتی تھیں اور الگ ہوتیں تو پھر رج کے شاعری ہوا کرتی تھی جس میں طرح طرح کے لغو اشعار ہوتے تھے۔ تو کیا وہ لَو میرج دنیا میں پہلی بار ہوئی جس پہ غیرت میں آ کر باپ یا بھائی نے بیٹی بھون دی یا اس گھرانے میں غیرت کے اصول قتل کی شاہراہ سے ہو کے سند پاتے ہیں؟

پسند کی شادی پتھر کے زمانے میں بھی ہوتی تھی، آج بھی ہوتی ہے، کل بھی ہوگی۔ یہ فضولیات پڑھنے والا سینے پہ ہاتھ رکھے اور سچے دل سے بتائے کہ آج تک، کبھی بھی، زندگی میں بھلے ایک ہی دفعہ، کوئی چہرہ پسند نہیں آیا؟ یہ الگ بات کہ بات بنی نہ بنی، پسند آیا یا نہیں؟ فرض کیجیے بات بن جاتی تو شادی کرتے یا نہ کرتے؟ کون ہے جسے دعویٰ ہو کہ وہ اس لطیف جذبے سے خالی ہے؟ جب نہیں ہے تو یار تھوڑی انڈرسٹینڈنگ لاؤ۔ شادی تو کرنی ہے، بیٹی کی بہن کی، آج نہیں تو کل کرنی ہے۔ اتنی رکاوٹیں مت ڈالو کہ اسے خود سے بندوبست کرنا پڑے۔ اور پھر اگر ہو گیا تو یہ کون سا جذبہ ہے جو پتھر کے زمانے میں بھی نہیں تھا اور آج منہ زور طریقے سے ابھر آیا ہے کہ جس کی پیاس صرف انسانی خون سے بجھتی ہے؟ اگر یہ جذبہ جسم کی ملکیت سے وابستہ ہے تو کیا ضروری ہے جسے آپ چاہیں وہی اس کا مالک ہو؟ کیا جس کی روح اس کے اندر

موجود ہے، اسے رتی برابر بھی اختیار نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے یہ فیصلہ کر سکے؟ اور پھر بھی اگر یہی کرنا ہے تو بابا پیدا ہوتے ہی مار دو، پال پوس کے اتنا رسک کیوں لیتے ہو؟ ہاتھ کے ہاتھ فیصلہ کرو ورنہ یہ خبریں بیس پچیس برس بعد بھی آتی رہیں گی اور کروڑوں کی آبادی میں سے چند بد بخت اسی طرح بزدلوں کی جون میں درختوں کے پیچھے سے اپنا احتجاج ریکارڈ کرواتے رہیں گے۔

☆

تلوار نگلنے والا آدمی

حسنین جمال

میں اسے دروازے کے پیچھے سے چھپ کے دیکھا کرتا تھا۔ وہ بہت عجیب سا لگتا تھا۔ سر پہ بندھا ہوا بڑا سا کپڑا، لمبا قد، ڈھیلا ڈھالا بغیر کسی رنگ کا لباس، کانوں میں دو بالے، مٹی میں اٹے ہوئے دیسی چمڑے کے بھدے سے جوتے، کندھوں پہ لٹکتا کپڑے کا خوف ناک سا تھیلا اور اس کی لال سرخ دونوں آنکھیں۔ میں ٹھیک سے نہیں بتا سکتا کہ وہ تھیلا مجھے زیادہ پریشان کرتا تھا یا اس کی آنکھیں میرے لیے زیادہ خوف کا سبب تھیں۔ اس تھیلے میں سے کبھی بھی کچھ بھی نکل سکتا تھا۔ کرتب دکھاتے ہوئے وہ تھیلا اس کا اسسٹنٹ بن جاتا تھا۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا جب بھرے چوراہے میں کرتب دکھانے کے بعد وہ لوگوں سے انعام سمیٹ کے جانے لگا اور تھیلا بھول گیا تو وہ تھیلا اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اپنی زبان میں تھیلے سے کچھ کہا۔ شاید اس نے یہ کہا تھا کہ تمھیں یوں ہمارے راز کھولنے نہیں چاہئیں۔ ہوسکتا ہے یہ صرف میرا خیال ہو لیکن وہ تھیلے پہ ٹھیک ٹھاک غصے میں تھا۔ وہی نظریں تھیلے سے گھوم کر آئیں تو میں اس وقت سامنے کھڑا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھیں لال کی بجائے کسی اور ہی رنگ کی نظر آتی تھیں۔ کسی دیوانے کی آنکھیں، کسی ایسے شخص کی آنکھیں جو کسی وقت بھی کوئی نقصان کر سکتا تھا۔ ٹھیک سے کہوں تو اس کے بارے میں یہ میری پہلی اور آخری سوچ تھی۔ اس کے بعد وہ باہر گلی میں بھی کرتب دکھانے آتا تو میں دروازے کے سوراخوں میں سے اسے دیکھا کرتا تھا۔

وہ بہت سے کرتب دکھاتا تھا۔ چمکیلے رنگ کی دو گیندیں اس تھیلے میں سے نکالتا اور ہوا میں اڑا دیتا۔ چمکتی ہوئی وہ دونوں گیندیں اوپر جاتی رہتیں۔ بہت اوپر، مزید اوپر، اس سے بھی اوپر، پھر وہ ہم سب کی نظروں سے غائب ہو جاتیں۔ اتنی دیر میں اس کی نئی بازی تیار ہو جاتی۔ وہ اپنی آستین میں کاغذ کا ایک ٹکڑا موڑ توڑ کے رکھ لیتا۔ اس پہ ہاتھ پھیرتا ہوا اپنے منتر پڑھتا رہتا۔ تقریباً دو منٹ کے بعد وہ اپنی آستین جھٹکتا تو اس میں سے قوس قزح کے رنگوں والا ایک کبوتر نکلتا اور آسمان کی طرف اڑتا چلا جاتا۔ اس کے بعد اور بہت سے کرتب ہوتے۔ لوگ آہستہ آہستہ اس کے گرد اکٹھے ہوتے چلے جاتے۔ جو ایک مرتبہ آ جاتا اس کے لیے کہیں

اور جانا مشکل ہوا کرتا تھا۔ لوگ پیسے پھینکتے رہتے اور اس کے تماشے جاری رہتے۔ وہ بازی گر اپنے تھیلے میں اس قدر کرتب سمیٹے تھا کہ اگر مسلسل اسے اپنا کام کرنا پڑتا تو شاید ایک مہینہ بھی اس کے سارے کرتبوں کے لیے کم پڑتا۔ جب اسے لگتا کہ اس کے پاس ڈھیر سارے پیسے اکٹھے ہو گئے ہیں تو وہ اپنا تھیلا اٹھاتا اور نا معلوم وقت کے لیے غائب ہو جاتا۔ لیکن جانے سے پہلے وہ اپنا آخری کرتب ضرور کیا کرتا تھا۔ اس کا وہ کمال اتنا مشہور ہو چکا تھا کہ بچے اپنی ماؤں کو گھر جا کے بتاتے اور وہ چھتوں پہ کھڑے ہو کے اسے دیکھا کرتی تھیں۔ وہ اپنے تھیلے سے ایک لمبی سی تلوار نکالتا، قریب موجود کسی دیوار پہ چڑھتا اور تلوار اپنے حلق میں ڈال کر آہستہ آہستہ اندر اتار لیتا، اتنی کہ صرف اس کا دستہ باہر ہوا کرتا تھا۔

سارے تماشہ دیکھنے والے آس پاس کھڑے ہوتے۔ وہ تلوار حلق میں ڈالنے کے بعد نیچے دیکھے بغیر دیوار پہ چلنا شروع کر دیتا۔ مجھے اس لیے بھی اس سے خوف آتا تھا۔ جو آدمی پیسوں کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہو، اس سے ڈر لگنا شاید ایک فطری بات ہوگی۔ تو وہ دیوار پہ چلتا رہتا اور جب دیوار ختم ہوتی تو بغیر مڑے اسی دیوار پہ الٹے قدموں چلتا واپس آ جاتا۔ سب کے علم میں ہوتا کہ یہ اس کا آخری کرتب ہوگا۔ لوگ پیسے پھینک کر جانے لگ جاتے۔ وہ سر جھکائے سب چیزیں تھیلے میں ڈالتا رہتا اور سامان سمیٹ کے اٹھ کھڑا ہوتا۔ بہت مرتبہ میرا دل چاہا کہ میں اس سے اس تلوار والے کرتب کا راز پوچھوں لیکن ڈر کے مارے میں بہت کم اس کے سامنے آپاتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوتا کہ وہ اب بہت عرصے تک واپس نہیں آئے گا، شاید اس وقت تک کہ جب یہ سارے پیسے ختم نہ ہو جائیں وہ دوبارہ بستی کا رخ نہیں کرتا تھا۔

کچھ وقت گزر گیا۔ میں اتنا بڑا ہو گیا کہ بازار تک آ جا سکتا تھا۔ ایک دن مرمت کرنے والوں کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے اس کی ایک جھلک نظر آئی تو میں الٹے قدموں پلٹ آیا۔ اس کے ہاتھ میں وہی تلوار تھی جو وہ حلق میں ڈال کے نگل لیا کرتا تھا۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ اس نے تلوار کے لیے کوئی خاص چکنی شے خریدی، قیمت دی اور نکل کر بستی کی طرف جانے لگا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ جب وہ اس راستے پہ مڑا جہاں کسی دوسرے آدمی کے ملنے کا امکان بہت کم تھا تو میں اس کے برابر ہو کے چلنے لگ گیا۔

اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے خوف اور شرمندگی کے انداز میں ہلکا سا منھ کھولا اور ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ رکا، اس نے تلوار نکالی اور خود ہی بتانا شروع کر دیا۔ اس کے لفظوں کا مطلب یہ تھا کہ یہ تلوار ایسے پرزوں کی بنی ہوئی ہے جو ذرا سا دباؤ پڑنے پر اندر کی طرف دھنستے چلے جاتے ہیں۔ لیکن کل یہ تلوار خراب ہو گئی تھی۔ اس کے پاس وہ چکنی شے موجود نہیں تھی اور تلوار اس کے بغیر ٹھیک سے کام نہیں کرتی تھی۔ اس نے تلوار میری طرف بڑھا دی۔ میں نے دوسری ہتھیلی پر اس کی نوک رکھی اور دبایا تو غیر محسوس طریقے سے پوری تلوار کسی اسپرنگ کی طرح دبتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہی دستہ رہ گیا جو اس کے حلق کے باہر ہوتا تھا۔ وہ خالص دھات کی تلوار تھی لیکن ایسی کاریگری سے بنی تھی کہ غیر محسوس طریقے سے دبتی چلی جاتی تھی۔ وہ تلوار لے کے واپس چلا گیا۔

اس بار جب وہ آیا تو میں اسے دیکھنے چوک میں دوسرے لوگوں کے ساتھ موجود تھا۔ نئے اور

پرانے بہت سے کرتب وہ دکھاتا رہا۔لوگ ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے پیسے نکال نکال کر اس کے پاس پھینکتے جا رہے تھے۔ وہ خاموشی سے اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ جب تلوار والے کرتب کی باری آئی تو مجھے اپنا سارا جسم سرد محسوس ہوا۔ حالانکہ یہ منظر نیا نہیں تھا اور تلوار کا راز اب میں جان چکا تھا لیکن میں شدید بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ وہ دیوار پہ چڑھا، تلوار حلق کے اندر ڈالی، دبی ہوئی آواز میں چیخا اور دونوں ہاتھوں سے گلے کو پکڑنے کی کوشش میں دیوار سے زمین پر آن گرا۔

اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ تلوار زنگ کھا جائے تو کرتب بدل لینا چاہیے۔ وہ پیسے اکٹھے کرنے کے لیے خراب تلوار حلق میں ڈال بیٹھا تھا اور ایسی زنگ کھائی ہوئی تلوار حلق میں ڈالنے کا یہ انجام شاید اس کے گمان میں نہ ہوگا۔ مجھے اب یاد آتا ہے کہ جس وقت وہ تلوار اس نے میرے ہاتھ میں تھمائی تھی تو میں اس کے اندر دبنے والے حصوں کے درمیان زنگ دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اسے اشارہ بھی کیا تھا لیکن وہ میری بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بازی گر کو اپنی مہارت پہ یقین تھا۔ تلوار مگر بے جان اور کم عقل چیز تھی۔

ایسی کئی تلواریں داخلی اور خارجی راستوں پہ میرے آس پاس حلق میں داخل کی جاتی ہیں۔ میں ایک قصہ گو ہوں۔ اس واقعے کے بعد سے میں جب بھی زنگ دیکھتا ہوں تو فوراً کرتب کرنے والوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ انھیں ہر بار اپنی مہارت کا یقین ہوتا ہے۔ مجھے ہر مرتبہ اپنی بات نہ سنے جانے کا علم ہوتا ہے۔ ہر ایک مرتا نہیں ہے، کوئی بازی گر زخمی ہوتا ہے، کوئی آئندہ کے لیے بستی کے لوگوں میں بدنام ہو جاتا ہے، کسی کو لوگ پیسے دینے کم کر دیتے ہیں لیکن کوئی ایک بازی گر بھی اسے یاد کر کے سبق نہیں لیتا جو میرے سامنے دیوار سے گر کے مر گیا تھا۔ زنگ آلود تلواریں پھینکنے پہ کوئی تیار نہیں ہوتا۔ نئی تلواریں شاید اب بننا بند ہو گئیں، یا شاید نیا کرتب بھی کوئی باقی نہیں بچا۔ کل ملا کر مندا ہی مندا ہے۔

☆

تین درخت جن کے ارمان پورے ہوئے

حسنین جمال

ایک جنگل میں تین درخت ہوتے تھے۔ باقی درختوں کی نسبت وہ تھوڑے قریب قریب لگے ہوئے تھے۔ ان کی عمر ابھی کم تھی۔ وہ اپنے سے بڑے درختوں کو حیرت سے دیکھتے اور سوچتے رہتے کہ ایک دن آئے گا جب وہ بھی اتنے ہی بڑے اور عظیم الشان ہو جائیں گے۔ وہ کبھی کبھی آپس میں گپ شپ بھی لڑاتے رہتے۔ ایک دن سہ پہر کا وقت تھا۔ سردیاں ایسی ہی تھیں جیسی آج کل ہیں۔ تھوڑی بہت دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ سورج کو انجوائے کرتے ہوئے ایک درخت کہنے لگا کہ یار تم دونوں کی کیا خواہشیں ہیں، میں تو کچھ بھی نہیں چاہتا سوائے ایک جادوانی عمر کے، میں چاہتا ہوں کہ میں ہمیشہ اس زمین پہ موجود رہوں، سب

درختوں سے زیادہ سینئر ہو جاؤں، آندھی آئے، طوفان آئے، میں اپنی جگہ پہ کھڑا سب کچھ دیکھتا رہوں، اس کے علاوہ میں کچھ بھی نہیں چاہتا۔

دوسرا درخت بولا بھائی میرے ارمان تو بہت عجیب و غریب قسم کے ہیں۔ میرے بس میں ہو تو میں اس پورے ملک کا نگران بن جاؤں، اپنے ایک اشارے پہ سب کو روک دوں، دوسرا اشارہ کروں تو لوگوں کی زندگیوں میں رونق آ جائے، میں صرف اور صرف حکومت کرنا چاہتا ہوں، اس پورے جنگل پہ، یہاں کے سارے درختوں پہ بلکہ اس پورے ملک پہ، تو میں یہ سب کرنا چاہتا ہوں۔ تیسرا درخت منھ کھولے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش رہا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ شام ڈھلے باقی دونوں کو یاد آیا کہ اس نے تو کچھ کہا ہی نہیں، انھوں نے پھر سے پوچھا کہ ہاں میاں تمھارا کیا پروگرام ہے؟ کہنے لگا مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے یارو، میں تو بس جب تک ہوں تمھارے ساتھ ہوں، اگر تم دونوں اپنی اپنی خواہشیں پوری کر سکے تو تمھاری ہی کہانیاں بچوں کو سناتا رہوں گا، نہ بھی کچھ ہوا تو بس ٹھیک ہے، میں کیا، میرا ہونا کیا اور میری خواہشیں کیا۔ وہ تیسرا والا درخت تھوڑا ملنگ قسم کا تھا، یہ کہہ کر اس نے جمائی لی اور سو گیا۔

جس وقت وہ یہ باتیں کر رہے تھے، اس وقت ایک جن بھی وہیں بیٹھا تھا۔ شہروں میں تو موبائل وغیرہ جب سے آئے ہیں، کسی گھر میں جن شن نظر ہی نہیں آتے، شاید فوٹو کھنچنے کا خطرہ ہو لیکن جنگلوں میں درختوں پہ وہ اب بھی موجود ہوتے ہیں۔ تو اس جن نے تینوں درختوں کی بات سن لی۔ اس نے ایک بڑی عجیب قسم کی حرکت کی۔ مثل مشہور ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہوتا ہے۔ وہ بے چارہ نادان دوست تھا۔ اس نے جا کے اپنے پیر صاحب کو بتایا (جہاں وہ بطور موکل ڈیوٹی دیتا تھا) کہ سائیں ادھر جنگل میں وہ فلانی سائیڈ پہ تین درخت ہیں، وہ اس اس طرح اپنی خواہش کا اظہار کر رہے تھے، آپ دعا کیجیے کہ جو کچھ وہ درخت چاہتے ہیں، ویسا ہی سب کچھ ہو جائے۔ پیر صاحب نے اسے تو اوکے کی رپورٹ دے کر ایک اور مشن پہ کھٹمنڈو بھیج دیا اور ادھر جیب سے موبائل نکال کر مقامی ٹال والے کو فون لگا دیا کہ استاد جنگل میں فلانی جگہ پہ تین چھوٹے درخت ہیں، بڑے درختوں میں چھپے ہوں گے، انھیں کاٹ لو تو کسی پہریدار کی نظر بھی نہیں پڑے گی اور آسانی سے ٹرانسپورٹیشن بھی ہو جائے گی، میں فقیر آدمی ہوں، مجھے میرا جو بھی حصہ دو گے رکھ لوں گا، باقی تم جانو تمہارا کام۔

ٹال والے کی تو موج ہو گئی۔ دو تین لکڑہارے لیے، ایک ٹرک لیا اور پہنچ گیا بتائی ہوئی جگہ پر۔ درخت مزے سے کھڑے ہوئے تھے، انھوں نے لکڑہارے اور ان کی چمکتی ہوئی کلہاڑیاں دیکھیں تو ان کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ سوچنے لگے کہ یار ہم تو کیا کیا خواہشیں کر رہے تھے اور ادھر سب کا سب مٹی میں مل گیا۔ ابھی ہمیں کاٹ پیٹ کے یہ منحوس آدمی لے جائے گا اور کہیں بیچ باچ دے گا۔ وہ چیخیں مارتے ہوئے یہ سوچ ہی رہے تھے کہ دوسرے درخت کا تنا پانچ چھ ضربوں کے بعد نیچے پہنچ گیا۔ تیسرے کے ساتھ بھی یہی ہوا، فٹا فٹ اسے گرا کے لٹا دیا گیا۔ پہلا درخت کانپتا ہوا اکیلا کھڑا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ یار کہاں میں جادوانی عمر کی بات کرتا تھا اور کہاں۔ سوچنا ختم ہوا، پہلا درخت بھی زمین پہ تھا۔

فٹافٹ انھوں نے تینوں درختوں کو ٹرک پہ لادا اور شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔ چوری کا درخت جو ابھی تازہ تازہ کٹا ہو، اسے ٹال پہ رکھ کے مرنا تھوڑی تھا، تو بس اونے پونے بیچ کے واپس آ گئے اور پیر صاحب کو تھوڑا بہت نذرانہ پیش کر دیا۔ انھوں نے اسے دست غیب سے لنگر پانی کا خرچہ سمجھتے ہوئے قبول فرمایا اور اپنے روزمرہ کاموں کی طرف چلے گئے۔ ادھر وہ تینوں درخت بہت عرصہ اکٹھے پڑے رہے، پھر دو تین سال کی دھوپوں اور بارشوں کے بعد ان کا نمبر آیا اور انھیں ایک بڑھئی نے خرید لیا۔

پہلے والے کی تراش خراش ہوئی اور اسے ایک خوب صورت چوکھٹ میں بدل دیا گیا۔ اوقاف کا ایک افسر وہاں سے گزرا، وہ ایک مزار کی رینوویشن کروا رہا تھا، اسے وہ چوکھٹ پسند آ گئی۔ ہاتھ کے ہاتھ پیسے ادا کیے اور چوکھٹ مزار کے مرکزی دروازے کی جگہ گاڑ دی گئی۔ دوسرا درخت بڑھئی کے ایک دوست نے خرید لیا، وہ عصا بناتا تھا۔ اس درخت سے بہت سی مضبوط لاٹھیاں بنیں۔ ایک دن وہاں سے ایک مذہبی گروہ گزر رہا تھا، انھیں وہ سارے عصا بہت پسند آئے۔ پیکیج ڈیل ہوگئی۔ سب کی سب لاٹھیاں خرید لی گئیں اور ان کے حجروں میں پہنچ گئیں۔ تیسرے درخت کی لکڑی کمزور تھی۔ وہ پنسل بنانے والے ایک ادارے کو ردی کے بھاؤ بیچ دیا گیا۔ اس ادارے کی بنائی ہوئی پینسلیں اخبار والوں کے دفاتر میں ٹینڈر سپلائی کے لیے آ گئیں۔

تینوں درختوں نے جس وقت وہ باتیں کی تھیں، شاید قبولیت کی گھڑی تھی۔ پہلے درخت کی بات تو یوں سنی گئی کہ وہ مزار کی چوکھٹ بن گیا۔ مزار کبھی نہ ختم ہونے کے لیے بنتے ہیں۔ دلوں پہ ان کا راج ہوتا ہے۔ ہر ایک زائر آتے جاتے چوکھٹ کو چومتا ہے۔ زلزلہ بھی آ جائے تو عمارت کو بھلے نقصان پہنچے، چوکھٹیں اور سیڑھیاں اپنی جگہ جمی رہتی ہیں۔ تو وہ بھی جما ہوا ہے۔ جیسے اس نے چاہا تھا، آندھی آئے، طوفان آئے، وہ زمین پر موجود ہے، اپنی جگہ کھڑا اغرض مندوں کے تماشے دیکھتا رہتا ہے۔ دوسرے والے درخت کی خواہش بھی پوری ہوگئی۔ جس گروہ نے پیکیج ڈیل کی تھی، وہ ایک دن وہی لاٹھیاں اٹھائے کسی سڑک پہ پہنچ گئے۔ چند مطالبات پیش کیے اور حکومت سے ڈیمانڈ گزار ہوئے کہ انھیں قبول کرو ورنہ سڑک بلاک رہے گی۔ تو اب وہ لاٹھیاں ہلا ہلا کے تقریر کرتے ہیں اور تمام راستے بند رہتے ہیں اور مخلوق خدا چاہے مر بھی جائے، ہسپتال جانے کا راستہ نہیں ملتا۔

تو دوسرا درخت جو اپنے اشارے پہ سب کو روکنا چاہتا تھا، جنگل پہ حکومت کرنا چاہتا تھا، اس کی خواہش تو پوری ہوگئی لیکن پورے ملک کی واٹ لگ گئی۔ تیسرا درخت جو سب سے ٹھنڈا تھا، ملنگ قسم کا تھا، اس کی پینسلیں جب اخبار والوں نے خریدیں تو صحافیوں میں بانٹ دیں۔ آج کل وہ ان سب کی جیبوں میں پڑی ہوتی ہیں یا کانوں پہ ٹکی رہتی ہیں۔ گھڑی گھڑی پل پل اس سڑک پہ جو کچھ ہوتا ہے اس کی رپورٹ لکھ کے وہ لوگ بھیجتے رہتے ہیں اور چھپتی ہے تو پوری دنیا پڑھ لیتی ہے۔ یوں تیسرے درخت کے من کی مراد بھی پوری ہوئی جو اپنے دوست درختوں کی کہانیاں سب کو سنانا چاہتا تھا۔

جس طرح مالک نے ان سب کی مرادیں پوری کیں، سجنوں، بیلیوں، متروں، پیاروں سب کی مرادیں پوری کرے، اپنی تو بس یہی دعا ہے کہ کاش وہ پنسل اب کوئی اچھی خبر سنا دے!

عمیر نجمی کی غزلیں

عمیر نجمی کا تعلق پنجاب (پاکستان) سے ہے۔ نوجوان ہیں اور شاعری کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے، یہی کوئی تین چار سال سے غزلیں کہہ رہے ہیں، لیکن اس عرصے میں بھی انھوں نے بہت کم غزلیں کہی ہیں۔ گذشتہ دنوں فیس بک پر معروف شاعر عرفان ستار نے عمیر نجمی کی ایک غزل شیئر کی۔ عرفان ستار خود بہت اچھے شاعر ہیں، ان کی غزلیں ''اثبات'' میں بھی چھپتی رہی ہیں۔ میں فیس بک پر غزلوں کے کوڑے کرکٹ سے کترا کر اکثر گذر جاتا ہوں، متلی سی ہونے لگتی ہے۔ لیکن چونکہ ایک شعر فہم اور اچھے شاعر نے کسی اور کی غزل شیئر کی تھی، سو تھوڑی دیر کے لیے ان کی پوسٹ پر ٹھٹک گیا۔ غزل کا پہلا شعر ہی کمال کا تھا جس نے مجھ سے دوسرا شعر پڑھوالیا، پھر ہر شعر آئندہ شعر مجھ سے پڑھواتا چلا گیا۔ پوری غزل پڑھ کر ایک شاعر کی دوسری غزلیں پڑھنے کا اشتیاق ہوا، چونکہ میں جاننا چاہتا تھا کہ یہی اکلوتی غزل شاعر کا سرمایہ ہے یا اس کی تجوری میں اور بھی مال ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی شاعر کی کوئی غزل بہت اچھی نکلی، لیکن دوسری غزلوں کو دیکھ کر اپنی رائے بدلنی پڑ جاتی ہے۔ خیر، میں عمیر نجمی کی فیس بک ٹائم لائن پر گیا، سوچا وہاں شاید ان کی کچھ غزلوں سے ملاقات ہو جائے گی، لیکن نہیں ہوئی، البتہ کچھ متفرق اشعار ضرور ملے اور ان میں زیادہ تر اچھے اشعار تھے جنھوں نے اس شاعر کو مزید جاننے کی میری خواہش کو مہمیز کر دیا۔ عمیر نجمی کی ٹائم لائن پر مجھے ان کی 'فیس بک پیج' کا لنک نظر آیا، جسے کلک کرتے ہی میں ان کی کئی غزلوں کے روبرو تھا۔ پھر میں نے عمیر نجمی سے رابطہ کیا، ان سے اشاعت کی اجازت مانگی اور ان کے بارے میں تھوڑا بہت جاننا چاہا جس کا ان کی شاعری سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی اسے یہاں بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔

عمیر نجمی کو پڑھنے اور انھیں استقبال کرنے کا مناسب وقت یہی ہے چونکہ اس بدلے ہوئے لب و لہجے کی شاعری کے قاری بھی اب نئے ہیں۔ نئے وسائل، نئی لفظیات، نئے تجربات اور نئے مسائل سے بھری ہوئی اس شاعری کا انداز نئے پن کی کامیابی ہے اور غزل جیسی صنف میں جہاں خیال کو سانچے میں ڈھالنے کی آزادی بہت کم ہے، ایسی تازہ کاری مشکل ہی سے دیکھنے کو ملتی ہے۔ (مدیر)

اک دن زباں سکوت کی پوری بناؤں گا
میں گفتگو کو غیر ضروری بناؤں گا

تصویر میں بناؤں گا دونوں کے ہاتھ اور
دونوں میں ایک ہاتھ کی دوری بناؤں گا

مدت سمیت جملہ ضوابط ہوں طے شدہ
یعنی تعلقات عبوری بناؤں گا

تجھ کو خبر نہ ہوگی کہ میں آس پاس ہوں
اس بار حاضری کو حضوری بناؤں گا

رنگوں پہ اختیار اگر مل سکا کبھی
تیری سیاہ پتلیاں بھوری بناؤں گا

جاری ہے اپنی ذات پہ تحقیق آج کل
میں بھی خلا پہ ایک تھیوری بناؤں گا

میں چاہ کر وہ شکل مکمل نہ کر سکا
اس کو بھی لگ رہا تھا ادھوری بناؤں گا

ایک تاریخ مقرر پہ تو ہر ماہ ملے
جیسے دفتر میں کسی شخص کو تنخواہ ملے

رنگ اکھڑ جائے تو ظاہر ہو پلستر کی نمی
قہقہہ کھود کے دیکھو تو تمھیں آہ ملے

جمع تھے رات مرے گھر ترے ٹھکرائے ہوئے
ایک درگاہ پہ سب راندۂ درگاہ ملے

میں تو اک عام سپاہی تھا حفاظت کے لیے
شاہ زادی یہ ترا حق تھا تجھے شاہ ملے

ایک اداسی کے جزیرے پہ ہوں اشکوں میں گھرا
میں نکل جاؤں اگر خشک گذرگاہ ملے

اک ملاقات کے ٹلنے کی خبر ایسے لگی
جیسے مزدور کو ہڑتال کی افواہ ملے

گھر پہنچنے کی نہ جلدی نہ تمنا ہے کوئی
جس نے ملنا ہو مجھے آئے سر راہ ملے

دائیں بازو میں گڑا تیر نہیں کھینچ سکا
اس لیے خول سے شمشیر نہیں کھینچ سکا

شور اتنا تھا کہ آواز بھی ڈبے میں رہی
بھیڑ اتنی تھی کہ زنجیر نہیں کھینچ سکا

ہر نظر سے نظرانداز شدہ منظر ہوں
وہ مداری ہوں جو رہگیر نہیں کھینچ سکا

میں نے محنت سے ہتھیلی پہ لکیریں کھینچیں
وہ جنھیں کاتب تقدیر نہیں کھینچ سکا

میں نے تصویر کشی کر کے جواں کی اولاد
ان کے بچپن کی تصاویر نہیں کھینچ سکا

مجھ پہ اک ہجر مسلط ہے ہمیشہ کے لیے
ایسا جن ہے کہ کوئی پیر نہیں کھینچ سکا

تم پہ کیا خاک اثر ہوگا مرے شعروں کا
تم کو تو میر تقی میر نہیں کھینچ سکا

بس اک اسی پہ تو پوری طرح عیاں ہوں میں
وہ کہہ رہا ہے مجھے رائگاں تو ہاں ہوں میں

جسے دکھائی دوں میری طرف اشارہ کرے
مجھے دکھائی نہیں دے رہا کہاں ہوں میں

میں خود کو تجھ سے مٹاؤں گا احتیاط کے ساتھ
تو بس نشان لگا دے جہاں جہاں ہوں میں

کسی نے پوچھا کہ تم کون ہو تو بھول گیا
مجھے کسی نے بتایا تو تھا فلاں ہوں میں

ہر ایک شخص کو اپنی پڑی ہوئی ہے یہاں
مرا خیال ہے اپنوں کے درمیاں ہوں میں

کسی زبان کی چپ کے معانی جاننے ہیں؟
مجھے بتاؤ خموشی کی ترجماں ہوں میں

میں کس سے پوچھوں یہ رستہ درست ہے کہ غلط
جہاں سے کوئی گذرتا نہیں وہاں ہوں میں

ادھر اُدھر سے نمی کا رساؤ رہتا ہے
سڑک سے نیچے بنایا گیا مکاں ہوں میں

جبیں پہ ہجر کی تحریر درج کرنے
کسی پرانے قلم کی طرح رواں ہوں میں

چاہتا ہوں کہ نظر نور سے مانوس نہ ہو
روشنی ہو مگر اتنی ہو کہ محسوس نہ ہو

کیسے کھل پائے یہ رعشہ ہے کہ بھونچال اگر
کمرے کی چھت سے لٹکتا ہوا فانوس نہ ہو

زندگی لمبی تو ہو سکتی ہے بے انت نہیں
خودکشی کی بھی سہولت ہے تو مایوس نہ ہو

تو دعا کر کہ میں روتا رہوں صحرا نہ بنوں
خاک اور نم کا تناسب کبھی معکوس نہ ہو

جسم کا امن سبوتاژ کیے رکھتی ہے
روح دراصل سماوات کی جاسوس نہ ہو

کوئی آسیب بھی چھیڑے نہ مری تنہائی
ایسا گھر دیکھ جو خالی تو ہو منحوس نہ ہو

اب یہ زردی بھی بھگتنا تو پڑے گی کچھ دن
میں نہ کہتا تھا ہرے رنگ میں ملبوس نہ ہو

کھیل دونوں کا چلے تین کا دانہ نہ پڑے
سیڑھیاں آتی رہیں سانپ کا خانہ نہ پڑے

دیکھ معمار پرندے بھی رہیں گھر بھی بنے
نقشہ ایسا ہو کوئی پیڑ گرانا نہ پڑے

میرے ہونٹوں پہ کسی لمس کی خواہش ہے شاید
ایسا کچھ کر مجھے سگرٹ کو جلانا نہ پڑے

اس تعلق سے نکلنے کا کوئی راستہ دے
اس پہاڑی پہ بھی بارود لگانا نہ پڑے

نم کی ترسیل سے آنکھوں کی حرارت کم ہو
سردخانوں میں کوئی خواب پرانا نہ پڑے

ربط کی خیر ہے بس تیری انا بچ جائے
اس طرح جا کہ تجھے لوٹ کے آنا نہ پڑے

ہجر ایسا ہو کہ چہرے پہ نظر آ جائے
زخم ایسا ہو کہ دِکھ جائے دکھانا نہ پڑے

وہ دیکھتا ہے یہی سوچ کر نماز پڑھی
ہمیشہ عشق کے زیر اثر نماز پڑھی

میں زندگی کو مسلسل سفر سمجھتا ہوں
سو جب نماز پڑھی مختصر نماز پڑھی

سمے سے قبل جنوں کے بغیر عشق کیا
اذاں سنی نہ وضو تھا مگر نماز پڑھی

قریب تھی کوئی مسجد نہ پاس جائے نماز
بچھا کے سایہ سر رہ گذر نماز پڑھی

پھر اس سے جوڑ لیا ربط جس سے توڑا تھا
غلط پڑھی تھی سو بار دگر نماز پڑھی

سنا ہے پہلے یہاں آب دستیاب نہ تھا
پھر اک فقیر نے آ کر ادھر نماز پڑھی

نمازیوں کو رعایت ہے تیز بارش میں
سو جب بھی گریہ کیا میں نے گھر نماز پڑھی

ایک ایسی ذات بھی ہے جو کبھی نہیں سوتی
یہ سن کے سو نہ سکا رات بھر نماز پڑھی

تم کو وحشت تو سکھا دی ہے گذارے لائق
اور کوئی حکم؟ کوئی کام ہمارے لائق

معذرت میں تو کسی اور کے مصرف میں ہوں
ڈھونڈ دیتا ہوں مگر کوئی تمھارے لائق

ایک دو زخموں کی گہرائی اور آنکھوں کے کھنڈر
اور کچھ خاص نہیں مجھ میں نظارے لائق

گھونسلہ چھاؤں ہرا رنگ ثمر کچھ بھی نہیں
دیکھ مجھ جیسے شجر ہوتے ہیں آرے لائق

دو وجوہات پہ اس دل کی اسامی نہ ملی
ایک؛ درخواست گذارا تنے، دو؛ سارے لائق

اس علاقے میں اجالوں کی جگہ کوئی نہیں
صرف پرچم ہے یہاں چاند ستارے لائق

مجھ نکمے کو چنا اس نے ترس کھا کے عمیر
دیکھتے رہ گئے حسرت سے بچارے لائق

تجھے نہ آئیں گی مفلس کی مشکلات سمجھ
میں چھوٹے لوگوں کے گھر کا بڑا ہوں بات سمجھ

مرے علاوہ ہیں چھ لوگ منحصر مجھ پر
مری ہر ایک مصیبت کو ضرب سات سمجھ

فلک سے کٹ کے زمیں پر گری پتنگیں دیکھ
تو ہجر کاٹنے والوں کی نفسیات سمجھ

شروع دن سے اُدھیڑا گیا ہے میرا وجود
جو دِکھ رہا ہے اسے میری باقیات سمجھ

کتابِ عشق میں ہر آہ ایک آیت ہے
اور آنسوؤں کو حروف مقطعات سمجھ

کریں یہ کام تو کنبے کا دن گزرتا ہے
ہمارے ہاتھوں کو گھر کی گھڑی کے ہاتھ سمجھ

دل و دماغ ضروری ہیں زندگی کے لیے
یہ ہاتھ پاؤں اضافی سہولیات سمجھ

ہر اک ہزار میں بس پانچ سات ہیں ہم لوگ
نصابِ عشق پہ واجب زکوۃ ہیں ہم لوگ

دباؤ میں بھی جماعت کبھی نہیں بدلی
شروع دن سے محبت کے ساتھ ہیں ہم لوگ

جو سیکھنی ہو زبانِ سکوت بسم اللہ
خموشیوں کی مکمل لغات ہیں ہم لوگ

کہانیوں کے وہ کردار جو لکھے نہ گئے
خبر سے حذف شدہ واقعات ہیں ہم لوگ

یہ انتظار ہمیں دیکھ کر بنایا گیا
ظہور ہجر سے پہلے کی بات ہیں ہم لوگ

کسی کو راستہ دے دیں کسی کو پانی نہیں
کہیں پہ نیل کہیں پہ فرات ہیں ہم لوگ

ہمیں جلا کے کوئی شب گزار سکتا ہے
سڑک پہ بکھرے ہوئے کاغذات ہیں ہم لوگ

پردہ

یشپال

ہندی سے ترجمہ: اشعر نجمی

چودھری پیر بخش کے دادا محصولی کے محکمہ میں داروغہ تھے۔ آمدنی اچھی تھی۔ انھوں نے ایک چھوٹا مگر پکا مکان بھی بنالیا تھا۔ لڑکوں کو پوری تعلیم دی۔ دونوں لڑکے انٹرنس پاس کر کے ریلوے اور ڈاک خانے میں کلرک ہوگئے۔ چودھری صاحب کی زندگی میں لڑکوں کی شادی اور بال بچے بھی ہوئے، لیکن عہدے میں خاص ترقی نہ ہوئی؛ وہی تیس اور چالیس روپے ماہوار تنخواہ۔

اپنے زمانے کو یاد کر کے چودھری صاحب کہتے؛ ''وہ بھی کیا وقت تھا، لوگ مڈل اسکول پاس کر کے ڈپٹی کلکٹری کرتے تھے اور آج کل کی تعلیم کا حال یہ ہے کہ انٹرنس تک انگریزی پڑھ کر لڑکے تیس چالیس سے آگے بڑھ نہیں پاتے۔'' بیٹوں کو اعلیٰ عہدوں پر دیکھنے کا ارمان لیے ہوئے انھوں نے آنکھیں بند کرلیں۔

ماشااللہ، چودھری صاحب کے کنبے میں برکت ہوئی۔ چودھری فضل قربان ریلوے میں کام کرتے تھے۔ اللہ نے انھیں چار بیٹوں اور تین بیٹیوں سے نوازا۔ چودھری الٰہی بخش ڈاک خانے میں تھے، انھیں بھی اللہ نے چار بیٹے اور دو لڑکیاں بخشیں۔

چودھری خاندان اپنے مکان کو حویلی پکارتا تھا۔ نام بڑا دینے کے باوجود جگہ تنگ ہی رہی۔ داروغہ صاحب کے زمانے میں زنانہ حصہ اندر تھا اور باہر بیٹھک میں وہ مسند پر بیٹھے حقہ گڑگڑایا کرتے تھے۔ جگہ کی تنگی کے سبب ان کے گذر جانے کے بعد بیٹھک بھی زنانہ حصہ میں شامل ہوگئی اور گھر کی دیوڑھی پر پردہ ڈال دیا گیا۔ بیٹھک نہ رہنے پر بھی گھر کی عزت کا احساس تھا، سو پردہ ٹاٹ کا نہیں، اچھے قسم کا ہوتا تھا۔

ظاہر ہے، دونوں بھائیوں کے بال بچے ایک ہی مکان میں رہنے کے باوجود الگ الگ تھے۔ دیوڑھی کا پردہ کون سا بھائی لائے؟ اس مسئلہ کا حل اس طرح نکلا کہ داروغہ صاحب کے زمانے کے پلنگ کی رنگین دریاں یکے بعد دیگرے دیوڑھی میں لٹکائی جانے لگیں۔

تیسری نسل کی شادیاں شروع ہوگئیں۔ آخر چودھری گھرانے کی اولاد کو حویلی چھوڑ کر دوسری جگہیں تلاش کرنی پڑیں۔ چودھری الٰہی بخش کے بڑے صاجزادے نے انٹرنس پاس کر کے ڈاک خانے میں بیس روپے کی کلرکی حاصل کر لی۔ دوسرے صاحب زادے مڈل پاس کر کے اسپتال میں کمپاؤنڈر بن گئے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا جا رہا تھا، تعلیم اور نوکری دونوں مشکل ہوتی جا رہی تھیں۔ تیسرے بیٹے ہونہار تھے، انھوں نے وظیفہ پایا۔ جیسے تیسے مڈل کر کے اسکول میں مدرس ہو کر دیہات چلے گئے۔

چوتھے لڑکے پیر بخش پرائمری سے آگے نہ بڑھ سکے۔ آج کل کی تعلیم ماں باپ پر خرچ کے بوجھ کے سوا اور کیا ہے؟ اسکول کی فیس ہر مہینے، اور کتابوں کاپیوں اور نقشوں کے روپے علیحدہ سے۔

چودھری پیر بخش کی بھی شادی ہوگئی، مولا کے کرم سے بیوی کی گود بھی جلد ہی بھر گئی۔ پیر بخش نے روزگار کے طور پر خاندان کی عزت کے خیال سے ایک تیل کے مِل میں منشی گری کر لی۔ تعلیم زیادہ نہیں تو نہ سہی، سفید پوش خاندان کی عزت کا پاس تو تھا۔ مزدوری اور دستکاری ان کے کرنے کی چیزیں نہ تھیں۔ تخت پر بیٹھتے تھے، قلم دوات کا کام تھا۔

بارہ روپے ماہانہ زیادہ نہیں ہوتا۔ چودھری پیر بخش کو مکان 'ستوا' کی کچی بستی میں لینا پڑا۔ مکان کا کرایہ دو روپے تھا۔ آس پاس غریب اور کمینے لوگوں کی بستی تھی۔ کچی گلی کے بیچوں بیچ، اگلے سرے پر لگے کمیٹی کے نلکے سے ٹپکتے پانی کی کالی دھار بہتی رہتی، جس کے کنارے گھاس اُگ آئی تھی۔ نالی پر مچھروں اور مکھیوں کے بادل چھائے رہتے۔ سامنے رمضانی دھوبی کی بھٹی تھی، جس سے دھواں اور سوڈے میں لت پت ابلتے کپڑوں کی مہک اڑتی رہتی۔ دائیں طرف بیکانیری موچیوں کے گھر تھے۔ بائیں جانب ورک شاپ میں کام کرنے والے رہتے تھے۔

اس ساری بستی میں چودھری پیر بخش ہی پڑھے لکھے سفید پوش تھے۔ صرف ان ہی کے گھر کی دیوڑھی پہ پردہ تھا۔ سب لوگ انھیں چودھری صاحب، منشی جی کہہ کر سلام کرتے۔ ان کے گھر کی عورتوں کو کبھی کسی نے گلی میں نہیں دیکھا۔ لڑکیاں چار پانچ برس تک کسی کام کاج سے باہر نکلتیں اور پھر گھر کی آبرو کی رو سے گھر کی چار دیواری میں سمٹ جاتی تھیں۔ پیر بخش خود ہی مسکراتے ہوئے صبح شام کمیٹی کے نلکے سے پانی کے گھڑے بھر لاتے تھے۔

چودھری کی تنخواہ پندرہ برس میں بارہ سے اٹھارہ ہوگئی۔ خدا کی برکت ہوتی ہے تو روپے پیسے کی شکل میں نہیں، آل اولاد کی صورت میں ہوتی ہے۔ پندرہ برس میں پانچ بچے ہوئے۔ پہلے تین لڑکیاں اور بعد میں دو لڑکے۔

دوسری لڑکی ہونے کو تھی تو پیر بخش کی والدہ مدد کے لیے آئیں۔ والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ دوسرے بیٹوں کو والدہ کی فکر تھی نہیں، سو وہ چھوٹے لڑکے کے پاس ہی رہنے لگیں۔

جہاں بال بچے اور گھر بار ہوتے ہیں، وہاں سو قسم کی الجھنیں بھی ہوتی ہیں؛ کبھی بچے کو تکلیف ہے تو کبھی زچہ کو۔ ایسے وقت میں قرض کی ضرورت بھلا کیسے نہ ہو؟ گھر بار ہو تو ظاہر ہے قرض بھی ہوگا۔

مِل کی نوکری کا اصول پکا ہوتا ہے۔ ہر مہینے کی سات تاریخ کو گن کر تنخواہ مل جاتی ہے۔ پیشگی سے مالک کو چڑھ ہے۔ کبھی شدید ضرورت پر ہی مہربانی کرتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر چودھری گھر کی کوئی چھوٹی موٹی چیز گروی رکھ کر ادھار لے آتے۔ گروی رکھنے سے روپے کے بارہ آنے ہی ملتے۔ سود ملا کر سولہ آنے ہو جاتے اور پھر چیز کے گھر لوٹ آنے کا امکان ختم ہو جاتا۔

محلے میں چودھری پیر بخش کی عزت تھی۔ عزت کی بنیاد تھی، گھر کے دروازے پر لٹکتا ہوا پردہ۔ اندر جو بھی جیسا ہو، پردہ سلامت رہتا۔ کبھی بچوں کی کھینچ تان یا ظالم ہواؤں کے جھونکوں سے اس میں چھید ہو جاتے تو پردے کی آڑ سے ہی ہاتھ سوئی دھاگا لے کر اس کی مرمت کر دیتے۔

دنوں کا کھیل جاری رہا۔ مکان کی دیوڑھی کے کواڑ گلتے گلتے بالکل گل گئے۔ کئی دفعہ کی مرمت سے اس کی چوڑیاں ٹوٹ گئی تھیں اور سوراخ ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ مکان مالک سورج پانڈے کو اس کی فکر نہ تھی۔ چودھری کبھی جا کر کچھ کہتے سنتے تو جواب ملتا؛ ''کون سی بڑی رقم تھماتے ہو؟ دو روپلی کرایہ اور وہ بھی چھ چھ مہینے کا بقایا۔ جانتے ہو لکڑی کا بھاؤ کیا ہے؟ نہ ہو تو مکان چھوڑ جاؤ۔'' بالآخر کواڑ گر گئے۔ رات میں چودھری انھیں جیسے تیسے چوکھٹ سے ٹکا دیتے۔ رات بھر دہشت رہتی کہ کہیں کوئی چور نہ آ جائے۔ حالاں کہ محلے میں سفید پوشی اور عزت ہونے کے باوجود چور کے لیے گھر پر کچھ نہ تھا۔ شاید ایک بھی ڈھنگ کا کپڑا یا برتن لے جانے کے لیے چور کو نہ ملتا، مگر چور تو چور ہے۔ لُٹ جانے کے لیے کچھ نہ ہو، پھر بھی چور کا ڈر تو ہوتا ہی ہے؛ وہ چور جو ٹھہرا۔

چوری سے زیادہ فکر آبرو کی تھی۔ کواڑ نہ رہنے پر پردہ ہی آبرو کا پہریدار تھا۔ وہ پردہ بھی تار تار ہوتے ہوتے ایک رات طوفان میں پہریداری کے لائق نہ بچا۔ دوسرے دن گھر کی اکلوتی پشتینی چیز دری دروازے پر لٹک گئی۔ محلے والوں نے دیکھا اور چودھری کو مشورہ دیا، ''ارے چودھری، اس زمانے میں دری یوں کاہے خراب کروگے؟ بازار سے ٹاٹ کا ٹکرا لا کر لٹکا دو۔'' پیر بخش ٹاٹ کی قیمت بھی آتے جاتے کئی بار پوچھ چکے تھے۔ دو گز ٹاٹ آٹھ آنے سے کم میں نہ مل سکتا تھا۔ ہنس کر بولے، ''ہونے دو، کیا ہے؟ ہمارے یہاں پکی حویلی میں بھی دیوڑھی پر دری کا ہی پردہ ہوتا تھا۔''

کپڑے کی مہنگائی کے اس زمانے میں گھر کی پانچ عورتوں کے جسم سے بوسیدہ کپڑے یوں گر رہے تھے جیسے پیڑ اپنی چھال بدلتے ہیں، مگر چودھری صاحب کی آمدنی سے دن میں ایک بار کسی طرح پیٹ بھرنے کے لیے آٹا کے علاوہ کپڑے کی گنجائش کہاں؟ خود انھیں نوکری پر جانا ہوتا، پاجامہ میں پیوند سنبھالنے کی سکت نہ رہی، مارکین کا ایک کرتا پاجامہ ضروری ہو گیا تھا، مگر لاچار تھے۔

گروی رکھنے کے لیے گھر میں جب کچھ بھی نہ ہو، پنجابی خان غریب کا اکلوتا مددگار ہے۔ رہنے کی جگہ دیکھ کر وہ روپے ادھار دے سکتا ہے۔ دس ماہ پہلے گود کے لڑکے برکت کی پیدائش کے وقت پیر بخش کو روپے کی ضرورت آن پڑی۔ کہیں اور سے انتظام نہ ہو پانے کے سبب انھوں نے ببر علی خاں عرف پنجابی خان سے چار روپے ادھار لے لیے تھے۔

ببر علی خاں کا کاروبار 'ستوا' کے اس کچے محلے میں اچھا خاصا چلتا تھا۔ بیکانیری موچی، ورک شاپ

کے مزدور اور کبھی کبھی رمضانی دھوبی سبھی ببر میاں سے قرض لیتے رہتے۔ کئی مرتبہ چودھری پیر بخش نے ببر علی کو قرض اور سود کی قسط نہ ملنے پر اپنے ہاتھ کے ڈنڈے سے قرض داروں کا دروازہ پیٹتے دیکھا تھا۔ انھیں خان اور ایک قرض دار کے درمیان بیچ بچاؤ بھی کرنا پڑا تھا۔

وہ خان کو شیطان سمجھتے تھے، لیکن مجبوراً اسی کی پناہ لینی پڑی۔ چار آنہ روپے ماہوار پر چار روپے قرض لیا۔ شریف خاندانی مسلمان بھائی کا خیال کر کے ببر علی نے ایک روپے ماہوار کی قسط منظور کر لی۔ آٹھ مہینے میں قرض ادا ہونا طے پایا۔

خان کی قسط نہ دے پانے کی حالت میں اپنے گھر کے دروازے پر فضیحت ہو جانے کا تصور کر کے چودھری کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ سات ماہ فاقہ کر کے بھی وہ کسی طرح قسط دیتے چلے گئے، لیکن ساون میں برسات نے دھوکا دے دیا اور باجرا بھی روپے کے تین سیر ملنے لگا، قسط ادا کرنا ممکن نہ رہا۔ خان سات تاریخ کی شام کو ہی آ گیا۔ چودھری پیر بخش نے خان کی داڑھی چھوئی اور اللہ کی قسم کھا کر ایک ماہ کے لیے معذرت طلب کر لی۔ اگلے ماہ ایک کا سوا دینے کا وعدہ کیا۔ خان ٹل گیا۔

بھادوں میں حالت اور خراب ہو گئی۔ بچوں کی ماں کی طبیعت روز بہ روز گرتی جا رہی تھی۔ کھایا پیا اس کے پیٹ میں نہ ٹھہرتا۔ غذا کے لیے اسے گیہوں کی روٹی دینا ضروری ہو گیا۔ گیہوں مشکل سے روپے کے صرف ڈھائی سیر ملتا۔ مریض کا دل ٹھہرا، کبھی پیاز کے ٹکڑے یا دھنیا کی خوشبو کے لیے مچل جاتا۔ سونف، اجوائن، کالے نمک کی ضرورت ہو تو کم پیسوں میں ملتی نہیں۔ بازار میں تانبے کا نام ہی نہ بچا۔ ناحق اِکنی نکل جاتی ہے۔ چودھری کو دو روپے مہنگائی بونس کے ملے، مگر پیشگی لیتے لیتے تنخواہ کے روز چار ہی روپے حساب میں نکلے۔

گزشتہ ہفتے سے بچے بھوکے تھے۔ چودھری کبھی گلی سے دو پیسے کی 'چورائی' خرید لاتے، کبھی باجرا اُبال کر سب لوگ کٹورا بھر بھر کر پی لیتے۔ بڑی مشکل سے حاصل ہوئے چار روپے میں سے سوا روپیہ خان کے ہاتھ پر دھرنے کی ہمت چودھری کو نہ ہوئی۔

مِل سے گھر لوٹتے وقت وہ بازار کی جانب نکل گئے۔ دو گھنٹہ بعد جب انھوں نے اندازہ لگا لیا کہ خان ٹل گیا ہوگا تو اناج کی گٹھری لے کر وہ گھر پہنچے۔ خان کے ڈر سے دل بیٹھا جا رہا تھا، مگر چار بھوکے بچوں، ان کی ماں، دودھ نہ اتر پانے کے سبب سوکھ کر کانٹا ہو رہے گود کے بچے اور چلنے پھرنے سے لاچار اپنی ضعیف ماں کی بھوک سے بلبلاتی صورتیں آنکھوں کے سامنے ناچ جاتیں۔ دھڑکتے دل سے وہ کہتے جاتے، ''اللہ سب دیکھتا ہے، خیر کرے گا۔''

سات تاریخ کی شام کو ناکام ہو کر خان آٹھ کو صبح سویرے چودھری کے مِل جانے سے پہلے ہی ڈنڈا ہاتھ میں لیے دروازے پر دھمک آیا۔

رات بھر سوچ سوچ کر چودھری نے خان کے لیے معذرت نامہ تیار کیا تھا۔ مِل کے مالک لال جی چار روز کے لیے باہر گئے ہیں، ان کے دستخط کے بغیر کسی کو بھی تنخواہ نہیں مل پائی۔ تنخواہ ملتے ہی وہ سو روپے

حاضر کر دیں گے۔ معقول وجہ بتانے پر بھی خان کافی دیر تک غراتا رہا، ''ام وطن چوڑ کے پردیس میں پڑا ہے۔ ایسے روپیہ دینے کے واسطے ام یہاں نہیں آیا ہے، امارا ابھی بال بچہ ہے۔ چار روز میں روپیہ نئیں دے گا تو اب تمارا ..... کر دے گا۔''

پانچویں دن روپیہ کہاں سے آ جاتا! تنخواہ ملے ہوئے ابھی ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا۔ مالک نے پیشگی دینے سے صاف انکار کر دیا۔ چھٹے دن قسمت سے اتوار تھا۔ مِل میں چھٹی رہنے کے باوجود بھی چودھری، خان کے ڈر سے صبح ہی باہر نکل گئے۔ جان پہچان کے کئی آدمیوں کے ہاں گئے۔ ادھر اُدھر کی گفتگو کر کے کہتے، ''ارے بھائی، اگر ہو تو بیس آنے ایک دو روز کے لیے دینا۔ ایسے ہی ضرورت آن پڑی ہے۔''

جواب ملتا، ''میاں، پیسے کہاں اس زمانے میں۔ پیسے کا مول کوڑی نہیں رہ گیا۔ ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی ادھار میں اٹھ گیا سارا۔''

دوپہر ہو گئی۔ خان آیا بھی ہوگا تو اس وقت تک بیٹھا نہیں رہے گا، چودھری نے سوچا اور گھر کی جانب چل دیے۔ گھر پہنچے پر پتہ چلا خان آیا تھا اور گھنٹے بھر تک دیوڑھی پر لٹکے دری کے پردے کو ڈنڈے سے کچوکتے ہوئے گالی دیتا رہا ہے۔ پردے کی اوٹ سے بڑی بی بی نے خدا اور رسول کی قسم کھا کھا کر اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ چودھری باہر گئے ہیں، روپے ہی لینے گئے ہیں۔ خان گالی دے کر کہتا ہے، ''نئیں، بدذات چور اندر چھپ کے بیٹھا ہے۔ ام چار گھنٹے میں پھر آتا ہے۔ روپیہ لے کر جائے گا۔ روپیہ نئیں دے گا تو اس کا کھال اتار کر بازار میں بیچ دے گا۔ ہمارا روپیہ کیا ارام (حرام) کا ہے؟''

چار گھنٹے سے قبل ہی خان کی پکار سنائی دی، ''چودری!'' پیر بخش کے جسم پر جیسے فالج مار گیا، وہ بالکل اپنی جگہ منجمد سے ہو گئے، ہاتھ پاؤں سُن اور گلا خشک۔

گالی دے کر خان دوبارہ پردے کو ٹھیلتے ہوئے آواز لگانے لگا تو چودھری کا بے جان جسم زیادہ دیر تک بے حس و حرکت نہ رہ پایا۔ وہ اٹھ کر باہر آ گئے۔ خان آگ ببولا ہو رہا تھا، ''پیسہ نئیں دینے کا واسطے چھپتا ہے۔'' ایک سے ایک بڑھ کر تین گالیاں ایک ساتھ خان کے منھ سے پیر بخش کے گھرانے اور آبا و اجداد کے نام پر نکل گئیں۔ اس بھیانک حملے سے پیر بخش کا خاندانی خون بھڑک اٹھنے کی بجائے مزید خشک ہو گیا۔ خان کے گھٹنے کو چھو کر اپنی مصیبت بتا کر معافی تلافی اور خوشامد کرنے لگے۔

خان کی زور آزمائی میں اضافہ ہو گیا۔ اس کی بلند آواز سے پڑوس کے موچی اور مزدور چودھری کے دروازے کے سامنے اکٹھے ہو گئے۔ خان غصے میں ڈنڈا پھٹکار کر کہہ رہا تھا، ''پیسہ نئیں دینا تھا تو لیا کیوں؟ تنخواہ کدھر جاتا ہے؟ ارامی (حرامی) امارا پیسہ مارے گا۔ ام تمارا کھال کھینچ لے گا۔ پیسہ نئیں ہے تو گھر پر پردہ لٹکا کر شریف زادہ کیسے بنتا؟ تم ام کو بیوی کا زیور دو، برتن دو، کچھ بھی دو، ام ایسے نئیں جائے گا۔''

بے بسی اور لاچاری میں دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ سے خان کے لیے دعا مانگ کر پیر بخش نے قسم کھائی، ایک پیسہ گھر میں نہیں، برتن نہیں، کپڑا نہیں، خان چاہے تو بے شک اس کی کھال اتار کر بیچ دے۔

خان مزید بھڑک اٹھا، ''ام تمارا دعا کیا کرے گا؟ تمارا کھال کیا کرے گا؟ اس کا تو جوتا بھی نئیں

بنے گا۔ تمارا کھال سے تو یہ ٹاٹ اچھا۔'' خان نے ڈیوڑھی پر جھولتا ہوا دری کا پردہ کھینچ لیا۔ ڈیوڑھی کا پردہ ہٹتے ہی، جیسے چودھری کی زندگی کی ڈور ٹوٹ گئی۔ وہ ڈگمگا کر زمین پر گر پڑے۔

اس منظر کو دیکھ پانے کا حوصلہ چودھری میں نہ تھا، مگر دروازے پر کھڑی بھیڑ نے دیکھا، گھر کی لڑکیاں اور عورتیں پردے کی دوسری طرف اس افتاد کی دہشت سے آنگن کے بیچوں بیچ اکٹھی کھڑی کانپ رہی تھیں۔ یکا یک پردہ ہٹنے سے عورتیں ایسے سکڑ گئیں جیسے ان کے جسم سے کپڑے کھینچ لیے گئے ہوں۔ وہ پردہ ہی تو گھر بھر کی عورتوں کے جسم کا لباس تھا۔ ان کے جسم پر لٹکتے چیتھڑے ان کے ایک تہائی جسم کو ڈھانپنے کے قابل بھی نہ تھے۔

بے حس بھیڑ نے نفرت اور شرم سے آنکھیں پھیر لیں۔ اس برہنگی کی جھلک سے خان کی سختی بھی موم ہوگئی۔ اس نے شرمندگی کے لعاب اور پردے کو آنگن میں واپس پھینک کر غصہ آمیز مایوسی میں ''لاحول ولا'' پڑھا اور ناکام لوٹ گیا۔

خوف سے چیختی اور اوٹ میں چھپنے کے لیے بھاگتی ہوئی عورتوں پر ترس کھا کر بھیڑ بکھر گئی۔ چودھری بے حس و حرکت پڑے تھے۔ جب انھیں ہوش آیا، ڈیوڑھی کا پردہ آنگن میں سامنے پڑا تھا؛ لیکن اسے اٹھا کر پھر سے لٹکانے کی طاقت ان میں نہیں بچی تھی۔ شاید اب اس کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ پردہ جس احساس کا آسرا تھا، وہ مر چکا تھا۔

تنقید نگاری سے توبہ

محمد خالد اختر

مجھے کتابوں پر ریویو لکھنے میں ملکہ حاصل ہے، اور میں انھیں پڑھے بغیر ہی ریویو لکھ سکتا ہوں۔ یہ خدا کی دین ہے۔ جس طرح بعض لوگ شاعر یا پیدائشی مختصر افسانہ نویس ہوتے ہیں۔ غالبًا میں ایک پیدائشی تبصرہ نگار ہوں۔

پچھلے دو تین سال کے عرصہ میں، میں نے ادیب سازی کے سلسلہ میں جو کام کیا ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہ ہوگا۔ میرا ریویو کرنے کا طریقہ یہ ہے۔

'خیال نو' کا ایڈیٹر جو میرا دوست ہے، مجھے کتابیں ریویو کرانے کے لیے بھیجتا ہے۔ میں ان کو ادھر ادھر سے الٹ کر کسی صفحہ کو کھول کر دو تین سطریں پڑھتا ہوں۔ مثلاً:

اس نے کہا۔ 'چائے کی پیالی پیو!'

بھورے خاں نے کہا۔ 'شکریہ میں ابھی ابھی لیمن پی کر آیا ہوں۔'

اور پھر کتاب کو بند کر کے اس پر تین چار صفحے کا ریویو گھسیٹ دیتا ہوں۔ اگر کتاب ذرا اہم ہوئی تو میں اسے اپنے بھانجے کو (جو آٹھویں جماعت میں تعلیم پا رہا ہے) پڑھنے کے لیے دے دیتا ہوں، اور رات کو سوتے وقت اس سے کہتا ہوں کہ مجھے اس کا پلاٹ سنائے۔ اگر اس کے پلے کچھ نہ پڑا تو سمجھ لیتا ہوں کہ کتاب فی الواقعی ہائی برو ہے اور اپنے ریویو میں اسے وقیع اور عالمانہ بتاتا ہوں۔ اب تک یہ طریقہ بہت کامیاب رہا تھا۔ کتنا کامیاب، یہ آپ کو اس شہرت سے اندازہ ہو سکتا ہے، جو اس سلسلے میں مجھے حاصل ہے۔ خود میرے ریویوں پر ریویو لکھے جا چکے ہیں اور مجھے ادب کا ہونہار ترین نوجوان نقاد تسلیم کیا جا چکا ہے۔ 'خیال نو' جو اس وقت اردو ادب کی آواز ہے، اپنے ہر شمارے میں میری تصویر کے نیچے یہ چھاپتا ہے 'مسٹر شداد پشمی': اردو کے ہونہار ترین نوجوان نقاد، وغیرہ وغیرہ۔

لیکن چند دنوں سے اسی تنقید نگاری کی بدولت میں ایک عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ریویوئنگ اتنی پرخطر بھی ہو سکتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ سب گلابوں کی سیج ہے، اب اس کے

خطرات مجھ پر کھلے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مصیبت کی وجہ سے حالات اس قدر نازک صورت اختیار کر چکے ہیں کہ کتابیں ریویو کرنا تو رہا ایک طرف، میں نے گھر سے باہر نکلنا بھی ترک کر دیا ہے اور اب کراچی چھوڑ کر کسی اور جگہ کوچ کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ وہ جگہ ہے ناجہاں، وہ کیا مصرعہ ہے؛ 'ہم زباں کوئی نہ ہو .... اور میز باں کوئی نہ ہو' وغیرہ وغیرہ۔ ٹھیک اسی جگہ میں جانا چاہتا ہوں۔ صرف وہ جگہ اب مجھے راس آسکتی ہے۔ کیا کوئی صاحب مجھے اس کا اتا پتہ بتلا سکتے ہیں کہ وہ کہاں ہے؟

مصیبت کا آغاز یوں ہوا کہ 'خیال نو' کے ایڈیٹر نے مجھے ایک ناول ریویو کرنے کے لیے دیا۔ میرا بھانجا کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اور پھر میں سمجھا کہ ناول اتنا اہم بھی نہیں ہے (اس کا مصنف کوئی غیر معروف شخص تھا)۔ میں نے درمیان سے ایک صفحہ کھولا اور پڑھنے لگا۔

''میں پاگل ہوں .... میں پاگل ہوں .... میں پاگل ہوں۔' عبدالشکور نے اپنے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس کے دوست حکیم عبدالعلی نے اس کو اس سے باز رکھنے کی کشمکش کی۔

'کپڑے مت پھاڑو میاں عبدالشکور' میاں عبدالعلی نے کہا۔ 'یہ قمیص جو تم پہنے ہوئے ہو میری ہے۔''

میں نے کتاب کو ایک اور جگہ سے الٹا۔ یہاں اس قسم کے نادر جواہرات جڑے تھے:

''اگر عبدالشکور اپنے تحت الشعور کو کسی طرح اپنے لاشعور میں مدغم کر سکتا تو اس کی نفسیاتی الجھنوں کا خاتمہ ہو جاتا۔ اس کو خود بخود ملازمت مل جاتی اور اس کے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ خود بنفس نفیس ملازمت کو طشت پر رکھے اس کے پاس حاضر ہوتا۔ اس کے مکان کے پچھلے دو ماہ کا کرایہ خود بخود ادا ہو جاتا اور اس کے قرض خواہ اس کی خوش طبعی سے متاثر ہو کر اپنے پچھلے قرضے مانگنے کی بجائے اسے اور قرضہ دینے پر اصرار کرتے۔ مگر افسوس کہ عبدالشکور محض دس جماعتوں تک پڑھا تھا۔ افسوس اس نے ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ کی کتاب 'سائیکالوجی آف نیوروسس' نہیں پڑھی تھی۔ افسوس اس نے آندرے ژید نہیں پڑھا تھا۔ افسوس وہ بصد کوشش جیمز جائس کی 'اولیسس' کو ایک صفحے سے آگے پڑھنے میں کامیاب نہ ہوا تھا۔ اگر وہ کم از کم 'اولیسس' ہی آدھی تک مطالعہ کر لیتا تو اس وقت اس کی نفسیاتی اور جسمانی حالت اس قدر قابل رحم نہ ہوتی اور چانتان اس سے یوں بے وفائی نہ کرتی۔ اب وہ اس طرح محسوس کر رہا تھا جیسے وہ پاگل ہو جائے گا؛ جیسے اس کے لیے پاگل ہو جانے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے ....''

یہ کافی تھا۔ اور میں کتاب کو بند کر کے اس پر ریویو لکھنے بیٹھ گیا۔

پندرہ منٹ میں، میں نے ریویو لکھ ڈالا۔ چھ صفحے کا ریویو۔ اس میں، میں نے لکھا کہ اس ناول میں مصنف محترم ذوالفقار خاں نے ایک بے کار تعلیم یافتہ نوجوان کے جذبات کی فرائڈین نقطۂ نظر سے تجزیۂ نفسی کرنے کی کوشش کی ہے مگر وہ اس میں زیادہ کامیاب نظر نہیں آتے۔ پھر بھی ان کی اس کوشش کو ناکامیاب بھی نہیں کہا جاسکتا۔ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کی ہو بہو عکاسی کرتے ہیں مگر ان کی رومانیت پرستی سب کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ ان کی کردار نگاری کی تکنیک خارجی نہیں بلکہ داخلی ہے، یعنی وہ اپنے کرداروں

کے پیچھے چھدرے تحت الشعور میں گھس کر ان کی زبان سے بولتے ہیں۔ اور جب اس شان دار اور بے حد رقت انگیز سین میں عبدالشکور جو اس ناول کا ہیرو ہے، اپنے کپڑے پھاڑ کر چلاتا ہے۔ ''میں پاگل ہوں، میں پاگل ہوں''، تو ہمیں صاف طور پر اس میں مصنف خود بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ محترم ذوالفقار خاں میں ایک عیب یہ ہے کہ وہ کرداروں کو باہر سے ٹٹولتے ہیں اور ان کے بارے میں گہرائی سے نہیں لکھتے، لیکن امید ہے کہ اپنی اگلی کتاب میں وہ اس کے بالکل برعکس تکنیک استعمال کریں گے۔ ان کی پہلی کتاب سے سب کی آنکھیں کھل گئی ہیں اور ادبی دنیا میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا ہے۔ سب نے محسوس کیا ہے کہ ایک نیا ادیب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو چکا ہے جس کی ادبی کاوشوں سے اردو ادب کو چار چاند لگنے کی توقع ہے۔ مگر ذوالفقار خاں کو سنبھل سنبھل کر بڑھنا ہوگا۔ ابھی انہیں مغل نگارش کے متعلق بہت کچھ سیکھنا ہے اور نفسیات کی سب کتابوں کا مطالعہ کرنا ہے۔ ان کے ناول سے گمان ہوتا ہے کہ عبدالشکور نے (جو غالباً مصنف خود ہی ہے) ابھی تک 'سائیکالوجی آف نیوروسس' نہیں پڑھی۔ آندرے ژید نہیں پڑھا۔ میں محترم ذوالفقار خاں سے پوچھنے کی جسارت کروں گا کہ اگر انھوں نے خود اپنے اقرار کے مطابق نہ فرائڈ کو پڑھا ہے، نہ آندرے ژید کو اور نہ جائس کو، تو پھر انھوں نے پڑھا کیا ہے؟ ان کتابوں کے مطالعہ کے بغیر وہ ہمیں کیسے کوئی ٹھوس یا جامد تخلیق دے سکتے ہیں؟ راقم الحروف نے خود ان تینوں مصنفوں کو ہائی اسکول ہی میں پڑھ ڈالا تھا۔ اس زمانے میں شاید ذوالفقار خاں پتنگ اڑاتے ہوں گے یا 'بہرام ڈاکو عرف بے وفا مجاہد' کی قسم کے ناولوں سے اپنی راتوں کی نیند حرام کرتے ہوں گے۔ محترام ذوالفقار خاں چینی کلاسیکل مصنف چنگ پھنگ پھوں سے بے حد متاثر معلوم ہوتے ہیں (یہ نام میں نے اسی وقت فرضی گڑھ لیا تھا) اور انھوں نے اپنے ناول کے پلاٹ کے سلسلہ میں مسٹر چنگ پھنگ پھوں کے ناول 'چیکو چیکو' سے کسی حد تک استفادہ کیا ہے۔

کچھ اس قسم کے الفاظ تھے میرے ریویو کے۔ لفظوں کے کچھ ہیر پھیر کے ساتھ میں اس موضوع پر متعدد ریویو پہلے کر چکا تھا اور ایڈیٹر 'خیال نو' کو یہ ریویو حوالے کر دینے کے بعد میں اس کے اور محترم ذوالفقار خاں کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔

جب یہ ریویو 'خیال نو' میں چھپا تو اس سے تین چار روز بعد مجھے محترم ذوالفقار خاں کا خط موصول ہوا۔ جس میں انھوں نے میرے حوصلہ افزا ریویو کا شکریہ ادا کیا تھا اور مجھے یقین دلایا تھا کہ انھوں نے چنگ پھنگ پھوں کی کوئی کتاب نہیں پڑھی اور اگر ان کے ناول کی مسٹر چنگ پھنگ پھوں کے ناول سے کچھ مشابہت ہے تو اسے محض اتفاق پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ آگے چل کر انھوں نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ آیا میں ان کو مسٹر چنگ پھنگ پھوں کے پبلشر کے پتے سے آگاہ کر سکتا ہوں، جس سے عظیم چینی مصنف کے ناول 'چیکو چیکو' کا انگریزی زبان کا ایڈیشن دستیاب ہو سکے۔

میں نے جواباً لکھ بھیجا۔ 'چیکو چیکو' تو میں نے اصل چینی زبان میں پڑھا تھا۔ جہاں تک مجھے علم ہے ابھی ناول کا انگریزی زبان میں ترجمہ نہیں ہوا۔

میرا خیال تھا معاملہ یہیں پر ختم ہو جائے گا۔ دوسرے دن میں ابھی بستر سے نکل کر شیو ہی کر رہا تھا

کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں سمجھا شاید دودھ والا ہوگا۔ منہ صابن کے جھاگ میں لتھڑا ہوا ہاتھ میں برش۔ اس حلیہ میں، میں نے دروازے کو تھوڑا سا کھول کر محتاط انداز میں باہر سر نکالا۔

''کیا آپ ہی شداد پشمی ہیں؟'' ایک کھچے دار مونچھوں والا خطرناک شکل کا انسان دروازے کے پاس کھڑا تھا۔

''ہاں مجھے یہی کہا جاتا ہے۔ دوست احباب صرف پشمی کہتے ہیں''، میں نے مسکرانے اور خرخرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی تعریف؟ کیسے آنا ہوا؟''

''میں ذوالفقار خاں ہوں۔ اور آپ کے حوصلہ افزا ریویو کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔''

میں اس کو اچھے اخلاق میں شمار نہیں کرتا کہ مصنف لوگ بالکل ہی تبصرہ نگار کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جائیں اور خط و کتابت پر اکتفانہ کر کے اس کے گھر کا کھوج نکالیں۔ میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ صبح ہی صبح ذوالفقار خاں کی قسم کے مصنف کو اپنے دروازے کے باہر کھڑا دیکھنا کسی تبصرہ نگار کے دلی سکون میں اضافہ کا موجب نہیں بن سکتا۔ میں نے صابن کی جھاگ میں سے اپنے جبڑے چیر کر اس پر یہ ظاہر کیا کہ میں اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔

میں نے کہا ''اخاہ، ذوالفقار صاحب۔ آیئے آیئے اندر تشریف لایئے۔ آپ کی کتاب کئی حیثیت سے غیر معمولی تھی۔''

وہ اندر آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور میں ہاتھ میں برش پکڑے اس کے سامنے والے صوفے پر۔

''ہاں تو وہ آپ کی کتاب خوب تھی۔''

''آپ شیو تو کر لیجیے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں جانتا تھا کہ اس شخص کی موجودگی میں میرے لیے شیو کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ شیو کرنے کے لیے دلی سکون اور روحانی اطمینان ضروری ہے۔ پھر میرا خیال تھا کہ اس طرح شاید مجھے اس سے جلد چھٹکارا حاصل ہو جائے۔

''شیو کر لوں گا۔ آپ فرمایئے۔ اتنے سویرے سویرے؟''

''ہاں، چینی کتاب 'چیکو چیکو'، آپ کے پاس ضرور ہوگی۔ آپ نے اپنے ریویو میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ وہ نہیں تو چنگ پھنگ پھوں کا کوئی دوسرا شاہکار۔''

''وہ کتاب 'چیکو چیکو'! ہاں! مجھے یاد آیا، میں کل ہی تو اسے پڑھ رہا تھا۔ مسٹر چنگ پھنگ پھوں۔ یہی نام ہے نا۔ اس وقت چین کے کلاسیکی روایت میں لکھنے والوں میں سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ وہ جو میں نے آپ کی کتاب پر اپنے ریویو میں لکھا تھا کہ اس کی چنگ پھنگ پھوں کی کتاب سے مشابہت ہے .... تو ....''

''آپ نے چینی زبان کب سیکھی تھی؟'' مسٹر ذوالفقار نے بات کاٹتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ''غالباً اس وقت جب میں لکڑی کے گھوڑے پر سیر کیا کرتا ہوں گا۔''

میں نے اس سوال میں نیش زنی کو نظر انداز کر کے اتنی ہی سنجیدگی سے دور ایک مفکرانہ طور پر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''غالباً ۱۹۲۸ میں۔ میں اس وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔''

مسٹر ذوالفقار نے قطع کلامی کر کے مجھے مزید دروغ گوئی سے بچاتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ نے لن یوٹانگ کی کتابیں پڑھی ہیں؟ وہ سب تو انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''ہاں اچھا لکھتا ہے مگر خارجی اسکول کا مصنف ہے۔ میرا مطلب ہے اس میں داخلیت نہیں۔ پھر بھی برا نہیں۔ میں نے تو اس کی کتابیں اصلی چینی زبان میں پڑھی ہیں۔ ترجمہ میں دراصل وہ بات نہیں رہتی۔''

''اور پنگ پانگ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟'' ذوالفقار خاں نے پوچھا۔

''اچھا لکھتا ہے''، میں نے جواب دیا۔ ''اگرچہ میں نے اس کا نام کبھی نہیں سنا تھا۔ چین کی عوامی زندگی کا اس وقت وہ واحد عکاس ہے مگر رومانیت پسندی اس کی تخلیقات میں جو خارجیت ... اور .... رومانیت کا رنگ لے آتی ہے وہ میری رائے میں اس کی اصلی خوبیوں میں سے بہت کچھ منفی کر لیتا ہے۔ پھر بھی وہ اس وقت چینی ادب کا آندرے ژید ہے۔''

''معاف کیجیے۔'' مسٹر ذوالفقار خاں نے یک لخت اٹھتے ہوئے کہا۔

''آٹھ بجے مجھے ایک ضروری کام پر جانا ہے۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔ پنگ پانگ کے متعلق آپ کے ان ارشادات کو میں یہاں کے ہر ادیب تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ خاطر جمع رکھیے اور ویسے جاتے جاتے یہ عرض کر دوں کہ پنگ پانگ ایک کھیل کا نام ہے جو گیند سے میز پر کھیلا جاتا ہے۔''

''میرا مطلب طریقۂ فکر کی مشابہت سے تھا.... آپ سمجھتے ہیں نا.... سبجیکٹو طریقہ نہ کہ آبجیکٹو ... آپ سمجھتے ہیں نا؟'' میں نے بازو ہلا کر اسے اپنا مطلب سمجھانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں برش سے اپنی ناک پر سفیدی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

''وہ کتاب تو آپ کے پاس ہوگی ہی۔ بات یہ ہے کہ ہم نئے ادیبوں کو چینی فن کاروں کے شاہکار پڑھنے چاہئیں۔ نیپیر روڈ پر ایک چینی دندان ساز آہ فنگ میرا دوست ہے۔ میں اس سے اگلے ہی روز دو داڑھیں نکلوا چکا ہوں'' مسٹر ذوالفقار خاں نے حلق کھول کر اور انگلی اندر ڈال کر مجھے نکلی ہوئی ڈاڑھوں کی جائے وقوع دکھانے کی کوشش کی۔ ''میرا ارادہ ہے کہ آہ فنگ کی مدد سے میں 'چیکو چیکو' کا اردو ترجمہ کروں ورنہ آپ تو ہیں ہی۔''

''ہاں ضرور کیجیے۔ ہمیں اردو داں طبقے کو چینی ادب سے روشناس کرانا چاہیے۔ ضرور کیجیے ...'' میں نے کہا۔

''اچھا تو مجھے وہ کتاب ایک دو دن کے لیے عنایت کر دیجیے!''

''کون سی کتاب؟''

میں اس کتاب کے متعلق بھول گیا تھا۔

''وہی 'چیکو چیکو' .... چنگ پھنگ پھوں کا شاہکار۔''

''وہ کتاب .... ہاں! میں نے خدا جانے اس کو کہاں رکھ دیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''پرسوں بھی تو وہ میرے پاس ہی تھی .... دراصل میرا بھانجہ ہے نا .... عجیب نامعقول لڑکا ہے .... میری کتابیں یہاں سے اٹھا کر لے جاتا ہے اور بھینس کے آگے ڈال دیتا ہے۔''

'بھینس کے آگے؟'' مسٹر ذوالفقار نے کرسی پر سے ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے احتجاج کیا۔

''ہاں بھینس کے آگے۔ یہ اس کی ہابیوں میں سے ایک ہے۔''

''مگر پنگ پانگ ایک چینی مصنف بھی تو ہے۔ آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟ ذوالفقار صاحب ٹھہریے، چائے تو پیتے جایئے۔'' مگر میرا ملاقاتی دروازہ کھول کر باہر جا چکا تھا۔

صابن میرے گالوں پر سوکھ چکا تھا اور ذوالفقار خاں کے چلے جانے کے بعد مجھے ایک مبہم سا احساس ہوا کہ 'ریویوٹری' کی حیثیت سے میرا کیریر اب ختم ہو گیا ہے۔

مسٹر ذوالفقار خاں اپنے وعدے کا پکا ثابت ہوا۔ قابل سے قابل ڈھنڈورچی بھی اس خوبی سے اس کام کو سرانجام نہ دے سکتا، جس خوبی سے اسے ذوالفقار خاں نے کیا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر شہر کا ہر ادنیٰ آدمی، کافی ہاؤس کا ہر جرنلسٹ اس قصہ کو جانتا تھا۔ اور 'پنگ پانگ' کے متعلق میری رائے کو قہقہوں کے درمیان ادبی محفلوں میں دہرایا جاتا تھا۔ کم از کم اردو کے دو ماہناموں 'صبح' اور 'اسکرین' کے تنقید نگاروں نے طویل مقالوں میں میری خوب خبر لی۔ (تنقید نگاروں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کاش ہم لوگوں میں یونین اسپرٹ ہوتا)۔ مہینے کے اندر اندر ساری ادبی دنیا اس مذاق سے واقف ہو گئی تھی۔ اور اب جب کہ تین ماہ بعد بھی جب لوگ مجھے دیکھتے ہیں تو ان کی باچھیں چرنے لگتی ہیں اور وہ مجھ سے پوچھتے ہیں؛ 'پنگ پانگ' کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

میرے لیے گھر سے باہر نکلنا دوبھر ہو گیا ہے۔

میرا دوست 'خیال نو' کا ایڈیٹر اب مجھے اپنے رسالے کے لیے ریویو لکھنے کی دعوت نہیں دیتا۔ میں اب اس جگہ سے کوچ کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ اس جگہ جہاں ہم زباں کوئی نہ ہو اور مہماں کوئی نہ ہو وغیرہ وغیرہ، اور جہاں ذوالفقار خاں بھی نہ ہو!

(افکار، کراچی، شمارہ نمبر ۴، ۱۹۵۱)

کتاب کی واپسی

محمد علم اللہ

انٹرنیٹ ہو، کالج، یا لائبریری؛ ٹرین ہو، بس، یا جہاز؛ ان دنوں ایک بار پھر سے ہر طرف نوجوانوں کو ناول یا کسی دلچسپ موضوع پر مبنی کتاب پڑھتے یا اس سے متعلق بحث و مباحثہ کرتے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایسے وقت میں جب کہ یہ کہا جا رہا ہو، ہم لوگ خصوصاً نئی نسل کتابوں سے دور ہو رہی ہے اور لٹریچر پڑھنے کی روایت ختم ہوتی جا رہی ہے؛ ایسے میں یہ منظر کچھ اور ہی کہانی بیان کرتا نظر آتا ہے۔ گذشتہ چند سالوں میں ملک کے کتب بینوں کے مزاج میں تبدیلی آئی ہے، جس کا احساس اہل نظر کو ہے۔ اس میں جہاں جدید ٹیکنالوجی نے اپنا کردار ادا کیا ہے، وہیں جدید ذرائع ابلاغ، جیسے سوشل میڈیا نے بھی اپنا حصہ ڈالا ہے۔ مگر اس بیداری یا تبدیلی پر غور کرنے والی بات یہ ہے کہ یہ رویہ اردو سے تعلق رکھنے والوں میں کم نظر آتا ہے۔ اس کی جو بھی وجوہات ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایسے انقلاب انگیز رویے اردو کے تعلق سے کمیاب ہیں، جب کہ اس کے برعکس انگریزی ادب کو لے کر نوجوانوں میں ایک جنون ہے۔

ہندوستان میں ان دنوں ان اشاعتی اداروں، جو انگریزی کتب شائع کرتے ہیں، کی چاروں انگلیاں گھی اور سر کڑاھی میں ہیں۔ انگریزی زبان میں لکھنے والوں کی پذیرائی اور عزت بھی زیادہ یا ہندی میں لکھنے والوں کی نسبت زیادہ ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ ایسا کیوں ہے؟ ایسے اشاعتی اداروں کے پاس فخر کرنے کے لیے خالص ہندوستانی بیسٹ سیلر مصنف ہیں۔ 'اے ملین کاپی سولڈ' جیسے فخریہ اعلانات ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں 'پری سیل ریڈرز' (pre-sell readers) ہیں۔ میرے خیال میں، دراصل یہ نئے اور ابھرتے ہوئے مصنفین کی کامیابی کی وہ مثال ہے، جو گذشتہ آٹھ دس برسوں سے آہستہ آہستہ ایک انقلاب کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے جس نے ہندوستان کے اشاعتی کاروبار کی ہیئت کو بدل کر رکھ دیا ہے۔

اب مصنفین کی مقبولیت 'بکر پرائز' یا بیرون ملک میں دھوم مچانے والی کتابوں سے نہیں ہے۔ ہندوستانی مصنف 'اوورسیز' یا دیارِ غیر کی مارکیٹ میں کامیابی کے پرانے نسخوں کے سہارے کہانیاں لکھنے کے بجائے، ہندوستانی قارئین کے لیے کتابیں لکھ رہے ہیں۔ شاید انھیں غیر ملکی مارکیٹ کی ضرورت بھی نہیں رہی کیوں کہ ہندوستان ہی میں ان کی کتابیں ہزار دو ہزار نہیں، بلکہ لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو رہی ہیں۔

ہندوستان میں 'اوپن مارکیٹ' میں کامیابی کی ان گنت کہانیوں میں سے یہ شاید سب سے تازہ ترین کہانی ہے، جس کے بہت سے صفحات ابھی پلٹے جانے باقی ہیں۔ ہندوستان کی نئی نسل کے انگریزی مصنفین کی کتابوں میں نیا پن ہے۔ اگر یہ مصنفین اور ان کے قاری ایسا کہتے ہیں، تو ان کا یہ کہنا بے وجہ نہیں ہے، بلکہ انگریزی زبان میں لکھنے والے مصنفین کی نئی نسل میں زیادہ تر چہرے ایسے ہیں جن کی ادب میں پہلے سے کوئی شناخت نہیں تھی لیکن انھوں نے وقت کے تقاضوں کو سمجھا اور اس کے مطابق اپنے قارئین کو مواد فراہم کرنے کی کوشش کی۔ ان مصنفین میں سے زیادہ تر کا تعلق 'کارپوریٹ ورلڈ' سے ہے، جو اس میدان میں اپنے لیے نمایاں مقام بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے، کہ وہ ملک کے نوجوان کی دھڑکن کو کسی اور کے مقابلے بہتر سے سن سکتے ہیں اور اسے وہ داستان سنا سکتے ہیں، جسے وہ سننا چاہتے ہیں۔

اس کہانی کو شروع کرنے کے بہت سے نکات ہو سکتے ہیں لیکن ہم آج سے تقریباً آٹھ دس سال قبل کے ماضی میں جھانکتے ہیں، جب عام آدمی کی انٹرنیٹ تک رسائی نہ تھی، تو کتابوں کی دکانوں پر 'فائیو پوائنٹ سم ون' (Five Point Someone) جیسی کتابیں نظر آتی تھیں۔ مصنف کا نام چیتن بھگت؛ تعارف، آئی آئی ٹی دہلی اور گجرات احمد آباد سے تعلیم، انویسٹمنٹ بینکر؛ اس کے بعد ان کی نئی کتاب 'ون نائٹ دی کال سینٹر' (One Night @ the Call Center) فروخت کے نئے ریکارڈ قائم کرتی ہے۔ روپا پبلیکیشن، جس سے چیتن بھگت کی اب تک کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، کے مطابق بھگت کی ان دونوں کتابوں کی فروخت دس لاکھ سے زیادہ کا ہندسہ پار کر چکی ہے۔ جب کہ 'ون نائٹ دی کال سینٹر'' کا پہلا ایڈیشن محض تین دن میں 50000 کاپیاں ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ یہاں سے چیتن بھگت صرف جز وقتی مصنف نہیں رہ جاتے، وہ ملک کی مشہور شخصیات میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان کی اگلی تینوں کتابیں 'دی تھری مسٹیکس آف مائی لائف' (The 3 Mistakes of My Life) اور 'ریوولوشن ۲۰۲۰' (Revolution 2020) دکانوں سے ایسے اٹھائی جاتی ہیں، جیسے صبح کے وقت اخبار کی دکان سے اخبار خریدے جاتے ہیں۔ چیتن بھگت اب نہ صرف یہ کہ ایک بیسٹ سیلر مصنف ہیں، بلکہ ان کو رسائل اور ٹیلی ویژن چینلوں پر 'ینگ انڈیا' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اب وہ نیوز چینلز پر دکھائی دیتے ہیں۔ 'ٹائمز آف انڈیا' کے لیے سنڈے کالم لکھتے ہیں۔ ملک بھر میں گھوم کر تقریریں کرتے ہیں، لیکچر دیتے ہیں۔ 'نیویارک ٹائمز' انھیں ۲۰۰۸ میں ہندوستان کا سب سے زیادہ فروخت ہونے والا انگریزی مصنف قرار دیتا ہے۔ 'ٹائم میگزین' انھیں دنیا کے سب سے زیادہ متاثر کن ۱۰۰ افراد میں شمار کرتا ہے۔ وہ بھی تب جب ان کے پاس نہ تو کوئی بین الاقوامی اعزاز ہے، اور نہ ہی ناقدین ان کی کتب کو 'ادبی معیار' کی سند دیتے ہیں۔

'فائیو پوائنٹ سم ون' سے شروع ہونے والی کہانی ۲۰۱۰ میں شائع ہوئی۔ امیش ترپاٹھی کی کتاب 'دی امورٹلس آف ملوہا' (The Immortals of Meluha) سے اچانک ایک انقلاب کی شکل لیتی دکھائی دیتی ہے۔ چیتن بھگت کی طرح مینجمنٹ کے میدان سے آنے والے اور آئی ایم ایم کلکتہ کے 'پاس آوٹ' امیش کی کتابوں میں ان کے دل کش انداز تحریر، اور اساطیر، تاریخ، سسپنس، مہم جوئی سے پر لطف

داستان گوئی دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ کتاب شائع ہوتے ہی ایک ہفتے کے اندر اندر ملک کے سب سے بہترین کتابوں میں شمار ہو جاتی ہے۔ ہندوؤں کی مقدس ہستی 'شیو' پر 'ٹرائیلاجی' کی دوسری کتاب 'سیکرٹ آف ناگاز' (The Secret of Nagas) قارئین میں مقبولیت کا ریکارڈ توڑتی دکھائی دیتی ہے۔ چند ماہ کے اندر اندر اس کی ایک لاکھ سے زیادہ کاپیاں فروخت ہو جاتی ہیں۔ امیش ترپاٹھی بتاتے ہیں کہ ان کی دونوں کتابیں ابھی تک ساڑھے سات لاکھ سے زیادہ تعداد میں فروخت ہو چکی ہیں۔

امیش ہی کی طرح اگر کسی نام نے اپنی شناخت بنائی، مقبول ہوئے، تو وہ ہیں اشون سنگھی۔ جہاں امیش کی توجہ اساطیر کی طرف ہے، وہیں اشون سنگھی جو بنیادی طور پر ایک تاجر ہیں، اپنے ناول کی کہانی کے لیے تاریخ کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کی پہلی کتاب 'دی روضہ بل لائن' (The Rozabal Line) کشمیر کے روضہ بل درگاہ سے متعلق ہے۔ اس کے مطابق اس درگاہ میں عیسیٰ مسیح کی ہڈیاں محفوظ ہیں۔ سنگھی کی دوسری کتاب 'چانکیاز چینٹ' (Chanakya's Chant) بھی فروخت کے ریکارڈ قائم کرنے میں کامیاب رہی۔ ان کی تیسری کتاب 'دی کرشنا کی' (The Krishna Key) بھی بازار میں اپنا سکہ جمائے رہنے میں کامیاب رہی۔ امیش خود کو بالکل غیر تخلیقی انسان مانتے ہیں، اور اپنی کتابوں کو 'شیو' کا عطیہ کہتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے، کہ امیش کچھ عرصہ پہلے تک، ایک طرح سے ملحد تھے، لیکن شیو پر لکھی کتاب نے انھیں شیو بھگت بنا دیا ہے۔ یہاں پر سبھاش گتاڈے اور ارون دھتی رائے سمیت مزید کئی مصنفین کی بات کی جا سکتی ہے، جنھوں نے ایک بڑے حلقے کو متاثر کرنے اور اپنی جگہ بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ لوگ اس کا سبب ان کتابوں کی قیمت کو بھی بتاتے ہیں۔ چیتن بھگت کی کتابوں کی قیمت 100 روپے کے قریب ہوتی ہے، جو ایک سنیما کے ٹکٹ کی قیمت سے بھی کم ہے۔ اسے ایک نہیں، کئی لوگ پڑھ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ کم خرچ بالانشیں والا معاملہ ہے۔

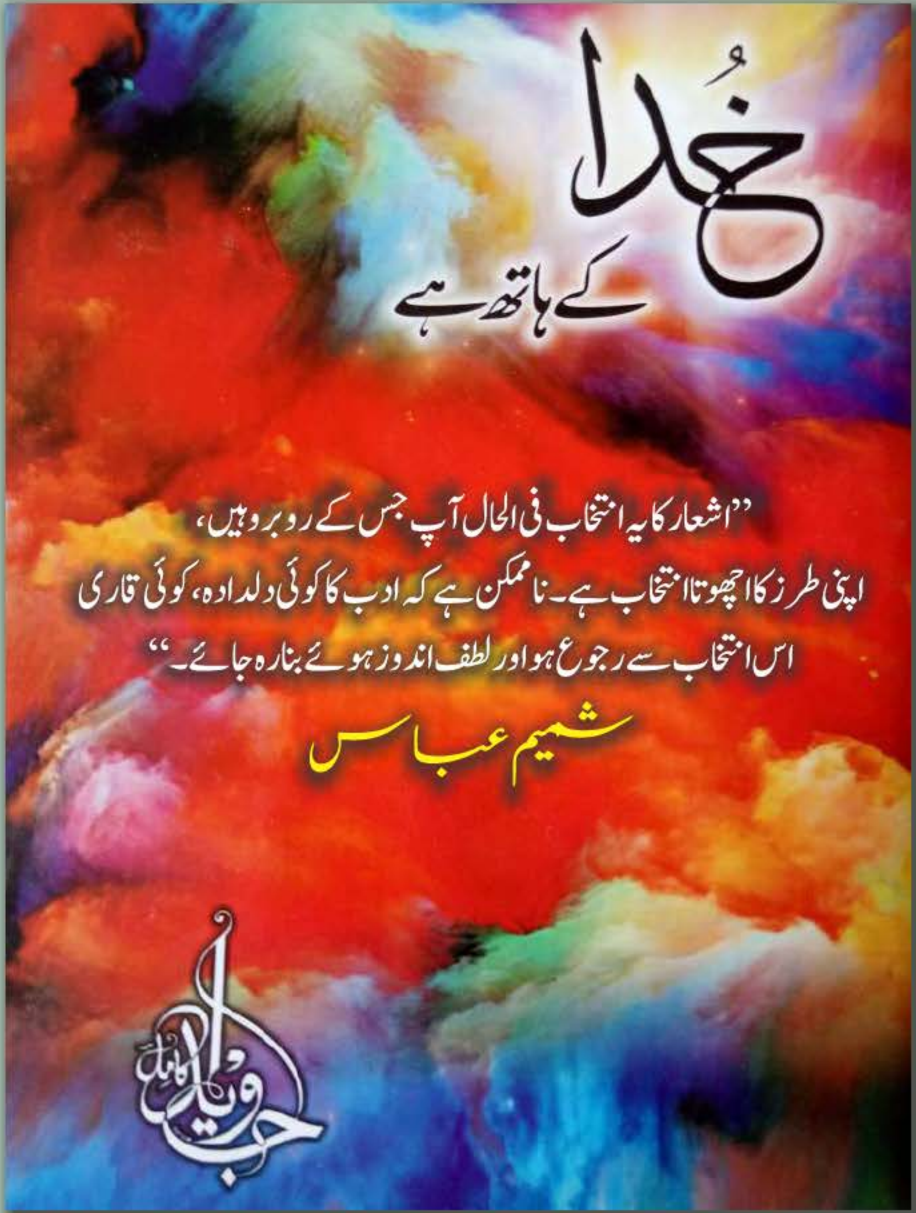
یہ صحیح ہے کہ آج کے دور کی 'بیسٹ سیلر' کتب اپنی تعداد فروخت کے مطابق، شاید ہی ادبی طور پر معیاری کتابوں میں شمار کی جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کو ان کی زبان و بیان پر بھی اعتراض ہو۔ ممکن ہے کہ یہ کتابیں آپ کو سطحی لگیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں آپ کو صرف نری تفریح نظر آئے۔ لیکن یہ اپنی جگہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مقبول عام فکشن سے دور ہونے کا ایک نتیجہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ قاری 'بہترین کتابوں' سے تو کیا کتاب ہی سے دور ہو گیا تھا۔ وہ زمانہ اور تھا، جب گلشن نندہ کی رومان سے بھری کتابیں نئی نسل اپنے گھروں میں چوری چھپے پڑھا کرتی تھی۔ راجندر یادو جیسے قصہ گو اپنی جوانی کے دنوں میں جاسوسی ناول چاٹ ڈالا کرتے تھے۔ آج اردو، اور ہندی زبان کی کتابیں ایک خاص دائرے میں مقید ہو کر رہ گئی ہیں۔ کیا ہمیں اس دائرے سے باہر آنے کی ضرورت نہیں ہے؟ خود انگریزی زبان کے اشاعتی اداروں کی صورت حال آج سے بہتر شاید ہی کبھی تھی۔ ان کے یہاں بھی کچھ سال پہلے تک پاپولر لٹریچر کو کوئی گھاس نہیں ڈالتا تھا، اور اگر کسی کتاب کی 5000 کاپیاں فروخت ہو جاتی تھیں، تو اسے بیسٹ سیلر قرار دے دیا جاتا تھا۔

بیسٹ سیلر لکھنے والے نئے مصنفین نے اس منظر نامے کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہ مصنفین سلمان

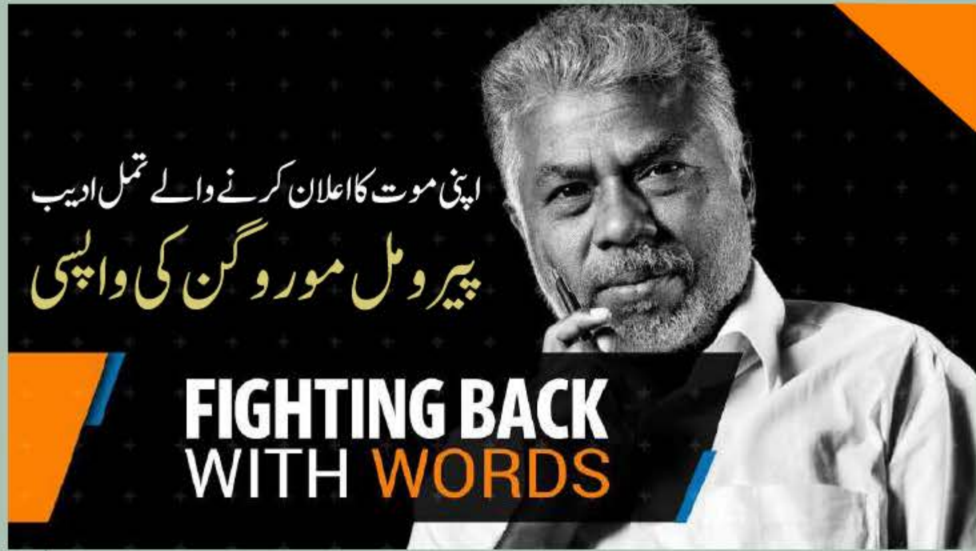
رشدی، وکرم سیٹھ یا ارون دھتی رائے ہونے کا دعوی نہیں کرتے۔ وہ تفریح اور دلچسپی کے لیے کتاب لکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور قاری کو اپنا گرویدہ بنا رہے ہیں۔ یہاں کہیں کوئی رویندر سنگھ اپنی 'لو اسٹوری' لے کر آتا ہے، اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی دس لاکھ کاپیاں فروخت ہو جاتی ہیں۔ ان مصنفین کو اپنی کتابوں کے نشر و اشاعت کے لیے بھی تگ و دو کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

چیتن بھگت، امیش ترپاٹھی اور اشون سنگھی جیسے ہندوستان کے مصنفین نئی نسل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ بڑا مصنف ہونے کا دعویٰ کیے بغیر خود کو صرف ایک کہانی کار مانتے ہیں۔ یہ ایک ایسی نسل ہے، جس میں ہر کسی کے پاس کہنے کے لیے اپنی ایک کہانی ہے، اور سنانے کے لیے کوئی دلچسپ واقعہ ہے۔ کسی کے پاس اپنا خواب ہے('I have a dream': Rashmi Bansal)، کسی کے پاس اپنی محبت کی کہانی ہے('I too had a love story': Ravinder Singh)، کسی کے پاس نوجوانانِ ہند کے لیے حوصلہ افزا نسخے ہیں('What young India wants': Chetan Bhagat)، کسی کے پاس وزن میں کمی کرنے کے ہدایات ہیں ('Don't lose your mind, lose your weight': Rujuta Diwekar)، کسی کے پاس اپنے پیشے سے متعلق تجربہ ہے ('If God was a banker': Ravi Subramanian)۔ یہ نیا ہندوستان ہے، جو ایک دوسرے کے تجربے سے اشتراک کے لیے بیتاب ہے۔ آپ ان سے محبت کریں یا نفرت لیکن حقیقت یہی ہے، کہ نئے زمانے کے ان نئے مصنفین نے اپنی عام کہانیوں ہی کے سہارے، ہندوستانی اشاعتی اداروں میں کتابوں کے جشن کا سماں باندھ کر رکھ دیا ہے۔

ہندی زبان میں بھی کئی قابل قدر مصنفین ابھر کر سامنے آئے ہیں اور انھوں نے خوب صورت کہانیاں دی ہیں۔ انگریزی میں لکھی جانے والی کتابوں کا ہندی میں ترجمہ ہو رہا ہے اور ان کی پذیرائی بھی ہو رہی ہے۔ ان کتابوں میں سے کچھ کے اردو تراجم بھی موجود ہیں لیکن وہ ہندوستان سے نہیں پاکستان سے شائع ہوئی ہیں۔ اردو میں جہاں کسی کتاب کی عام طور پہ گیارہ سو کاپیاں ہی چھپتی ہیں، ان مصنفین کی کتابوں کے ہندی ترجمے، اس سے کہیں زیادہ تعداد میں فروخت ہو رہے ہیں۔ سوال اٹھتا ہے کہ اس معاملہ میں اردو بانجھ کیوں دکھائی دیتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں کروڑوں کی تعداد میں انگریزی بولنے والے لوگ ہیں لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ ملک کے مقتدر دس اخبارات میں انگریزی کا صرف ایک اخبار ہے، بقیہ سب علاقائی زبانوں کے اخبار ہیں۔ ایسے میں کوئی وجہ نہیں کہ جب لوگوں کو انھی کی کہانی انھی کی زبان میں سنائی جائے تو وہ اسے پڑھنا نہ چاہیں گے، مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ہندی اور اردو زبان میں لکھنے والے آج بھی وہی پرانی اور گھسی پٹی داستان سنا رہے ہیں اور شکوہ کناں ہیں کہ ان کو قاری نہیں ملتے۔



Javed Kamil
B/102, Diamond Hill Co-op. Society Litd;
Near Bunter Bhawan, Chuna Bhatti,
Mumbai - 400022
Mobile: 9819644103



آئندہ شمارے میں

اپنی موت کا اعلان کرنے والے تمل ادیب

پیرومل موروگن

کا متنازعہ ناول

One Part Woman

اور

Pyre

(کچھ ابواب کا اردو ترجمہ)

اس کے علاوہ پیرومل موروگن کی نظموں کے مجموعہ

Songs Of A Coward

سے کچھ نظموں کا انتخاب